

معاونیہ اور تاریخی حقائق

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ادارۃ المدینۃ اربعہ کراچی

ترتیب

○ حضرت معاویہ اور خلافت و ملوکیت (۱)

(حضرت معاویہ پر اعتراضات کا علمی جائزہ)

مولانا محمد تقی عثمانی

○ حضرت معاویہ اور خلافت و ملوکیت (۲)

(ترجمان القرآن لاہور کے اعتراضات کا جواب)

مولانا محمد تقی عثمانی

○ حضرت معاویہ شخصیت، کردار اور کارنامے

(حضرت معاویہ کی سیرت و مناقب)

مولانا محمود اشرف عثمانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرف آغاز

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

○●○

حضرت معاویہؓ ان جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیئے، حضرت علیؓ کی وفات کے بعد ان کا دور حکومت تاریخ اسلام کے دو مشکل زمانوں میں ہے جس میں اندرونی طور پر امن و اطمینان کا دور دورہ بھی تھا اور ملک سے باہر دشمنوں پر مسلمانوں کی دھماک بیٹھی ہوئی تھی لیکن حضرت معاویہؓ کے مخالفین نے ان پر اعتراضات و الزامات کا کچھ اس انداز سے انبار لگایا ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ تابناک زمانہ سبائی پروپیگنڈے کے گردو غبار میں روپوش ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے عرصہ سے میری خواہش تھی کہ حضرت معاویہؓ پر جو مشہور اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا واقعات کی روشنی میں جائزہ لے کر اصل حقیقت واضح کی جائے۔ اتفاق سے اسی دوران مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب ”خلافت و ملوکیت“ منظر عام پر آئی اور اطراف ملک سے ہم سے مطالبہ ہوا کہ اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کریں۔ اس کتاب میں حضرت معاویہؓ پر عائد کئے گئے اعتراضات کو مرتب طریقہ سے یکجا کر دیا گیا تھا، چنانچہ کتاب کے اس حصہ پر جو حضرت معاویہؓ سے متعلق تھا، میں نے ماہنامہ ”ابلاغ“ میں ایک سلسلہ مضامین تحریر کیا جو نو قسطوں پر شائع ہوا۔

بجہ اللہ اس سلسلہ مضامین کو ہر علمی حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، اور اب اپنے کرم فرماؤں کے اصرار پر اسے کتابی شکل میں لایا جا رہا ہے۔ میری خواہش تھی کہ کتابی صورت میں لاتے وقت میں حضرت معاویہؓ کی سیرت اور مناقب پر مثبت انداز میں بھی ایک مضمون تحریر کروں، لیکن اپنی گونا گوں مصروفیات میں مجھے اس کا موقعہ نہیں مل سکا، بالآخر

میری فرمائش پر برادر زادہ عزیز مولوی محمود اشرف صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ماشاء اللہ اس موضوع پر بڑی حسن و خوبی اور سلیقہ کے ساتھ ایک جامع مضمون تیار کر دیا جو عزیز موصوف کا نقشِ اول ہے، اور انشاء اللہ ان کے روشن علمی مستقبل کا آئینہ دار۔

اس طرح یہ کتاب اب محض ایک تنقید ہی نہیں ہے، بلکہ اس میں حضرت معاویہؓ کی سیرت، آپ کے فضائل و مناقب، آپ کے عہدِ حکومت کے حالات اور آپ پر مخالفین کے تمام بے جا الزامات کا مدلل جواب بھی انشاء اللہ مل جائے گا، اور مشاجرات صحابہ کے مسئلہ میں اہل سنت کا معتدل موقف بھی دلائل کے ساتھ واضح ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، اور اسے شکوک و شبہات کے ازالہ کا سبب بنائے۔ آمین

محمد تقی عثمانی

۲۷ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ

دارالعلوم کراچی ۱۳

(حصہ اول) حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

صفحہ	عنوان
۳	ترتیب
۵	حرف آغاز
۱۱	حضرت معاویہ اور خلافت و ملوکیت
۳	بحث کیوں چھیڑی گئی؟
۱۹	بدعت کا الزام
"	حضرت معاویہ کے عہد میں
۲۳	نصف رویت کا معاملہ
۲۷	مال غنیمت میں خیانت
۳۲	حضرت علیؓ پر سب و شتم
۳۶	استلحاق زیاد
۵۷	گورنروں کی زیادتیاں
۶۹	حضرت حجر بن عدیؓ کا قتل
۱۰۰	حضرت معاویہؓ کے زمانے میں اظہار رائے کی آزادی
۱۰۳	یزید کی ولی عدی کا مسئلہ
۱۰۷	ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت
۱۰۹	کیا حضرت معاویہؓ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے؟
۱۱۹	خلافت یزید کے بارے میں صحابہؓ کے مختلف نظریات
۱۲۳	یزید کی بیعت کے سلسلے میں "بدعنوانیاں"
۱۲۶	حضرت حسینؓ کا موقف
۱۲۹	چند اصولی مباحث
"	عدالت صحابہؓ کا مسئلہ

صفحہ	عنوان
۱۳۳	تاریخی روایات کا مسئلہ
۱۳۲	حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت کی صحیح حیثیت
۱۵۵	ایک ضروری بات
	(حصہ دوم) حضرت معاویہؓ اور خلافتِ ملوکیت
	(ترجمان القرآن لاہور کے تمبرے کا جواب)
۱۵۹	حضرت معاویہؓ اور خلافتِ ملوکیت
۲۱۱	مجموعی تاثرات
۱۶۳	بدعت کا الزام
۱۷۳	نصف بیت کا معاملہ
۱۷۵	ایک دلچسپ غلطی
۱۸۲	مالِ غنیمت میں خیانت
۱۸۸	حضرت علیؓ پر سب و شتم
۲۰۱	استحقاقِ زیاد
۲۰۶	ابنِ غیلان کا واقعہ
۲۱۰	گورنروں کی زیادتیاں
۲۱۷	حجر بن عدی کا قتل
۲۲۵	ایک ضروری گزارش
۲۲۸	یزید کی ولی عہدی
۲۳۲	عدالتِ صحابہؓ
۲۳۷	حضرت معاویہؓ اور فسق و بغاوت
۲۴۱	جنگِ صفین کے فریقین کی صحیح حیثیت
۲۵۱	آخری گزارش
	(حصہ سوم) حضرت معاویہؓ، شخصیت، کردار، اور کارنامے
۲۵۷	حضرت معاویہؓ، شخصیت، کردار اور کارنامے

صفحہ	عنوان
۲۵۸	ابتدائی حالات
۲۶۰	اسلام
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق
۲۶۳	حضرت معاویہؓ صحابہؓ کی نظر میں
۲۶۹	حضرت معاویہؓ تابعین کی نظر میں
۲۷۰	سوانح
۲۷۸	غزوات ۱۔
۲۷۹	سیرت
"	حکمران کی حیثیت سے
۲۸۳	حضرت معاویہؓ کے روزمرہ کے معمولات
۲۸۵	حلم، بردباری اور نرم خوئی
۲۸۷	عفو و درگزر اور حسن اخلاق
۲۸۸	عشق نبویؐ
۲۹۰	اطاعت پیغمبرؐ
۲۹۱	خشیت باری تعالیٰ
۲۹۲	سادگی اور فقر و استغناء
۲۹۳	علم و نعتہ
۲۹۳	ظرافت
۲۹۵	وفات
۲۹۷	آپ کے دور حکومت پر ایک شیعہ مورخ کا تبصرہ

حصہ اول

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

(حضرت معاویہؓ پر اعتراضات کا علمی جائزہ)

مولانا محمد تقی عثمانی

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

چند سال پہلے جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی جو کتاب ”خلافت و ملوکیت“ کے نام سے شائع ہوئی ہے اس کے بارے میں البلاغ کے اجراء کے وقت سے ہمارے پاس خطوط کا نامتا بندھا رہا ہے، ملک و بیرون ملک سے مختلف حضرات اس کتاب کے بارے میں ہمارا موقف پوچھتے ہی رہتے ہیں۔ اب تک ہم نے اس موضوع پر دو وجہ سے کچھ شائع کرنے سے گریز کیا تھا۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ البلاغ کا بنیادی مقصد اس قسم کی بحثوں سے میل نہیں کھاتا۔ ہماری کوشش روز اول سے یہ رہی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہی رہے گی کہ البلاغ کی تمام تر توجہ ان بنیادی مسائل کی طرف رکھی جائے جو بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ کو درپیش ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ”خلافت و ملوکیت“ کا جو حصہ اس وقت سوالات اور اعتراضات کا محور بنا ہوا ہے، وہ ایک ایسے مسئلے سے متعلق ہے جسے بحث و تحقیق کا موضوع بنانا بہ حالات موجودہ ہم کسی کے لئے بھی مناسب سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ہمارا اجمالی عقیدہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی نگاہوں نے انبیاء علیہم السلام کے بعد ان سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ انسان نہیں دیکھے۔ حق و صداقت کے اس مقدس قافلے کا ہر فرد اتنا بلند کردار اور نفسانیت سے اس قدر دور تھا کہ انسانیت کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور اگر کسی سے کبھی کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما کر ان کے جنتی ہونے کا اعلان فرما دیا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ ان کے باہمی اختلافات میں کون حق پر تھا؟ اور کس سے کس وقت کیا غلطی سرزد ہوئی تھی؟ سو اس قسم کے سوالات کا واضح جواب قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

تلک مة قد حلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسلوب
عما كانوا يعملون
یہ ایک امت تھی جو گذر گئی۔ ان کے اعمال ان کے لئے اور تمہارے
اعمال تمہارے لئے اور تم سے نہ پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا عمل
کیا تھا؟

ان دو باتوں کے پیش نظر ہم اب تک نہ صرف اس موضوع پر قلم اٹھانے بلکہ ”خلافت و ملوکیت“ کا مطالعہ کرنے سے بھی گریز کرتے رہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ فتنہ پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑا ہو گیا جس سے بچنے کے لئے ہم نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ پچھلے دنوں اس کتاب کے مباحث دینی حلقوں کا موضوع بحث بنے رہے۔ اور اس کے موافق و مخالف تحریروں کا ایک انبار لگ گیا۔ ادھر ہمیں اس کتاب کے مطالعے اور اس کے بہت سے قارئین سے تبادلہ خیال کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ جن حضرات نے اسے عقیدت اور احترام کے ساتھ پڑھا ہے ان کے دل میں ایسی شدید غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کا دور ہونا ضروری ہے، ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ افراط و تفریط سے ہٹ کر خالص علمی اور تحقیقی انداز میں مسئلے کی حقیقت واضح کر دی جائے۔ اسی ضرورت کا احساس اس مقالے کی شان نزول ہے۔

اس مقالے کو منظر عام پر لانے کے لئے ہم نے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا ہے جب کہ اس موضوع پر بحث و مناظرہ کی گرما گرمی دھیمی پڑ رہی ہے۔ اور فریقین کی طرف سے اس کتاب کی حمایت و تردید میں اچھا خاصا مواد سامنے آچکا ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ اپنے قارئین کو بحث و مباحث کی اس فضاء سے آزاد ہو کر سوچنے کی دعوت دی جائے جو حقیقت پسندی کے جذبہ کے لئے زہر قاتل ہوا کرتی ہے۔

جن حضرات نے خلافت و ملوکیت کا مطالعہ کیا ہے، ہمارا اصل مخاطب وہ ہیں، اور ہم نہایت دردمندی کے ساتھ یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس مقالے کا بحث و مباحث کے بجائے افہام و تفہیم کے ماحول میں مطالعہ فرمائیں، ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اگر ان معروضات کو اسی جذبے کے ساتھ پڑھا گیا تو یہ مضمون تطویل بحث کا سبب نہیں بنے گا بلکہ انشاء اللہ افتراق و انتشار کی موجودہ کیفیت میں کمی ہی آئے گی۔

بحث کیوں چھیڑی گئی؟

ہمارے لئے سب سے پہلے تو یہ بات بالکل ناقابلِ فہم ہے کہ اس پُر فتن دور میں مشاجرات صحابہ کی اس بحث کو چھیڑنے کا کیا موقع تھا؟ امت مسلمہ کو اس وقت جو بنیادی مسائل درپیش ہیں، اور جتنا بڑا کام اس کے سامنے ہے، مولانا موودوی صاحب یقیناً ہم سے زیادہ اس سے واقف ہوں گے۔ اس اہم کام کے لئے جس یکسوئی اور یک جہتی کی ضرورت ہے، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں، کون نہیں جانتا کہ آج کی دنیا میں دولت و حکومت پر اور علمی اور فکری مرکزوں پر ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنے والے نشرو اشاعت کے دور رس رسائل پر تمام تر قبضہ یا ان لوگوں کا ہے جو کھلے طور پر دشمن اسلام ہیں اور آپس کے ہزاروں اختلاف کے باوجود اپنا سب سے بڑا خطرہ اسلام کو سمجھے ہوئے ہیں اور اس کے مقابلے میں متحد ہیں، یا پھر کچھ ایسے ہاتھوں میں ہے جو مسلمان کھلانے کے باوجود ان سے ایسے مرعوب ہیں کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت اس کو سمجھتے ہیں کہ اس کو کھینچ تان کر کسی طرح ان آقاؤں کی مرضی کے مطابق بنا دیا جائے۔ ان حالات میں اسلام دشمن عناصر کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر کوئی قوت اہل حق کے پاس ہے تو وہ صرف ان کا باہمی اتحاد و اتفاق اور اجتماعی کوشش ہے۔ اس کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ آپس کے سابقہ اختلافات کو بھی ایک خاص دائرہ میں محدود کر کے ان سب کی پوری طاقت اس محاذ پر صرف ہو جس طرف سے کھلے کفر و الحاد کی یلغار ہے۔ اور کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ اس دور میں ملت کی فکری اور عملی توانائیاں غیر ضروری یا ثانوی اہمیت کے مسائل پر صرف کرنے کے بجائے ان بنیادی مسائل پر خرچ کی جائیں جو اس وقت عالم اسلام کے لئے زندگی اور موت کے مسائل ہیں۔

جہاں تک اسلام کے نظامِ خلافت کی تشریح و توضیح کا تعلق ہے، بلاشبہ وہ وقت کی بڑی اہم ضرورت تھی اور اس موضوع پر مولانا نے بھی ”خلافت و ملوکیت“ کے ابتدائی تین ابواب میں بحیثیت مجموعی بڑی قابلِ قدر کوشش فرمائی ہے۔ لیکن موجودہ وقت کی ضرورت کے لئے اتنا واضح کر دینا بالکل کافی تھا کہ خلافت کسے کہتے ہیں؟ وہ کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اس میں معتقد، عدلیہ اور انتظامیہ کے حدود اختیار کیا ہوتے ہیں؟ اور راعی و رعیت کے تعلقات کی

نوعیت کیا ہوتی ہے؟ رہی یہ بحث کہ تاریخ اسلام میں خلافت ملوکیت میں کس طرح تبدیل ہوئی؟ اور اس کی ذمہ داری کس کس پر عائد ہوتی ہے؟ سو یہ خالصتاً ایک ایسی تاریخی بحث ہے جس کی تحقیق ایک علمی نکتہ آفرینی تو کہلا سکتی ہے لیکن اس سے موجودہ دور کے مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر فائدہ متعلق نہیں ہے۔ خاص طور سے اس لئے بھی کہ یہ موضوع کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر ماضی میں کسی نے بحث نہ کی ہو۔ یا اس کی وجہ سے علم تاریخ میں کوئی ناقابل برداشت خلا پایا جاتا ہو۔ آج سے کم و بیش پانچ سو سال پہلے علامہ ابن خلدون جیسے عالمگیر شہرت کے مؤرخ نے اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے اور اس علمی خلاء کو نہایت سلامت فکر کے ساتھ پر کر دیا ہے انہوں نے اپنے شہرہ آفاق مقدمے کے تیسرے باب میں خلافت و ملوکیت پر پہلی مبسوط بحث کی ہے، اور اس باب کی چھبیس ویں فصل کا تو عنوان ہی یہ ہے کہ:

فی انقلاب الخلافة الى المنک

خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کا بیان

اس فصل میں انہوں نے اپنے مخصوص سلجھے ہوئے انداز میں اس انقلاب کے اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں، تاریخ اور بالخصوص تاریخ اسلام کے واقعات اور اس کے آثار چڑھاؤ پر ابن خلدون سے زیادہ نظر رکھنے کا دعویٰ اس دور میں شاید ہی کسی کو ہو، ان کے افکار کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں اور تمام مسلمان اور غیر مسلم مولانا حسین تاریخ اور فلسفہ تاریخ میں ان کے مقام بلند کے معترف ہیں، اپنی اس بحث میں مشاجرات صحابہ کے دریائے خون سے وہ نہایت سلامتی کے ساتھ گزرے ہیں۔

لذا موجودہ زمانہ میں اس مسئلے کی کھود کرید اتنی ہی مضربے جتنی بخت نصر کے حملے کے وقت یہودیوں کی یہ بحث کہ حضرت مسیحؑ کے فضائل پاک تھے یا ناپاک؟ یا آتاہریوں کی یلغار کے وقت اہل بغداد کی یہ تحقیق کہ حضرت علیؑ افضل تھے یا حضرت معاویہؓ!

مولانا مودودی صاحب نے اس بحث کو چھیڑنے کی وجہ جواز یہ بیان فرمائی ہے کہ:

آج پاکستان میں تمام ہائی اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم

اسلامی تاریخ اور علم سیاست کے متعلق اسلامی نظریات پڑھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ مدت پہلے پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔ اے سیاسیات کے امتحان میں یہ سوالات آئے تھے کہ قرآن نے ریاست کے متعلق کیا اصول بیان کئے ہیں؟ عمید رسالت میں ان اصولوں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا گیا؟ خلافت کیا چیز تھی اور یہ ادارہ بادشاہی میں کیوں اور کیسے تبدیل ہوا؟ اب کیا معترض حضرات چاہتے ہیں کہ مسلمان طلباء ان سوالات کے وہ جوابات دیں جو مغربی مصنفین نے دیئے ہیں؟ یا نا کافی مطالعہ کے ساتھ خود اپنی سیدھی رائیں قائم کریں؟ یا ان لوگوں سے دھوکا کھائیں جو تاریخ ہی کو نہیں، اسلام کے تصورِ خلافت تک کو مسخ کر رہے ہیں؟ اے، ملے

لیکن ہمارا خیال ہے کہ مولانا جب بحث و مباحثہ کی موجودہ فضا سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے تو انہیں خود اپنا یہ عذر کمزور محسوس ہو گا۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ مسلمان طلباء ان سوالات کے کیا جواب دیں؟ تو اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ انہیں وہ جواب دینا چاہیے جو ابنِ خلدونؒ نے مقدمہ میں دیا ہے اور جس کا ترجمہ ان کے نصاب میں داخل بھی ہے۔ اسے چھوڑ کر مغربی مصنفین یا کسی اور کی طرف وہ اسی وقت رجوع کریں گے جب کہ انہیں از خود بھٹکنے یا گمراہ ہونے کی خواہش ہو اور ظاہر ہے کہ اس خواہش کی موجودگی میں کوئی کتاب ان کی مدد نہیں کر سکے گی۔

مولانا کی یہ بات بلاشبہ معقول ہے کہ:

”اگر ہم صحتِ نقل اور معقول و مدلل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان نہیں کریں گے اور اس سے صحیح نتائج نکال کر مرتب طریقے سے دنیا کے سامنے پیش نہیں کریں گے تو مغربی مستشرقین اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنفین جو اسے نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تاریخ ہی کا نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظام

زندگی کا بھی بالکل غلط تصور بٹھادیں گے" لہ

لیکن ہمیں اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

۱۔ مولانا نے اس فقرے میں دو خطرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک یہ کہ تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کرنے والے اس کے ذریعہ "اسلامی حکومت اور اسلامی نظام زندگی کا بھی بالکل غلط تصور بٹھادیں گے۔" دوسرے یہ کہ اس سے خود اسلامی تاریخ کا غلط تصور سامنے آئے گا۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے سو اگر یہ لوگ ہماری تاریخ سے ہمارے نظام حکومت اور ہمارے نظام زندگی کا استنباط کرنے کی حماقت کریں گے تو ہمارا صحیح جواب یہ ہو گا کہ ہمارا نظام حکومت اور ہمارا "نظام زندگی" تاریخ کی عام روایات سے نہیں، قرآن سے اور ان حادثات سے و آثار سے مستنبط ہے جو جرح و تعدیل کی کڑی شرائط پر پوری اترتی ہیں۔ ہمارے نظام زندگی کو سمجھنا ہے تو قرآن و حدیث سے اور فقہ و کلام سے سمجھو، خود مولانا مودودی بھی اس بات کو تسلیم فرماتے ہیں کہ "حرام و حلال فرض و واجب اور مکروہ و مستحب جیسے اہم شرعی امور کا فیصلہ" اور یہ فیصلہ کہ "دین میں کیا چیز سنت ہے اور کیا چیز سنت نہیں ہے" عام تاریخی روایات سے نہیں ہو سکتا۔ لہذا ہمارے لئے آخر یہ کیسے جائز ہو گا کہ اپنے نظام زندگی کے غلط تصور کو ختم کرنے کے لئے ہم خود ان لوگوں کی اس اصولی غلطی کا اعادہ کریں اور اپنے نظام زندگی کا صحیح تصور ثابت کرنے کے لئے ان کی توجہ قرآن و حدیث کی طرف منعطف کرانے کے بجائے خود بھی تاریخی بحثوں میں الجھ جائیں؟

وہ گئی دوسری بات کہ اگر ہم نے خود صحتِ نقل کے ساتھ اپنی تاریخ کو مرتب نہ کیا تو یہ لوگ ہماری تاریخ کا نہایت غلط تصور ذہنوں میں بٹھادیں گے۔ سو یہ بات بلاشبہ بالکل درست ہے اور فی الواقع اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو تحقیق و نظر کی چھلی میں چھان کر اس طرح مرتب کریں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اصلی صورت میں لوگوں کے سامنے آ سکے۔ لیکن اول تو ہم نہایت ادب کے ساتھ یہ گزارش کریں گے کہ مولانا مودودی صاحب نے خود ہماری تاریخ کا جو تصور دے دیا ہے اور ان کی کتاب کے تاریخی حصے سے عہدِ صحابہؓ و تابعین کا جو مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے، بجائے خود انتہائی غلط اور خطرناک تاثر ہے اور ہم یہ

سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ غلط تاثر اور کیا دے سکتے ہیں؟ دوسرے مولانا خود ہی غور فرمائیں کیا یہ عظیم کام اتنی آسانی سے عمل میں آسکتا ہے کہ خلافت و ملوکیت کی خالص احکامی بحث کے ضمن میں اس قدر سرسری طور پر اسے انجام دیا جائے؟ اگر ہمیں اپنی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ اصلی شکل میں پیش کر کے دلوں کو اس پر مطمئن کرنا ہے تو محض چند یکطرفہ روایات کو جمع کر دینے سے کچھ حاصل نہ ہو گا، اس کے بجائے ہمیں تحقیق و تنقید کے اصول مدلل طریقے سے معین کرنے ہوں گے..... ہر روایت کے بارے میں مقبول دلائل کے ساتھ یہ بتانا ہو گا کہ ہم نے اس کی مخالف روایات کو چھوڑ کر اسے کیوں اختیار کیا ہے؟ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر آپ طبریؒ، ابن کثیرؒ اور ابن اثیرؒ کے حوالوں سے واقعات کا ایک تسلسل قائم فرما کر دکھلائیں اور ”دوسرے لوگ“ بعینہ ان ہی کتابوں کے حوالوں سے واقعات کا دوسرا تسلسل ثابت کر دیں تو اس سے وہ ”نئی نسل“ آخر کیسے مطمئن ہو سکے گی جس کی گمراہی کا آپ کو خوف ہے؟

اسی لئے ہمارے رائے یہ ہے کہ تاریخ اسلام اور خاص طور سے اس کے مشاہرات صحابہؓ والے حصے کی تحقیق کا یہ کام یا تو اس پر فتن دور میں چھیڑنا نہ جائے کیونکہ امت کے سامنے اس سے زیادہ اہم مسائل ہیں جن کے مقابلے میں یہ کام کوئی اہمیت نہیں رکھتا یا پھر..... انفرادی رائے قائم کرنے کے بجائے متوازن فکر رکھنے والے اہل بصیرت علماء کی ایک جماعت اس کام کو انجام دے۔ اور تاریخ کی تحقیق و تنقید کے اصول طے کرنے میں زیادہ سے زیادہ علماء کا مشورہ اور تعاون حاصل کرے۔ اس کے بغیر اس سلسلے کی انفرادی کوششیں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کو نئے میدان فراہم کرنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دے سکیں گی۔ لہذا موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ اس معاملے میں ابن خلدونؒ جیسے اہل بصیرت اور متوازن الفکر مؤرخین کی اس تحقیق پر اعتماد کیا جائے جو انہوں نے تاریخ اسلام کے اولین مآخذ کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد پیش کی ہے۔ اس موضوع پر اگر کوئی انفرادی کوشش ہو بھی تو وہ اسی تحقیق کو بنیاد بنا کر اسے مزید وسعت دے اور کوئی ایسا نتیجہ نکال کر منظر عام پر نہ لائے جو صدیوں کے مسلمات کے خلاف ہو جس سے ذہنوں میں غلجائان پیدا ہو اور افتراق اور انتشار کا دروازہ کھلے۔

اس مختصر گزارش کے بعد ہم ”خلافت و ملوکیت“ کی ان باتوں کی طرف آتے ہیں جو

ہماری نگاہ میں سخت قابلِ اعتراض ہیں۔ قاعدے کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم پہلے صحابہ کرامؓ کی عدالت اور تاریخی روایات کی حیثیت سے متعلق ان اصولی مباحث پر گفتگو کرتے جو مولانا نے اپنے مقررین کے جواب میں چھیڑے ہیں، اس کے بعد جزئیات کی طرف آتے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صحابہؓ کی عدالت وغیرہ کے بارے میں جو اصولی بات ہم عرض کرنا چاہتے ہیں، مولانا مورودی صاحب کی اس کتاب کے بعد وہ شاید اس وقت تک مولانا کے قارئین کے دلوں میں بیٹھ نہ سکے جب تک مولانا کے بیان کردہ واقعات پر تبصرہ نہ کیا جائے خلافت و ملوکیت کو پڑھنے والوں میں اکثریت ایسے حضرات کی ہوگی جن کے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ مولانا کے بیان کردہ ہر واقعے کو اس کے اصل مآخذ میں دیکھ کر یہ فیصلہ کریں کہ یہ واقعہ جو تاثر دے رہا ہے وہ فی الواقع صحیح ہے یا نہیں۔ اس کے بجائے یقیناً بیشتر حضرات نے مولانا مورودی صاحب کی نقل پر اعتماد کر کے اس کتاب سے وہی تاثر لیا ہوگا جو یہ کتاب دے رہی ہے، ایسی حالت میں جب تک ان واقعات کی حقیقت نہ بتائی جائے۔ عدالت صحابہؓ کی بحث ”خلافت و ملوکیت“ کے ان قارئین کے دلوں میں نہیں اتر سکے گی جنہوں نے اس کتاب کو عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لئے ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے ان جزئی واقعات ہی کو سامنے لے آئیں جن پر ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔

پوری کتاب پر کما حقہ تبصرہ کرنا تو چند در چند وجوہ کی بنا پر ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، ہم یہاں صرف ان اعتراضات کو زیرِ بحث لائیں گے جو مورودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر وارد کئے ہیں، حضرت عثمانؓ کے بارے میں مولانا مورودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی کئی مقامات پر اپنے اسلوب بیان اور کئی جگہوں پر اپنے مواد کے لحاظ سے بہت قابلِ اعتراض ہے، لیکن حضرت معاویہؓ کے بارے میں تو وہ انتہائی خطرناک حد تک پہنچ گئے ہیں۔ اور ہماری پر خلوص دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس سے واپس لوٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اسی جذبے کے تحت ہم نے یہاں صرف ان اعتراضات کو اپنی گفتگو کے لئے چنا ہے جو انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وارد کئے ہیں۔ ہم ایک بار پھر یہ گزارش کریں گے کہ ہماری ان معروضات کو بحث و مباحث کی فضا سے ہٹ کر ٹھنڈے دل کے ساتھ پڑھا جائے اور چونکہ معاملہ صحابہ کرام کا ہے اس لئے اس نازک معاملے میں ذہن کو جماعتی تعصب یا محض اعتقاد کی قیود سے بالکل آزاد کر لیا جائے۔ امید ہے کہ ہماری یہ دردمندانہ

گزارش قابل قبول ہوگی۔

۱۔ بدعت کا الزام

”قانون کی بالائری کا خاتمہ“ کے عنوان کے تحت مولانا لکھتے ہیں۔
”ان بادشاہوں کی سیاست دین کے تابع نہ تھی، اس کے تقاضے وہ
ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے، اور اس معاملے میں حلال و
حرام کی تیزروانہ رکھتے تھے، مختلف خلفائے بنی امیہ کے عہد میں قانون کی
باندی کا کیا حال رہا، اسے ہم آگے کی سطور میں بیان کرتے ہیں۔“

حضرت معاویہؓ کے عہد میں

یہ پالیسی حضرت معاویہؓ ہی کے عہد سے شروع ہو گئی تھی۔“
اس ”پالیسی“ کو ثابت کرنے کے لئے مولانا نے چھ سات واقعات لکھے ہیں۔ پہلا
واقعہ وہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ :

”امام زہری کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ اور چاروں خلفائے
راشدین کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے،
نہ مسلمان کافر کا، حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانہ حکومت میں مسلمانوں کو
کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار دیا، حضرت عمر بن
عبد العزیز نے آکر اس بدعت کو ختم کیا، مگر ہشام بن عبد الملک نے اپنے
خاندان کی روایت کو پھر بحال کر دیا۔“ (ص- ۱۷۳)

اس واقعہ کے لئے مولانا نے البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۹ اور جلد ۹ صفحہ ۲۳۲
حوالہ دیا ہے لہذا پہلے اس کتاب کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

حدثنی الزہری قال: کان لایرث المسلم الکافر ولا الکافر
المسلم فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر و
عمر و عثمان و علی، فلما ولی الخلفاء معاویة وورث المسلم
من الکافر ولم یورث الکافر من المسلم، واخذ بنالک

الخلفاء من بعده فلما قام عمر بن عبدالعزيز راجع السنة
الاولی وتبعه فی ذلك یزید بن عبد الملک، فمما قام هشام اخذ
بسنة الخلفاء یعنی انه ورت المسلم من الكافر۔“

”امام زہری فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ اور خلفائے اربعہؓ کے عہد میں نہ
مسلمان کافر کا وارث ہوتا تھا نہ کافر مسلمان کا، پھر جب معاویہؓ خلیفہ بنے تو
انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا، اور کافر کو مسلمان کا وارث نہ
بیایا، ان کے بعد خلفاء نے بھی یہی معمول رکھا، پھر جب عمر بن عبدالعزیزؓ
خلیفہ ہوئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا۔ اور یزید بن عبد الملک نے
بھی ان کی اتباع کی، پھر جب ہشام آیا تو اس نے خلفاء کی سنت پر عمل کیا
یعنی مسلمان کو کافر کا وارث قرار دے دیا۔ لہ

اب اصل صورت حال ملاحظہ فرمائیے، واقعہ اصل میں یہ ہے کہ یہ مسئلہ عہد صحابہؓ
سے مختلف فیہ رہا ہے۔ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا، لیکن
اس میں اختلاف ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے یا نہیں، اس اختلاف کی تشریح
علامہ بدر الدین یعنی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے۔

”و اما المسلم فهل يرث من الكافر ام لا، فقالت عامة الصحابة
رضی اللہ تعالیٰ عنہم لا يرث، وبه اخذ علماءنا والشافعی
وهذا استحسان والقياس ان يرث وهو قول معاذ بن جبل
ومعاوية بن ابي سفيان، وبه اخذ مسروق والحسن ومحمد بن
الحنفية ومحمد بن علي بن حسين لہ“

”رہی یہ بات کہ مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے یا نہیں، سو عام صحابہ
کرامؓ کا قول تو یہی ہے کہ وہ وارث نہ ہو گا، اور اسی کو ہمارے علماء
”حنفیہ“ اور امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے لیکن یہ استحسان ہے۔ قیاس کا
تقاضا یہ ہے کہ وہ وارث ہو اور یہی حضرت معاذ بن جبل اور حضرت معاویہ

لے البدایہ والنہایہ ص ۲۳۲ ج ۹ مطبوعہ العادۃ

لے عمدة القاری ص ۲۶۰ ج ۲۳، ادارة البیاعۃ المیریتہ باب لایرث المسلم الکافر: الخ

کا مذہب ہے، اور اسی کو مسروقؓ، حسنؓ، محمد بن حنفیہؓ اور محمد بن علی بن حسینؓ نے اختیار کیا ہے۔“
اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

”أخرج ابن ابی شیبۃ من طریق عبداللہ بن معقل قال ما رأیت قضاء احسن من قضاء قضی بہ معاویۃ نرت اهل الكتاب ولا یرونکما یحل النکاح فیہم ولا یحل لہم و بہ قال مسروق وسعید بن المسیب و ابراہیم النخعی و اسحاق“

”ابن ابی شیبہؓ نے حضرت عبداللہ بن معقل سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ میں نے کوئی فیصلہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے سے بہتر نہیں دیکھا کہ ہم اہل کتاب کے وارث ہوں اور وہ نہ ہوں، یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے لئے ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے، مگر ان کے لئے ہماری عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔ اور یحییٰ مذہب مسروقؓ، سعید بن المسیبؓ، ابراہیم نخعی اور اسحاق رحمۃ اللہ کا ہے۔“

پھر حافظ ابن حجرؓ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے حوالے سے حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کی تائید میں ایک مرفوع حدیث بھی نقل کی ہے۔

”عن معاذ قال یرث المسلم من الکافر من غیر عکس واحتج بانہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الا سلام یرید ولا ینقص وهو حدیث اخر جہ ابوناؤدو صححہ الحاکم“

”حضرت معاذؓ فرماتے تھے کہ مسلمان کافر کا وارث ہو گا مگر اس کا عکس نہیں ہو گا، وہ دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ انہوں نے خود رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اسلام (انسانی حقوق میں) زیادتی کرتا ہے، کمی نہیں کرتا۔ یہ حدیث امام ابوداؤدؓ نے روایت کی ہے اور حاکمؓ نے اسے صحیح کہا ہے۔“

یہ تمام صورت حال آپ کے سامنے ہے، اسے ذہن میں رکھ کر مولانا مودودی کی
 نوریہ عبارت کو ایک بار پھر پڑھئے، مولانا نے یہ واقعہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا حضرت
 معاویہؓ اس مسئلے میں بالکل منفرد ہیں، اور کسی اجتہادی رائے کی بناء پر نہیں بلکہ (معاذ اللہ)
 سی سیاسی غرض سے انہوں نے یہ ”بدعت“ جاری کی ہے۔ اور اس طرح ”قانون کی
 تری کا خاتمہ“ کر ڈالا ہے، لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ سراسر فقہی مسئلہ ہے جس میں
 تنہا بھی نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت معاذ بن جبل جیسے جلیل القدر صحابی (جن
 نے علم و فقہ پر خود آنحضرتؐ کی شہادت موجود ہے) اور تابعینؓ میں سے مسروقؓ، حسن بصریؓ
 راہیمؓ، محمد بن حنفیہؓ، محمد بن علی بن حسینؓ اور اسحاق بن راہویہؓ جیسے فقہاء بھی ان کے
 اتھ ہیں۔ حضرت معاویہؓ کا یہ فقہی مسلک بلاشبہ بعد کے فقہاء نے اختیار نہیں کیا، ہم خود
 ی اس مسلک کے قائل نہیں ہیں، لیکن ساتھ ہی ہمارا اعتقاد یہ بھی ہے کہ اگر حضرت
 معاویہؓ اپنے اس اجتہاد میں بالکل تنہا ہوں تب بھی اس بات کا کوئی جواز نہیں ہے کہ ان کے
 اجتہاد کو ”بدعت“ کہا جائے، یا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ انہوں نے سیاست کو دین
 غالب رکھنے اور ”حلال و حرام کی تمیز“ کو مٹانے کی ”پالیسی“ شروع کر دی تھی، کیا حضرت
 معاویہؓ سے اختلاف کر کے حضرت معاویہؓ کو اتنا بھی حق نہیں رہا کہ وہ کسی شرعی مسئلے میں اپنے
 م و فضل سے کام لے کر کوئی اجتہاد کر سکیں؟ جب کہ وہ فقہاء میں سے ہیں، اور ان کے
 رے میں صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ :-

قیل لابن عباسؓ هل لك في امير المؤمنين معاوية؟ ما اوتيت
 الا بواحدة
 قال : اصاب، انه فقيهؓ

”حضرت ابن عباسؓ سے کہا گیا کہ امیر المؤمنین معاویہؓ ہمیشہ ایک رکعت
 وتر پڑھتے ہیں، کیا آپ اس معاملے میں کچھ فرمائیں گے؟
 ”حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا! انہوں نے درست کیا، وہ فقیہ ہیں“

۱۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اطمحوا لللال والحرام معاذ بن جبل
 ۲۔ صحیح بخاری، کتاب النواقب، ذکر معاویہ بن ابی سفیان، ص ۵۳۱، ج ۱، نور محمد کراچی

یہی وجہ ہے کہ وہ امام زہریؒ جن کا مقولہ مولانا مورودی صاحب نے نقل کیا ہے، حضرت معاویہؓ سے اس معاملے میں اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے اس فعل کو ”بدعت“ نہیں کہتے، بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے :

راجع السنن الاوٰلی ۱۵۰
”پہلی سنت کو لوٹا دیا“

اس میں ”پہلی سنت“ کا لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ دوسری سنت جو حضرت معاویہؓ نے جاری رکھی تھی، وہ بھی سنت ہی تھی، بدعت نہ تھی، لیکن حیرت ہے کہ مولانا مورودی صاحب ان کے اس جملے کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں :

”حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اس بدعت کو موقوف کیا۔“ (ص ۱۷۳)

(۲) نصف دیت کا معاملہ

حضرت معاویہؓ کے عہد میں ”قانون کی بالائری کے خاتمے“ اور سیاست کو دین پر غالب رکھنے کی ”پالیسی“ کی دوسری شہادت مولانا مورودی نے یہ پیش کی ہے :

”حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ دیت کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا، سنت یہ تھی کہ معاہدہ کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کر دیا۔ اور باقی خود لینی شروع کر دی۔“

(ص ۱۷۳، ۱۷۴)

اس میں اول تو خط کشیدہ جملہ نہ حافظ ابن کثیرؒ کا ہے، نہ امام زہریؒ کا۔ بلکہ یہ خود مولانا کا ہے۔ (یہ نشاندہی ہم نے اس لئے کی ہے کہ مولانا کی عبارت سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ حافظ ابن کثیرؒ کا ہے)

البدایہ والنہایہ کی اصل عبارت یہ ہے :

البدایہ والنہایہ، ص ۲۳۲ ج ۹

لہٰذا اس معاملے میں بھی مولانا مورودی سے غلطی ہوئی ہے، یہ مقولہ خود حافظ ابن کثیرؒ کا نہیں ہے بلکہ امام زہریؒ ہی کا ہے، وہ قال الزہری کے الفاظ اس پر شاہد ہیں

”وبه قال الزهري و مضت السنة ان دية المعاهد كدية المسلم
وكان معاوية اول من قصرها الى النصف واخذ النصف لنفسه“^۱
”مذکورہ سند ہی سے امام زہریؒ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ! سنت یہ چلی
آتی تھی کہ معاہدہ کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہوگی، اور حضرت
معاویہؓ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اسے کم کر کے نصف کر دیا، اور نصف
اپنے واسطے لے لی۔

یہ درست ہے کہ یہ عبارت سرسری نظر میں بڑی مغالطہ انگیز ہے، کیونکہ اس سے
بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے باقی نصف دیت خود اپنے ذاتی استعمال
میں لانی شروع کر دی تھی، لیکن کاش! مولانا مودودی اس مجمل اور سرسری مقولے کو دیکھ کر
حضرت معاویہؓ پر اتنا تکلیفین الزام عائد کرنے سے قبل صورت حال کی پوری تحقیق فرمالاتے،
ہمارا خیال ہے کہ اگر مولانا اس موقع پر شروع حدیث میں سے کسی بھی مستند کتاب کی
مراجعت فرماتے تو کوئی غلط فہمی باقی نہ رہتی۔

واقعہ اصل میں یہ ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ نے امام زہریؒ کا یہ مقولہ نہایت اختصار اور
اجمال کے ساتھ ذکر کیا ہے، ان کا پورا مقولہ سامنے ہو تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، مشہور
حدیث امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں ان کا یہ مقولہ ابن جریرؒ کی سند سے پوری
تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیے :

”عن الزهري قال كانت دية اليهودي والنصراني في زمن النبي صلى الله
صلى الله عليه وسلم مثل دية المسلم و ابى بكر و عمر و عثمان
رضى الله عنهم فلما كان معاوية اعطى اهل المقتول النصف
والقى النصف في بيت المال قال ثم قضى عمر بن عبدالعزيز
في النصف والقبى ما كان جعل معاوية“^۲

”امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ یہودی اور نصرانی کی دیت آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے عہد میں مسلمان کی دیت کے برابر تھی، حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ اور

۱ البدایہ والنہایہ، ص ۱۳۹ ج ۸

۲ السنن الکبریٰ للبیہقی، ص ۱۰۲ ج ۸ دائرة المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۳۵۴ھ

عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی ایسا ہی رہا۔ پھر جب حضرت معاویہؓ خلیفہ بنے تو آدمی دیت مقتول کے رشتہ داروں کو دی اور آدمی بیت المال میں داخل کر دی، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے دیت تو آدمی ہی رکھی، مگر (بیت المال کا) جو حصہ معاویہؓ نے مقرر کیا تھا وہ ساقط کر دیا۔“

اس سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ حضرت معاویہؓ نے آدمی دیت خود یعنی شروع نہیں کی تھی بلکہ بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دیا تھا۔ لہذا حافظ ابن کثیرؒ نے امام زہریؒ کا جو مقولہ نقل کیا ہے اس میں ”اخذ النصف لنفسہ“ (آدمی خود یعنی شروع کر دی) سے مراد بیت المال کے لئے لینا ہے نہ کہ اپنے ذاتی استعمال کے لئے۔

اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کی دیت مسلمان کے برابر کی تھی تو حضرت معاویہؓ نے اسے نصف کر کے باقی نصف کو بیت المال میں کیوں داخل کر دیا؟ سو حقیقت یہ ہے کہ معاہدہ کی دیت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف روایتیں مروی ہیں، اس لئے یہ مسئلہ عہد صحابہؓ سے مختلف فیہ چلا آتا ہے۔ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس طرح منقول ہے کہ :

عقل الکافر نصف دية المسلم

”کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہوگی“

چنانچہ اسی حدیث کے پیش نظر حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ اور امام مالکؒ اسی بات کے قائل ہیں کہ معاہدہ کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہونی چاہئے۔ اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

دینہ نیمی دینہ مسلم

”وہی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہے“

چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ کا مسلک اسی حدیث پر جہتی ہے، اور وہ

۱۔ رواہ احمد و الترمذی و روی مثله ابن ماجہ (نیل الاوطار ص ۶۳ ج ۷ مطبع عثمانیہ

(۱۳۵۰ھ)

۲۔ نیل الاوطار ص ۶۵ ج ۷ و دبیاتہ الجہد ص ۲۳۳ ج ۲ طبع السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۱۰۲ ج ۸

مسلمان اور معاہدہ کی دیت میں کوئی فرق نہیں کرتے۔^۱
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ یہ دونوں روایتیں مروی ہیں، اس لئے حضرت
معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ آدمی دیت
مقتول کے ورثاء کو دلوادی اور باقی نصف بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کی
ایک عقلی وجہ بھی خود بیان فرمائی، حضرت ربیعہؓ فرماتے ہیں کہ:

”فقال معاویة ان كان اهله اصابوا به فقد اصاب به بيت مال
المسلمين فاجعلوا لبيت مال المسلمين النصف ولاهله
النصف خمسمائة دينار ثم قتل رجل اخر من اهل النعمة فقال
معاویة لو انا نظرنا الى هذا الذي يدخل بيت المال فجعلناه
وضيعة عن المسلمين وعونا لهم“^۲

”حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ ذی کے قتل سے اگر اس کے رشتہ داروں کو
نقصان پہنچا ہے تو مسلمانوں کے بیت المال کو بھی نقصان پہنچا ہے (کیونکہ
جو چیز وہ ادا کیا کرتا تھا وہ بند ہو گیا۔ تقی) لہذا دیت کا آدھا حصہ (پانچ سو
دینار) مقتول کے رشتہ داروں کو دے دو اور آدھا بیت المال کو، اس کے
بعد ذمیوں میں سے ایک اور شخص قتل ہوا تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ جو
رقم ہم بیت المال میں داخل کر رہے ہیں، اگر ہم اس پر غور کریں تو اس
سے ایک طرف مسلمانوں کا بوجھ ہلکا ہو اور دوسری طرف یہ ان کے لئے
اعانت بھی ہوئی۔

ایک مجتہد کو حق ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس اجتہاد سے علمی طور پر اختلاف کرے
لیکن یہ اعتراف ہر غیر جانب دار شخص کو کرنا پڑے گا کہ حضرت معاویہؓ نے اس طرح

۱۔ نیل الاوطار ص ۵۵ ج ۷ دہ ایضاً المجلد ۳۱۳ ج ۲

۲۔ مراسیل ابی داؤد ص ۱۳ مطبوعہ اصح المطابع۔ والجوہر السنی تحت البیہقی ص ۱۰۲ و ۱۰۳ ج ۸، ہم
نے یہ الفاظ موخر الذکر سے نقل کئے ہیں، اول الذکر میں ”وضیعة عن“ کے بجائے ”وضیعة علی“ کا لفظ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعارض احادیث میں جس خوبی کے ساتھ تطبیق دی ہے وہ ان کے تفقہ اور علمی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ انصاف فرمائیے کہ ان کے اس حسین فقہی اجتہاد کی تعریف کرنے کے بجائے اسے ”قانون کی بالائری کا خاتمہ“ قرار دینا کتنا بڑا ظلم ہے؟ یہاں ایک بات اور واضح کر دینا مناسب ہو گا اور وہ یہ کہ اگرچہ امام زہریؒ کا قول یہی ہے کہ حضرت معاویہؓ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ ذی کی دیت مسلمان کے برابر قرار دیتے آ رہے تھے اور حضرت معاویہؓ نے پہلی بار اس میں تغیر کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں روایات بہت مختلف ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں تو ہم ابھی لکھ کر آئے ہیں، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی اس معاملے میں مختلف روایات مروی ہیں، بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ ان کے عہد میں ذی کی دیت مسلمان کی دیت سے ایک تہائی وصول کی جاتی تھی۔ مشہور محدث علامہ ابن الترمذیؒ تحریر فرماتے ہیں :

وعمر و عثمان قد اختلف عنہما

اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے مختلف روایات مروی ہیں۔

اسی لئے امام شافعیؒ نے بھی اسی ایک تہائی والے مسلک کو اختیار کیا ہے۔

(۳) مال غنیمت میں خیانت

یک اسی قسم کا اعتراض مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ :-

”مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ

اور سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی

رو سے پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے

اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم ہونا چاہئے جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو،

لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے

۱۔ الجہرا لنتی تحت سنن البیہقی ص ۱۰۳ ج ۸ مزید ملاحظہ ہو نیل الاوطار ص ۶۵ ج ۷

۲۔ نیل الاوطار بحوالہ مذکورہ و بدایۃ الجہد ص ۳۱۳ ج ۲

لئے الگ نکال دیا جائے، پھر باقی مال شری قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔“ (ص : ۱۷۳)

اس اعتراض کی سند میں مولانا نے پانچ کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جن میں سے ایک البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۹ جلد ۸ کا حوالہ بھی ہے، ہم یہاں اس کی اصل عبارت نقل کرتے ہیں :-

وفی ہلہ السنة غزا الحکم بن عمرو نائب زیاد علی خراسان جبل الاسل عن امر زیاد فقتل منهم خلقا کثیرا وعم اموالاً حمة فکتب المعز زاد:

ان امیر المؤمنین قد جاء کتابہ ان یصطفیٰ له کل صفراء و بیضاء یعنی الذهب والفضة - یجمع کلہ من ہذہ الغنیمۃ لبیت المال فکتب الحکم بن عمرو : ان کتاب اللہ مقدم علی کتاب امیر المؤمنین، وانه واللہ لو کانت السماوات والارض علی عدو فاتھی اللہ یجعل له مخرجا ثم نادى فی الناس ان اغدوا علی قسم غنیمتکم فقسما بینہم وخالف زیادا فیما کتب الیہ عن معاویہ وعزل الخمس کما امر اللہ ورسولہ

”اسی سال خراسان میں زیاد کے نائب حضرت حکم بن عمرو نے زیاد کے حکم سے جبل الاسل کے مقام پر جہاد کیا بہت سے آدمیوں کو قتل کیا اور بہت سامان غنیمت حاصل کیا، تو زیاد نے انہیں لکھا کہ :

امیر المؤمنین کا خط آیا ہے کہ سونا چاندی ان کے لئے الگ کر لیا جائے اور اس مال غنیمت کا سارا سونا چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا جائے۔ حکم بن عمرو نے جواب میں لکھا کہ اللہ کی کتاب امیر المؤمنین کے خط پر مقدم ہے، اور خدا کی قسم اگر آسمان وزمین کسی کے دشمن ہو جائیں اور وہ اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا ہے پھر

انہوں نے لوگوں میں اعلان کیا کہ تم اپنے مال غنیمت کو تقسیم کرنا شروع کرو، چنانچہ اس مال غنیمت کو انہوں نے لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اور زیاد نے حضرت معاویہؓ کی طرف منسوب کر کے جو کچھ انہیں لکھا تھا، اس کی مخالفت کی اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق بیت المال کے لئے اگ کیا۔“

اس عبارت کا مولانا مودودی صاحب کی عبارت کے ساتھ مقابلہ فرمائیے تو مندرجہ ذیل فرق واضح طور پر نظر آئیں گے :

(۱) البدایہ والنہایہ کی اس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ اس حکم کی رو سے حضرت معاویہؓ کی ذات کے لئے سونا چاندی نکالنے کا ارادہ نہیں تھا بلکہ بیت المال کے لئے نکالنا پیش نظر تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ حکم کے الفاظ صاف لکھ رہے ہیں کہ :-

یجمع کلہ من ہذہ الغنیمۃ لبیت المال

”اس مال غنیمت میں سے سارا سونا چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا جائے۔“

مگر مولانا مودودی اسی عبارت کے حوالے سے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ :-

”حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی، سونا ان کے لئے اگ نکال لیا جائے۔“ (ص : ۱۷۳)

ہمارا نقطہ قطعی طور پر سرگرمیاں ہے کہ اس تفاوت کی کیا تاویل کیا تو جہہ کریں؟“

(۲) مولانا مودودی کی عبارت کو پڑھ کر ہر پڑھنے والا یہ تاثر لے گا کہ جن تواریخ کا مولانا نے حوالہ دیا ہے ان میں صراحت کے ساتھ حضرت معاویہؓ کا یہ حکم براہ راست منقول ہوگا، اسی حکم کو دیکھ کر مولانا نے یہ عبارت لکھی ہے لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ البدایہ والنہایہ میں اور اسی طرح باقی تمام تواریخ میں حضرت معاویہؓ کا براہ راست کوئی حکم منقول نہیں بلکہ زیاد نے ان کی طرف منسوب کر کے اپنے ایک نائب کو ایسا لکھا تھا اور یہ بات کسی تاریخ سے

لے اسی وجہ سے حافظ ابن کثیرؒ نے بھی یہ الفاظ لکھے ہیں کہ خلاف زیاد اذیما کتب اللہ عن معاویہؓ اور خلاف معاویہؓ نہیں فرمایا:

ثابت نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے واقعاً زیاد کو ایسا لکھا تھا یا زیاد نے خواہ مخواہ ان کی طرف یہ غلط بات منسوب کر دی تھی؟

(۳) مولانا مورودی نے اس ”حکم“ کا تو ذکر فرمایا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا کہ اس حکم کی تعمیل سرے سے کی ہی نہیں گئی۔ چنانچہ اگر اصل کتابوں کی مراجعت نہ کی جائے تو ہر بڑھنے والا سمجھے گا کہ یقیناً اس حکم کی تعمیل بھی کی گئی ہوگی۔ حالانکہ آپ نے دیکھا الہدایہ والنہایہ میں صاف تصریح ہے کہ حضرت حکم بن عمروؓ نے اس مجمل حکم کی بھی تعمیل نہیں فرمائی۔

(۴) مولانا مورودی صاحب کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ حکم مستقل طور سے جاری کر دیا ہوگا۔ حالانکہ اگر زیاد کو سچا مان لیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ، حکم ایک خاص جماد سے متعلق تھا۔ گویا صورتحال تاریخ کی روشنی میں یہ ہے کہ زیاد۔ اپنے ایک نائب کو خط لکھتے وقت یہ لکھا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے لکھا ہے کہ جبل الاسل۔ جماد میں جو مال غنیمت ملا ہے اس میں سے سونا چاندی بیت المال کے لئے الگ کر لیا جائے نائب کو زیاد کا یہ خط ملا مگر اس نے اس حکم کو کتاب اللہ کے خلاف سمجھ کر اس کی تعمیل کی، لیکن مولانا نے آگے پیچھے کی تمام باتوں کو چھوڑ دیا اور حضرت معاویہؓ پر مال غنیمت تقسیم کے معاملہ میں کتاب و سنت کی ”صریح خلاف ورزی“ کا الزام لگا کر براہ راست لکھا کہ :

”حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے سونا چاندی ان کے لئے الگ نکال لیا جائے۔“

تاریخ کے اندر اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اسے ہم نے اوپر بعینہ نقل کر دیا ہے اب مولانا مورودی کی عبارت سے قطع نظر کر کے اصل عبارت پر آپ غور فرمائیں گے ممکن ہے کہ ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ اگر حضرت معاویہؓ کا یہ حکم شریعت کے مطابق تھا حضرت حکم بن عمروؓ نے جو خود صحابہؓ میں سے ہیں، اس پر اتنی خشکی کا اظہار کیوں فرمایا؟ اسے کتاب اللہ کے خلاف کیوں قرار دیا؟ اس شبہ کے جواب میں عرض ہے کہ جتنی توار ہم نے دیکھی ہیں، ان سب میں یہ واقعہ اس قدر اجمال کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ اس۔ صحیح صورتحال کا پتہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔

اول تو زیاد کا واسطہ ہی مخدوش ہے، کچھ پتہ نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے واقعاً

مضمون کا خط لکھا بھی تھا یا نہیں؟ اور اگر لکھا تھا تو اس کے الفاظ کیا تھے؟ اور ان کا واقعی منشاء کیا تھا؟ زیادے ان کے الفاظ روایت بالمعنی (INDIRECT NARRATION) کے طور پر ذکر کئے ہیں جس میں رد و بدل کی بہت کچھ گنجائش ہے۔

اور اگر فرض کر لیا جائے کہ زیادے کسی بددیانتی یا غلط فہمی کے بغیر حضرت معاویہؓ کا خط درست طور پر نقل کیا ہو تب بھی عین ممکن ہے کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہو، اور حضرت معاویہؓ اپنے اندازے یا کسی اطلاع کی بناء پر یہ سمجھے ہوں کہ جبل الاسل کے جہاد میں جو سونا چاندی ہاتھ آیا ہے وہ کل مال غنیمت کے پانچویں حصے سے زائد نہیں ہے اس لئے انہوں نے بیت المال کی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ حکم جاری فرمایا ہو کہ مال غنیمت میں سے جو پانچواں حصہ بیت المال کے لئے بھیجا جائے گا اس میں دیگر اشیاء کے بجائے صرف سونا چاندی ہی بھیجا جائے۔ ظاہر ہے یہ حکم کسی طرح کتاب و سنت کے خلاف نہ تھا لیکن حضرت حکم بن عمروؓ نے اس پر اس لئے ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ فی الواقعہ مال غنیمت کے طور پر ملنے والا سونا چاندی پانچویں حصہ سے زائد تھا۔ ایسی صورت میں وہ سارا سونا چاندی بیت المال میں داخل کرنے کو کتاب اللہ کے خلاف تصور کرتے تھے۔

غرض کہ اس مجمل واقعہ کی بہت سی توجیہات ممکن ہیں۔ اب یہ بات عقل اور دیانت کے قطعی خلاف ہوگی کہ ہم ان قوی احتمالات کو قطعی طور پر رد کر دیں جن سے حضرت معاویہؓ کی مکمل براءت واضح ہوتی ہو، اور جو ضعیف احتمالات ان کی ذلت والا صفات کو مجروح کرتے ہوں انہیں اختیار کر کے بلا تامل یہ حکم لگا دیں کہ ”حضرت معاویہؓ نے مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔“

حضرت علیؓ پر سب و شتم

مولانا مودودی صاحب نے ”قانون کی بالا تری کا خاتمہ“ کے عنوان کے تحت حضرت معاویہؓ پر چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ :-

”ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسر منبر حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبویؐ میں منبر رسولؐ پر عین روضہ نبویؐ کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے، کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف ہے اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے آکر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبہ جمعہ میں سب علیؓ کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کر دی :-

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان... الخ (ص : ۱۷۴)

مولانا نے اس عبارت میں تین دعوے کئے ہیں، ایک یہ کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ پر خود سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، دوسرے یہ کہ ان کے تمام گورنر یہ حرکت کرتے تھے، تیسرے یہ کہ یہ گورنر حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کرتے تھے۔ اب تینوں دعوؤں کا اصل مآخذ میں مطالعہ کیجئے:

جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے سو حضرت معاویہؓ کی طرف اس ”مکروہ بدعت“ کو منسوب کرنے کے لئے انہوں نے تین کتابوں کے پانچ حوالے پیش کئے ہیں (طبری جلد ۴ ص

۱۸۸، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۳ ج ۳ ص ۱۵۳، البدایہ ج ۹ ص ۸۰، ہم نے ان میں سے ایک ایک حوالہ کو صرف مذکورہ صفحات ہی پر نہیں بلکہ ان کے آس پاس بھی بنظر غائر دیکھا، ہمیں کسی بھی کتاب میں یہ کہیں نہیں ملا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ "خود" حضرت علیؓ پر برسر منبر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے لیکن چونکہ مولانا نے تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ اس "انسانی اخلاق کے خلاف" فعل کا ارتکاب وہ "خود" کیا کرتے تھے۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ شاید مولانا نے ایسی کوئی روایت کسی اور مقام پر دیکھ لی ہو اور اس کا حوالہ دینا بھول گئے ہوں، چنانچہ ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری پڑی روایت ایسی مل جائے لیکن یقین فرمائیے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی، پھر بعض ان قاریوں کی طرف بھی رجوع کیا جن کے بارے میں مولانا کو اعتراف ہے کہ ان کے مصنف شیعہ تھے مثلاً مسعودی کی مروج الذهب، لیکن اس میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملی۔

اس کے برعکس اس حوالے کے دوران ایسی متعدد روایات ہمیں ملیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ سے اختلاف کے باوجود ان کا کس قدر احترام کرتے تھے؟ ان میں چند روایات ملاحظہ فرمائیے:

(۱) حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:-

لما جاء خبير قتل عليؓ الى معاوية جعل يبكي فقال له امراته
ان بكيه وقد قاتلته فقال ويحك انك لاندرين ما فقد الناس من
الفضل والفقہ والعلم

"جب حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کے قتل ہونے کی خبر ملی تو وہ رونے لگے۔ ان کی امیہ نے ان سے کہا کہ آپ اب ان کو روتے ہیں حالانکہ زندگی میں، ان سے لڑ چکے ہیں؟ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ تمہیں پتہ نہیں کہ آج لوگ کتنے علم و فضل اور فقہ سے محروم ہو گئے۔"

یہاں حضرت معاویہؓ کی امیہ نے یہ اعتراض تو کیا کہ اب آپ انہیں کیوں روتے ہیں جب کہ زندگی میں ان سے لڑتے رہے، لیکن یہ نہیں کہا کہ زندگی میں تو آپ ان پر سب و شتم

کیا کرتے تھے، اب ان پر کیوں روتے ہیں؟

(۲) امام احمد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بسر بن ارطاةؓ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت زید بن عمرو بن خطابؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو کچھ برا بھلا کہا، حضرت معاویہؓ نے اس پر انہیں توبیح کرتے ہوئے فرمایا

نشتم علیاً وھو جنہ

”تم علیؓ کو گالی دیتے ہو حالانکہ وہ ان کے دادا ہیں۔“

(۳) علامہ ابن اثیر جزریؒ نے حضرت معاویہؓ کا جو آخری خطبہ نقل کیا ہے، اس میں ان کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ

لن یأخذکم من بعدی الامن انا خیر منہ کما ان من قبلی کان خیرا منیؓ

میرے بعد تمہارے پاس (جو خلیفہ) بھی آئے گا، میں اس سے بہتر ہوں گا، جس طرح مجھ سے پہلے مجھے (خلفاء) تھے مجھ سے بہتر تھے۔

(۴) علامہ ابن عبدالبرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے بڑے اصرار کے ساتھ ضرار صدائی سے کہا کہ ”میرے سامنے علیؓ کے اوصاف بیان کرو“ ضرار صدائی نے بڑے بلیغ الفاظ میں حضرت علیؓ کی غیر معمولی تعریفیں کیں، حضرت معاویہؓ سنتے رہے اور آخر میں روپڑے پھر فرمایا

رحم اللہ ابالحسن، کان واللہ کذالک

اللہ ابو الحسن (علیؓ) پر رحم کرے، خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے۔

نیز حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ مختلف فقہی مسائل میں حضرت علیؓ سے خط و کتابت کے ذریعے معلومات حاصل کیا کرتے تھے چنانچہ جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ

۱۔ اللبری ص ۲۳۸ ج ۳ مطبع الاستقامة بالقاهرة ۱۳۵۸ھ واکمل لابن الاثیر ص ۵ ج ۴

۲۔ اکمل لابن الاثیر ص ۲ ج ۴

۳۔ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۳، ۳۴ ج ۳۔ ۱۔ مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ القاہرہ ۱۹۳۰ء

نہب الفقہ والعلم بموت ابن ابی طالبؓ

”ابن ابی طالبؓ کی موت سے فقہ اور علم رخصت ہو گئے۔“^۱

غرض اس جستجو کے دوران ہمیں اس قسم کی تو کئی روایتیں ملیں، لیکن کوئی ایک روایت بھی ایسی نہ مل سکی جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) خطبوں میں حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر یہ الزام کس بنیاد پر کس دل سے عائد کیا ہے؟ پھر دوسرا دعویٰ مولانا نے یہ کیا ہے کہ ”ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔“

ظاہر ہے کہ مولانا کا یہ دعویٰ اس وقت تو ثابت ہو سکتا ہے جب وہ حضرت معاویہؓ کے ”تمام گورنروں“ کی ایک فہرست جمع فرما کر ہر ایک گورنر کے بارے میں یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں سے ہر ایک نے انفرادی یا اجتماعی طور پر (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالیاں دی تھیں، نیز اس بات کا بھی ثبوت ان کے پاس ہو کہ ان میں سے ہر ایک کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حضرت معاویہؓ نے یہ حکم دیا تھا کہ حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کیا کرو۔ لیکن اپنے اس الزام کی تائید میں جو حوالے مولانا نے پیش کئے ہیں ہم نے ان کی طرف رجوع کیا تو ان میں سے ایک بات بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکی۔ اول تو یہ سمجھ لیجئے کہ مولانا کے دیئے ہوئے پانچ حوالوں میں حضرت معاویہؓ کے صرف دو گورنروں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کیا کرتے تھے، ایک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ دوسرے مروان بن الحکمؓ۔ اگر ان روایات کو تھوڑی دیر کے لئے درست مان لیا جائے تو زیادہ سے

۱۔ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۵ ج ۳، ذکر سیدنا علیؓ بن ابی طالب

۲۔ طبری ج ۴ ص ۱۸۸ اور کامل ابن اثیر ص ۲۳۳ ج ۳ کا حوالہ مولانا نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے متعلق دیا ہے اور اہدایہ ص ۲۵۹ ج ۸ کا حوالہ مروان بن الحکم سے متعلق ہے۔ رہ گیا اہدایہ ص ۸۰ ج ۹ کا حوالہ سوا اس میں حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف الحنفی کا ذکر ہے جو حضرت معاویہؓ کا نہیں بلکہ ان کے بہت بعد ولید بن عبدالملک کا گورنر تھا۔ اسی طرح ابن اثیر ص ۱۵۳ ج ۴ میں بنو امیہ کے خلفاء کا عمومی تذکرہ ہے حضرت معاویہؓ یا ان کے کسی گورنر کا نہیں۔

زیادہ حضرت معاویہؓ کے دو گورنروں پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو برا بھلا کہا کرتے تھے۔ اس سے آخر یہ کیسے لازم آگیا کہ حضرت معاویہؓ کے ”تمام گورنر“ خود حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کیا کرتے تھے۔ یہ ”تمام گورنر“ کا الزام تو ایسا ہے کہ اسے شاید کسی موضوع روایتوں کے مجموعے سے بھی ثابت نہ کیا جاسکے۔

اس کے بعد اب ان دو روایتوں کی حقیقت بھی سن لیجئے جن میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور مروان بن الحکم کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) حضرت علیؓ پر سب و شتم کیا کرتے تھے۔

پہلی روایت اصلاً علامہ ابن جریر طبریؒ نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کی ہے اور انہیں سے نقل کر کے ابن اثیر جزیریؒ نے اپنی تاریخ الکامل میں اسے درج کر دیا ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں :

قال هشام بن محمد عن ابي مخنف عن المجالد بن سعيد والصقعب بن زهير و فضيل بن خديج والحسين بن عقبة المرادي قال كل قد حدثني بعض هذا الحديث فاجتمع حديثهم فيما سقت من حديث حجر بن علي الكندي واصحابه ان معاوية بن ابي سفيان لما ولي المغيرة بن شعبه في جمادى سنة ٢١ دعاه فحمد الله وانكى عليه ثم قال اما بعد... وقد اردت ايصاك باشياء كثيرة فانا ناركها اعتماداً على بصرک بما يرضيني ويسعد سلطاني ويصلح به رعيتي ولست ناركاً ايصاءك بخصلة لا نتحم عن شتم علي و ذمه والترحم على عثمان والاستغفار له والعيب على اصحاب علي والاقصاء لهم وترك الاستماع منهم... قال ابو مخنف قال الصقعب بن زهير سمعت الشعبي يقول... واقام المغيرة على الكوفة عاملاً لمعاوية سبع سنين واشهرأ وهو من احسن شيئي سيرة واشده حبا للعافية غير انه لا يدع ذم علي والوقوف فيه له“

”ہشام بن محمد نے ابو مخنف سے اور انہوں نے مجالد بن سعید، مقعب ابن زہیر، فضیل بن خدیج اور حسین بن عقبہ مرادی سے روایت کیا ہے کہ ابو مخنف کہتے ہیں کہ ان چاروں نے مجھے آئندہ واقعہ کے تھوڑے تھوڑے ٹکڑے سنائے، لہذا جبر بن عدی کنڈی کا جو واقعہ میں آگے سنا رہا ہوں اس میں ان چاروں کی مختلف روایتیں جمع ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ماہ جمادی ۴۱ھ میں معاویہ بن ابی سفیانؓ نے کوفہ پر مغیرہ بن شعبہؓ کو گورنر بنایا تو انہیں بلا کر پہلے اللہ کی حمد و ثنا کی، پھر کہا کہ..... میرا ارادہ تھا کہ میں تمہیں بہت چیزوں کی نصیحت کروں، لیکن چونکہ مجھے اعتماد ہے کہ تم مجھے راضی رکھتے، میری سلطنت کو کامیاب بنانے اور میری رعایا کی اصلاح کرنے پر پوری نظر رکھتے ہو، اسلئے میں ان تمام باتوں کو چھوڑتا ہوں۔ البتہ تمہیں ایک نصیحت کرنا میں ترک نہیں کر سکتا وہ یہ کہ علیؓ کی مذمت کرنے اور انہیں گالی دینے سے پرہیز نہ کرنا، عثمانؓ پر رحمت بھیجتے رہنا اور ان کے لئے استغفار کرتے رہنا۔ علیؓ کے اصحاب پر عیب لگانا، انہیں دور رکھنا اور ان کی بات نہ سنانا، عثمانؓ کے اصحاب کی خوب تعریف کرنا، انہیں قریب رکھنا اور ان کی باتیں سنا کرنا۔ ابو مخنف کہتا ہے کہ مقعب بن زہیر نے کہا کہ میں نے شعبی کو کہتے ہوئے سنا کہ..... مغیرہؓ کوفہ میں، معاویہؓ کے عامل کی حیثیت سے سات سال اور کچھ مہینے رہے وہ بہترین سیرت کے مالک تھے اور عافیت کو تمام لوگوں سے زیادہ پسند کرتے تھے، البتہ وہ علیؓ کی مذمت اور انہیں برا بھلا کہتا نہیں چھوڑتے تھے۔“

یہ ہے وہ روایت جو مولانا کے مذکورہ بیان کی اصل الاصول ہے۔ اور جسے دیکھ کر مولانا نے صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر نہیں بلکہ خود حضرت معاویہؓ اور ان کے تمام گورنروں پر بلا استثناء الزام لگا دیا ہے کہ وہ برسرِ منبر حضرت علیؓ پر سب و شتم کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو خود اسی روایت میں آگے چل کر صاف لکھا ہوا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کس طرح کیا کرتے تھے؟ ٹھیک اسی صفحہ پر جس پر ابو مخنف کے مذکورہ بالا الفاظ لکھے ہیں، آگے یہ الفاظ بھی ہیں

کہ :

”قام المغيرة فقال في علي و عثمان كما كان يقول و كانت
مقالته اللهم ارحم عثمان بن عفان و تجاوز عنه واجزه باحسن
عمله فانه عمل بكتايك و اتبع سنة نبيك صلى الله عليه وسلم
و جمع كلمتنا و حقن دماءنا و قتل مظلوما اللهم فارحم
انصاره و اوليائه و محبيه و الطالبين بدعه و يدعو علي قتلته له“
”حضرت مغیرہ کھڑے ہوئے اور حضرت علیؓ اور عثمانؓ کے بارے میں جو
کچھ کہا کرتے تھے وہی کہا۔ ان کے الفاظ یہ تھے کہ یا اللہ عثمان بن عفان پر
رحم فرما اور ان سے درگزر فرما اور ان کے بہتر عمل کی انہیں جزا دے،
کیونکہ انہوں نے تیری کتاب پر عمل کیا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کی اتباع کی اور ہماری بات ایک کر دی اور ہمارے خون کو بچایا اور مظلوم
ہو کر قتل ہو گئے، یا اللہ ان کے مددگاروں، دوستوں، محبت کرنے والوں اور
ان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں پر رحم فرما اور وہ ان کے قاتلوں کے
لئے بددعا کرتے تھے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت حضرت مغیرہؓ حضرت علیؓ کی ذات پر کوئی شتم نہیں
فرماتے تھے، بلکہ وہ قاتلین عثمانؓ کے لئے بددعا کیا کرتے تھے۔ جسے شیعہ راویوں نے حضرت
علیؓ پر لعن و طعن سے تعبیر کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب راوی حضرت مغیرہ کے الفاظ صراحتاً
نقل کر رہے ہیں تو فیصلہ ان الفاظ پر کیا جائے گا نہ کہ اس تاثر پر جو ان الفاظ سے راویوں نے
لیا۔ یا اس تعبیر پر جو ”روایت بالمعنی“ (INDIRECT NARRATION) میں انہوں
نے اختیار کی۔

پھر دوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ حافظ ابن جریرؒ نے یہ روایت جس سند کے ساتھ
نقل کی ہے، وہ اول سے آخر تک شیعہ یا کذاب اور جھوٹے راویوں پر مشتمل ہے۔

اس روایت کا پہلا راوی ہشام بن الکلبی ہے جو مشہور راوی محمد بن السائب الکلبی
کا بیٹا ہے اس کے بارے میں ابن عساکر کا قول ہے کہ :-

رافضی لیس بشقہ

”وہ رافضی ہے، ثقہ نہیں“^۱

اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن ابی طی نے اسے امامیہ (شیعوں کا ایک فرقہ) میں شمار کیا ہے اور ابن ابی یعقوب حریمی فرماتے ہیں کہ :

راویۃ للمثالب غایۃ

”اتحاد رجب کی مثالب روایت کرتا ہے۔“

پھر دوسرا راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہے، اس کے بارے میں حافظ ابن عدی

فرماتے ہیں :

شیعی محذوق صاحب اخبار ہم ثلث

”جلابھنا شیعہ ہے اور انہی کی روایت کا ذکر کرتا ہے۔“

تیسرا راوی مجالد بن سعید ہے، ان کے ضعیف ہونے پر تو تمام ائمہ حدیث کا اتفاق ہے ہی، یہاں تک کہ تاریخی روایات میں بھی انہیں ضعیف مانا گیا ہے۔ امام یحییٰ بن سعید قطان کے کوئی دوست کہیں جا رہے تھے، انہوں نے پوچھا۔ کہاں جا رہے ہو۔

انہوں نے کہا۔ ”وہ بن جریر کے پاس جا رہا ہوں، وہ سیرت کی کچھ کتابیں اپنے باپ سے بواسطہ مجالد بن سعید نے فرمایا، تم بہت جھوٹ لکھ کر لاؤ گے۔“^۲ اس کے علاوہ اشج کا قول ہے کہ۔ یہ ”شیعہ ہے“^۳

چوتھے راوی فضیل بن خدیج ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابو حاتم کا قول ہے کہ فضیل بن خدیج اشتر کے غلام سے روایت کرتا ہے، مجہول ہے

۱۔ لسان المیزان ص ۱۹۶ ج ۶ دائرۃ المعارف ۱۳۳۰ھ

۲۔ ایضاً ص ۱۹۷ ج ۶

۳۔ ابو حاتم الرازی: کتاب الجرح و التعديل ص ۳۶۱ ج ۳ قسم اول، دائرۃ المعارف و کن ۱۳۷۲ھ و

تہذیب التذیب ص ۳۰ ج ۱۰ سن ۱۳۲۶ھ

۴۔ میزان الاعتدال ص ۳۳۸ ج ۳

اور جو راوی اس سے روایت کرتا ہے وہ متروک ہے۔ ان کے علاوہ دو راوی جن کا ذکر ابو مخنف نے کیا ہے، یعنی مقعب بن زہیر اور فضیل بن خدیج، وہ تو سرے سے مجہول ہی ہیں۔ اب آپ غور فرمائیے کہ جس روایت کے تمام راوی ازاوّل تا آخر شیعہ ہوں، اور ان میں سے بعض نے مقصد ہی یہ بنا رکھا ہو کہ صحابہ کرامؓ کی طرف بری بھلی باتیں منسوب کریں۔ کیا ایسی روایت کے ذریعے حضرت معاویہؓ یا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے خلاف کوئی الزام عائد کرنا سراسر ظلم نہ ہو گا؟ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ: میں نے قاضی ابوبکر بن العربی اور علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابوں پر اعتماد کرنے کے بجائے خود تحقیق کر کے آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی کتابیں شیعوں کی رد میں لکھی ہیں لہذا ان کی حیثیت ”وکیل صفائی“ کی سی ہو گئی ہے۔

اب مولانا مودودی صاحب خود ہی انصاف فرمائیں کہ کیا یہ غیر جانبداری کا تقاضا ہے کہ ”وکیل صفائی“ کی بات تو سنی ہی نہ جائے۔ خواہ وہ کتنی ثقت، قابل اعتماد اور قابل احترام شخصیت ہو، اور دوسری طرف ”مدعی“ کی بات کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیا جائے، خواہ وہ کتنا ہی جموٹا اور افتراء پر داز ہو؟ قاضی ابوبکر بن عربیؒ اور ابن تیمیہؒ (معاذ اللہ) حضرت علیؑ کے دشمن نہیں، صرف حضرت معاویہؓ کے ثقت دوست ہیں۔ دوسری طرف ہشام بن الکلبی اور ابو مخنف حضرت معاویہؓ کے کھلے دشمن ہیں۔ اور ان کی افتراء پر دازی کا قابل تردید دلائل کے ساتھ ثابت ہے، یہ آخر غیر جانبداری کا کون سا تقاضا ہے کہ پہلے فریق کی روایات سے صرف ان کے ”حب معاویہؓ“ کی وجہ سے یکسر پرہیز کیا جائے اور دوسرے فریق کی روایات پر ان کے ”بغض معاویہؓ“ کے باوجود کوئی تنقید ہی نہ کی جائے؟

مولانا مودودی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

۱۔ میزان الاعتدال ص ۳۳۳ ج ۲ ولسان المیزان ص ۲۵۳ ج ۴

۲۔ مقعب بن زہیر کو اگرچہ امام ابو زرہؒ نے ثقت قرار دیا ہے مگر اس کے بارے میں ابو حاتم رازیؒ فرماتے ہیں شیخ لیس۔ مشہور (المرح و التمدیل ص ۳۵۵ ج ۲ قسم ۱) اور فضیل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ مجہول روی عمر جل من روک الحلیث (ص ۷۲ ج ۳ قسم ۲)

۳۔ خلافت و طوکیٹ: ص ۳۲۰

”بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو ائمہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے..... یہ باتیں کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لئے اختیار کئے ہیں..... الخ

پھر آگے لکھتے ہیں۔

”اس لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ابن سعد، ابن عبد البر، ابن کثیر، ابن جریر، ابن حجر اور ان جیسے دوسرے ثقہ علماء نے اپنی کتابوں میں جو حالات مجروح راویوں سے نقل کئے ہیں انہیں رد کر دیا جائے۔ الخ“ (ص ۳۱۷ تا ۳۱۹)

یہاں سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاریخی روایات میں سند کی جانچ پڑتال کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور جو روایتیں ان مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کر دی ہیں، انہیں بس آنکھ بند کر کے قبول ہی کر لینا چاہیے، تو آخر ان حضرات نے تقریباً ہر روایت کے شروع میں سند کو نقل کرنے کی زحمت ہی کیوں اٹھائی؟ کیا اس طرز عمل کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روایات کی صحت و سقم کی ذمہ داری اپنے قارئین اور محققین پر ڈال رہے ہیں کہ مواد ہم نے جمع کر دیا، اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھو اور اہم نتائج اخذ کرنے کے لئے صرف ان روایات پر بھروسہ کرو جو تحقیق و تنقید کے معیار پر پوری اترتی ہوں۔ ورنہ اگر تاریخی روایات کے معاملے میں ”اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جانے“ کی ممانعت کر دی جائے، تو خدا را مولانا مودودی صاحب یہ بتلائیں کہ ابن

سے پھر یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ ابو مخنف، کلبی اور ہشام جیسے لوگوں کے حالات دیکھنے کے لئے تو مولانا اسماء الرجال کی کتابیں کھولنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں اور دوسرے مورخین کو قابل اعتماد ثابت کرنے کے لئے ص ۳۰۹ سے ۳۲۰ تک وہ بلا تکلف اسماء الرجال ہی کے علماء اور کتابوں کے حوالے دیتے چلے گئے ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر رہے ہیں کہ کیا جرح و تعدیل صرف ان مورخین ہی کے بارے میں کی جاسکتی ہے جن کی کتابیں اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں اور ان سے بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

جریرؓ نے جو یہ نقل کیا ہے کہ حضرت واؤد علیہ السلام (معاذ اللہ) اور یا کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے اس لئے اسے متعدد خطرناک جنگی مہمات پر روانہ کر کے اسے مروادیا پھر اس کی بیوی سے شادی کر لی۔ اسے رد کر دینے کی آخر کیا وجہ ہے؟ نیز ابن جریرؓ نے جو اپنی تاریخ میں بے شمار متعارض احادیث نقل کی ہیں، ان میں ترجیح آخر کس بناء پر دی جاسکے گی۔

تطویل سے بچنے کے لئے ہم اس بحث کو یہاں چھوڑتے ہیں کہ حدیث اور تاریخ کے درمیان معیار صحت کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ ہم چونکہ یہاں خاص اس روایت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جس سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے برسرِ منبر حضرت علیؓ کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اس لئے مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ روایت کیوں ناقابل قبول ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ اور حدیث کے فرق کو ملحوظ رکھنے کے باوجود مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر مولانا کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ روایت قطعی طور پر ناقابل اعتماد ہے :

- ۱۔ اس کے راوی سارے کے سارے شیعہ ہیں، اور کسی روایت سے جو صرف شیعوں سے منقول ہو حضرت معاویہؓ پر طعن کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔
- ۲۔ اس کے تمام راوی ضعیف یا مجہول ہیں، اور ایسی روایت تاریخ کے عام واقعات کے معاملے میں تو کسی درجہ میں شاید قابل قبول ہو سکتی ہو، لیکن اس کے ذریعے کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہو سکتی جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو۔

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ

اوپر کے مورخین کے حالات کی چھان بین نہیں کرنی چاہئے؟ یا اساء الرجال کی کتابوں میں سے مورخین کی، صرف تبدیل ہی نقل کی جاسکتی ہے اور ”جرح“ نقل کرنا ممنوع ہے؟ یا صرف ان مورخین کے حالات اساء الرجال کی کتابوں میں دیکھنے چاہئیں جو ثقہ ہیں اور مجروح مورخین کے حالات کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع نہ کرنا چاہئے؟ ان میں سے کون سی بات ہے جسے صحیح کہا جائے؟

۳۔ مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے: ”بعض حضرات اس معاملے میں یہ نزاع قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر“

۳۔ یہ روایت درایت کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی اس لئے کہ اگر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت معاویہؓ کے حکم سے سات سال سے زائد مدت تک منبروں پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر ”سب و شتم کی بوچھاڑ“ کرتے رہے تو :

(الف) اس ”سب و شتم“ کی روایت کرنے والے تو بے شمار ہونے چاہئیں۔ یہ صرف ایک شخص ہی اس کی روایت کیوں کر رہا ہے؟ اور ایک بھی وہ جو شیعہ ہے اور اس کا جھوٹا ہونا معروف ہے؟

(ب) کیا پوری امت اسلامیہ اپنے ”خیر القرون“ میں ایسے اہل جرأت اور اہل انصاف سے قطعی طور پر خالی ہو گئی تھی جو اس ”مکرہ بدعت“ سے حضرت معاویہؓ اور ان کے گورنروں کو روکتے، کیا حضرت حجر بن عدیؓ کے علاوہ کوئی با غیرت مسلمان کوفہ میں موجود نہیں تھا؟

(ج) عدالت و دیانت کا معاملہ تو بہت بلند ہے۔ حضرت معاویہؓ کے عقل و تدبیر اور سیاسی بصیرت سے تو ان کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں ہو گا، کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان جیسا صاحب فرست انسان محض بغض کے جذبات میں ہمہ کرا ایک ایسا بے فائدہ اندام کرے جو اس کی حکومت کے استحکام کے لئے خطرہ بن سکتا ہے؟ کوفہ حضرت علیؓ کے معتقدین کا مرکز

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ

کہ ہم صحابہ کرامؓ کے بارے میں صرف وہی روایات قبول کریں گے جو ان کی سالانہ کے مطابق ہو اور ہر اس بات کو رد کریں گے جس سے ان پر حرف آتا ہو خواہ وہ کسی صحیح حدیث ہی میں وارد ہوئی ہو“ (ص ۳۰۵) ہمیں معلوم نہیں کہ مولانا کے معترضین میں سے کسی نے یہ ”قاعدہ کلیہ“ بیان کیا بھی ہے یا نہیں، بہر حال ہم اس قاعدہ کلیہ کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ درست مانتے ہیں۔ ہماری نظر میں قاعدہ یہ ہے کہ ”ہر اس ضعیف روایت کو رد کر دیا جائے گا جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو، خواہ وہ روایت تاریخ کی ہو۔ یا حدیث کی“ ہمارا خیال ہے کہ مولانا کو اس ”قاعدہ کلیہ“ پر کوئی اشکال نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ بقول حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ صحابہؓ کی عدالت قرآن و سنت متواترہ اور اجتماع سے ثابت ہے اور اس کے خلاف کوئی بات ضعیف روایات کے بل پر ثابت نہیں کی جاسکتی۔

تھا۔ کیا حضرت معاویہؓ ان کے سامنے حضرت علیؓ پر سب و شتم کروا کر یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد بھی اہل کوفہ سے برابر لڑائی ٹھنی رہے اور وہ کبھی دل سے حضرت معاویہؓ کے ساتھ نہ ہوں؟ کوئی گھٹیا سے گھٹیا سیاست دان بھی کبھی یہ نہیں کر سکتا کہ اپنے مخالف قائد کے مرنے کے بعد اس قائد کے معتقدین کے گڑھ میں بلاوجہ اسے گالیاں دیا کرے۔ ایسا کام وہی شخص کر سکتا ہے جسے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنی حکومت کے خلاف بھڑکانے کا شوق ہو۔

ان وجوہ کی بناء پر یہ روایت تو قطعی طور پر ناقابل قبول ہے۔ دوسری روایت جس کا حوالہ مولانا نے دیا ہے البدایہ والنہایہ کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

”ولما كان (مروان) متوليا على المدينة لمعاوية كان يسب عليا كل جمعة على المنبر، وقال له الحسن بن علي: لقد لعن الله اباك الحكم وانما هي صلبه على لسان نبيه فقال لعن الله الحكم وما ولدوا لئلا علم“

”جب مروان مدینہ منورہ میں حضرت معاویہؓ کا گورنر تھا اس وقت وہ ہر جمعہ کو منبر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر سب و شتم کیا کرتا تھا اور اس سے حضرت حسن بن علیؓ نے فرمایا کہ: تیرے باپ حکم پر اللہ نے اپنے نبیؐ کی زبان سے اس وقت لعنت کی تھی جب تو اس کی صلب میں تھا اور یہ کہا تھا کہ حکم اور اس کی اولاد پر خدا کی لعنت ہو۔“

لے جناب مولانا موودوی صاحب تو اس قسم کے درایتی قرائن کی بناء پر بالکل صحیح الاسناد احادیث کو بھی رد کر دینے کے قائل ہیں چنانچہ حضرت سلیمانؓ کے بارے میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کو صحیح الاسناد ماننے کے باوجود مولانا نے اس لئے رد کر دیا ہے کہ وہ درایت کے اس جیسے قرائن کے خلاف ہے، حالانکہ وہ حدیث بھی کوئی ”احکامی حدیث“ نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہی ہے، کیا اس موقع پر وہ درایت کے ان قرائن کی بناء پر ایک سراسر ضعیف روایت کو رد نہیں فرمائیں گے؟

اگرچہ یہ روایت کئی وجہ سے مشکوک ہے، لیکن اتنی بات کچھ اور روایتوں سے بھی مجموعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مروان بن الحکم مدینہ منورہ کی گورنری کے دوران حضرت علیؓ کی شان میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا جو حضرت علیؓ کو محبوب رکھنے والوں کو ناگوار گذرتے تھے لیکن یہ نازیبا الفاظ کیا تھے؟ ان تاریخی روایتوں میں سے کسی میں ان کا ذکر نہیں البتہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ایک واقعہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ :

”ان رجلاً جاء الى سهل بن سعد فقال هذا فلان لامير المدينة يدعو عليا عننا المنبر قال فيقول ماذا قال يقول له ابو تراب فضحك وقال والله ما سماه الا النبي صلى الله عليه وسلم وما كان له اسم احب اليه منه“

”ایک شخص حضرت سلؓ کے پاس آیا اور بولا کہ امیر مدینہ منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ کو سب و شتم کرتا ہے، حضرت سلؓ نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا کہ انہیں ”ابو تراب“ کہتا ہے۔ حضرت سلؓ ہنس پڑے اور فرمایا خدا کی قسم اس نام سے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پکارا ہے اور آپ کے نزدیک ان کا اس سے پیارا نام کوئی نہ تھا۔“

اگر یہاں ”امیر مدینہ“ سے مراد مروان ہی ہے، جیسا کہ ظاہر یہی ہے تو اس ”سب و شتم“ کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ابو تراب کے معنی ہیں ”مٹی کا باپ“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو محبت میں اس نام سے پکارا کرتے تھے، مروان زیادہ سے زیادہ اسے اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہو گا۔ اگر فرض کیجئے کہ مروان اس سے بھی زیادہ کچھ نازیبا الفاظ حضرت علیؓ کی شان میں استعمال کرتا تھا تو آخر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ یہ کام حضرت معاویہؓ کے حکم سے کرتا تھا۔ مولانا نے البدایہ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے، اس

نے اول تو اس لئے کہ یہ پوری عبارت البدایہ و النہایہ کے اصل مصری نسخے میں موجود نہیں ہے دوسرے اس لئے کہ اس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو الفاظ منسوب کئے گئے ہیں وہ بہت مشکوک ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری کتاب النقب، باب مناقب علیؓ ص ۵۲۵ جلد اول اصح المطابع کراچی

میں بھی کہیں یہ مذکور نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے اسے اس کام کا حکم دیا تھا یا وہ اس کے اس فعل پر راضی تھے۔ ایسی صورت میں یہ الفاظ لکھنے کا کوئی جواز ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت معاویہؓ :

”خود“ اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت

علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔“

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ :

۱۔ خود حضرت معاویہؓ کی طرف سب و شتم کی جو نسبت مولانا نے کی ہے، اس کا تو کوئی ادنیٰ ثبوت بھی مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں، بلکہ کہیں نہیں ہے اور اس کے برعکس حضرت معاویہؓ سے حضرت علیؓ کی تعریف و توصیف کے جملے منقول ہیں۔
۲۔ اسی طرح تمام گورنر کا جو لفظ مولانا نے استعمال کیا ہے وہ بھی بالکل بلا دلیل ہے، مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں صرف دو گورنروں کا ذکر ہے۔

۳۔ ان دو گورنروں میں سے ایک یعنی مروان بن الحکم کے بارے میں مولانا کے دیئے ہوئے حوالے کے اندر یا اور کہیں یہ بات موجود نہیں ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے حضرت علیؓ پر سب و شتم کیا کرتا تھا۔

۴۔ سب و شتم کی بوچھاڑ کا لفظ بھی بلا دلیل ہے، اس لئے کہ مولانا کے دیئے ہوئے حوالے میں تو سب و شتم کے الفاظ منقول نہیں۔ صحیح بخاری کی روایت سے جو الفاظ معلوم ہوتے ہیں انہیں ”سب و شتم“ کہنے میں مان کر ہی کہا جاسکتا ہے۔

۵۔ دوسرے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں مولانا نے حوالہ صحیح دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس میں یہ تصریح ہے کہ وہ قاتلین عثمانؓ کے لئے بددعا کیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ روایت از اول تا آخر سارے کے سارے شیعہ راویوں سے مروی ہے اور روایت و روایت ہر اعتبار سے واجب الرد ہے۔

استلحاق زیاد

”ساتھون کی بالاتری کا خاتمہ“ کے عنوان کے تحت مولانا مودودی صاحب نے حضرت

معاویہؓ پر پانچواں اعتراض یہ کیا ہے کہ :

”زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی، زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں حضرت معاویہؓ کے والد جناب ابو سفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اسی سے وہ حاملہ ہوئی، حضرت ابو سفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ زیاد ان ہی کے نطفہ سے ہے، جوان ہو کر یہ شخص اعلیٰ درجے کا مدبر، منتظم فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہوا، حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں، ان کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زنا کاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد ان ہی کا والد الحرام ہے پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا مکروہ ہے، وہ تو ظاہر ہی ہے مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل ہے۔ کیوں کہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ ”بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا اور زانی کے لئے کنکر پھریں۔“ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس سے پرہیز فرمایا۔“ (ص ۱۷۵)

مولانا نے جس افسوسناک انداز سے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے اس پر کوئی تبصرہ سوائے اس کے میں کیا جاسکتا کہ اصل تواریخ کی عبارت نقل کر دی جائے۔ قارئین دونوں کا مقابلہ کر کے رد جو چاہیں فیصلہ کر لیں۔

مولانا نے اس واقعے کے لئے چار کتابوں کے حوالے دیئے۔ (الاستیعاب ج ۱ ص ۱۹۶، الاثمن ج ۳ ص ۲۲۱، ۲۲۰، البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۸ اور ابن خلدون ج ۳ ص ۷۸) ان میں سے البدایہ والنہایہ میں تو اس واقعے کے سلسلے میں کل سات ہی سطریں لکھی ہیں، جن سے واقعہ کی کوئی تفصیل ہی نہیں معلوم ہوتی، باقی تین کتابوں میں سے جس کتاب میں یہ واقعہ سب

سے زیادہ مرتب طریقے پر بیان کیا گیا وہ ابن خلدون کی تاریخ ہے جس کا حوالہ مولانا نے سب سے آخر میں دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

”سمیۃ جو زیاد کی ماں ہے حارث بن کلدہ طیب کی لونڈی تھی، اسی کے پاس اس سے حضرت ابو بکرؓ پیدا ہوئے پھر اس نے اس کی شادی اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے کر دی تھی، اور اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا (واقعہ یہ تھا کہ) ابو سفیان اپنے کسی کام سے طائف گئے ہوئے تھے، وہاں انہوں نے سمیۃ سے اس طرح کا نکاح کیا جس طرح کے نکاح جاہلیت میں رائج تھے، اور اس سے مباشرت کی، اسی مباشرت سے زیاد پیدا ہوا اور سمیۃ نے زیاد کو ابو سفیان سے منسوب کیا، خود ابو سفیان نے بھی اس نسب کا اقرار کر لیا تھا مگر خفیہ طور پر۔“

آگے لکھتے ہیں:

جب حضرت علیؓ شہید ہو گئے اور زیاد نے حضرت معاویہؓ سے صلح کر لی تو زیاد نے مصقلہ بن ہبیرۃ الشیبانی کو مامور کیا کہ وہ حضرت معاویہؓ کو ابو سفیان کے نسب کے بارے میں بتلائیں، اور حضرت معاویہؓ کی رائے یہ ہوئی کہ اسے استحقاق کے ذریعہ مائل کریں، چنانچہ انہوں نے ایسے گواہ طلب کئے جو اس بات سے واقف ہوں کہ زیاد کا نسب ابو سفیان سے لاحق ہو چکا ہے، چنانچہ بصرہ کے باشندوں میں سے کچھ لوگوں نے اس بات کی گواہی دی اور اکثر شیخان علیؓ اس بات کو برا سمجھتے تھے یہاں تک کہ ان کے بھائی حضرت ابو بکرؓ بھی،

کانت سمیۃ ام زیاد مولدۃ لحارث بن کلدہ الطیب، وولدت عنده ابابکرۃ ثم زوجها بموئلی له وولد ریانا وکان ابو سفیان قد نهب الی الطائف فی بعض حاجاته فاصابها بسوء من انکحت لجاهلیہ وولدت زیاداً ہذا ونسبته الی ابی سفیان واقرب لها یہ الا انہ کان بخفیۃ (تاریخ ابن خلدون ص ۱۳۳ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء)

ابولما قتل علیؓ وصالح زیاد معاویہؓ وضع مصقلۃ بن ہبیرۃ الشیبانی علی معاویہ لیمعرص بقیہ حاتیہ اگلے صفحے

مولانا کا دوسرا ماخذ کامل ابن اثیر ہے، علامہ ابن اثیر جزیریؒ نے شروع میں تو بس یہی لکھا ہے کہ حضرت ابو سفیانؓ نے جاہلیت میں حیت سے مباشرت کی تھی، پھر اس مباشرت کے بارے میں بھی بڑی داستان طرازیوں نقل کی ہیں۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ:

”اس کے علاوہ لے بھی بڑے قصوں نے رواج پایا جن کے ذکر سے کتاب طویل ہو جائے گی اس لئے ہم ان سے اعراض کرتے ہیں، اور جو لوگ حضرت معاویہؓ کو معذور قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کا استلحاق اس لئے کیا تھا کہ جاہلیت میں نکاح کی بہت سی قسمیں تھیں ان سب قسموں کو ذکر کرنے کی تو ضرورت نہیں، البتہ ان میں سے ایک قسم یہ تھی کہ کسی کسی عورت سے بہت سے لوگ مباشرت کرتے تھے، پھر جب وہ حاملہ ہو کر بچہ جنتی تو اس بچے کو جس کی طرف چاہتی منسوب کر دیتی تو وہ اس کا بیٹا قرار پا جاتا، جب اسلام آیا تو نکاح کا یہ طریقہ حرام ہو گیا، لیکن نکاح کے جاہلی طریقوں میں سے جس طریقے سے بھی کوئی بچہ کسی باپ کی طرف منسوب ہوا ہو، اسلام کے بعد بھی اس کو اس نسب پر برقرار رکھا گیا اور شجرت نسب کے معاملے میں کوئی تفریق نہیں کی گئی۔“

ابن خلدونؒ اور ابن اثیرؒ کے ان بیانات سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ حضرت ابو

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ

بنسب ابی سفیان ففعل، و رأی معاویة بن ستمیلة باستلحاقه التمس الشهادة بئنا کم من علم لم حوق نسبه بابی سفیان فشهد له رجال من اهل البصرة والحقة، وكان اکثر شبعة علی بن سکران ذلک و بنعمونه علی معاویة حتی اخوه ابو بکره (ابن خلدون ص ۱۵ ج ۳)

سے

و جری افاض ص بطول بدکرها الكتاب فاضربنا عنها ومن اعتر لمعاویة قال انما استلحق معاویة زیاد لان نکحة الجاهلیة كانت اوعا لا حاجة الی ذکر جمیعها وكان منها ان الجماعة یجامعون البعی فاذا حملت وولدت الحقت الولد بمن شاءت منهجه ینحقه، فلما جاء الاسلام حرم هذا النکاح لانه افرکل ولدکان بنسب الی اب من ای نکاح کان من نکحتهم علی نسبه ولم یفرق بین شیئی منها (کامل ابن اثیر ص ۱۷ ج ۳ طبع قدیم) اس کے بعد کی عبارت اور اس پر تبصرہ آگے آ رہا ہے۔

سفیانؓ نے طائف میں یمۃ سے زنا نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا نکاح کیا تھا جو جاہلیت میں جائز سمجھا جاتا تھا اسلام نے اسے ممنوع تو کر دیا مگر اس سے پیدا ہونے والی اولاد کو غیر ثابت النسب یا ولد الحرام قرار نہیں دیا، لیکن آگے چل کر ابن اثیر جزیریؒ نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ :

”حضرت معاویہؓ یہ سمجھے کہ یہ استساق جائز ہے، اور انہوں نے جاہلیت اور اسلام کے استساق میں فرق نہیں کیا۔ اور یہ فعل ناقابل قبول ہے۔ کیوں کہ اس فعل کے منکر ہونے پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور اسلام میں اس طرح کا استساق کسی نے نہیں کیا کہ اسے حجت قرار دیا جائے۔“

لیکن واقعات کی مجموعی تحقیق کرنے سے ابن اثیر جزیریؒ کا یہ اعتراض بھی بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ اگر حضرت ابو سفیانؓ نے جاہلی نوع کا ایک نکاح کرنے کے بعد زیاد کو اسلام سے مل لینا بیٹا قرار نہ دیا ہوتا اور وہ خود اسلام کے بعد اسے اپنا بیٹا بنانا چاہتے تب تو یہ اعتراض درست ہوتا کہ حضرت معاویہؓ نے جاہلیت اور اسلام کے استساق میں فرق نہیں کیا، یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابو سفیانؓ نے زمانہ جاہلیت ہی میں اپنے ساتھ زیاد کا استساق کر لیا تھا۔ البتہ عام لوگوں کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ابن خلدون صاف لکھتے ہیں کہ :

”وولدت زیاداً هذاً ونسبه الى ابى سفیان واقربا لها به الا انه كان
بخفية“

یمۃ کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس نے اسے ابو سفیانؓ سے منسوب کیا اور ابو سفیانؓ نے بھی اس نسب کا اقرار کیا، مگر خفیہ طور پر۔“

زیاد چوں کہ حضرت ابو سفیانؓ کے مسلمان ہونے سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا، اس لئے یہ استساق یقیناً اسلام سے پہلے ہوا تھا۔ البتہ اس کا اظہار لوگوں پر نہیں ہوا تھا۔ جب

ل ابن خلدون: ص ۳۳ ج ۳

۳۵ کیونکہ حضرت ابو سفیانؓ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے اور زیاد کی ولادت کے بارے میں چار قول ہیں۔ ہجرت سے پہلے، ہجرت کے سال، ۳۱ ہجرت کے سال، ۳۲ ہجرت کے سال اور ۳۳ ہجرت کے سال (استیعاب ص ۵۳۸ ج ۱)

حضرت معاویہؓ کے سامنے دس گواہوں نے (جن میں بعض جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے) اس بات کی گواہی دی کہ حضرت ابوسفیانؓ نے اپنے ساتھ زیاد کے نسب کا اقرار کیا تھا۔ تب حضرت معاویہؓ نے ان کے لئے اس نسب کا اعلان کیا، مشہور محدث حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”حضرت معاویہؓ نے ۴۳ھ میں ان (زیاد) کا استلحاق کیا، اور اس بات پر زیاد بن اسماء الحمزازی، مالک بن ربیعہ سلولی اور منذر بن زبیر نے شہادت دی تھی، یہ بات مدائنی نے اپنی مختلف سندوں سے روایت کی ہے اور گواہوں میں مندرجہ ذیل ناموں کا اضافہ کیا ہے، جو یہ بنت ابی سفیان، مسور بن قدامہ الباہلی، ابن ابی نصر الشقی، زید بن نفیل الازدی، شعبتہ بن العلقم المہازنی، بنو عمرو بن شیبان کا ایک شخص، اور بنو المصطلق کا ایک شخص، ان سب نے ابوسفیانؓ کے بارے میں گواہی دی کہ زیاد ان کا بیٹا ہے البتہ منذر نے گواہی یہ دی تھی کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ابوسفیانؓ نے یہ بات کہی تھی۔ پھر حضرت معاویہؓ نے خطبہ دیا اور زیاد کا استلحاق کر لیا۔ پھر زیاد بولے، اور انہوں نے کہا کہ جو کچھ ان گواہوں نے کہا ہے اگر وہ حق ہے تو الحمد للہ! اور اگر یہ غلط ہے تو میں نے اپنے اور اللہ کے درمیان ان لوگوں کو ذمہ دار بنا دیا ہے۔“

حافظ ابن حجرؒ نے دسویں گواہ کا نام نہیں لکھا ہے، بلکہ ”بنو المصطلق کا ایک شخص“ کہا ہے، ابو حنیفہ المدنی (متوفی ۲۸۲ھ) نے ان کا نام یزید لکھا ہے، اور ان کی گواہی اس طرح نقل کی ہے۔

”انه سمع اباسفیان يقول ان زیادا من نطفة اقرها في رحم امه
سمية فتم ادعاؤها ياها“

لے الاصابہ ص ۵۶۳ ج ۱، مکتبۃ التجار، الکبریٰ، القاہرہ ۱۳۵۸ھ ”زیاد بن ابیہ“
لے المدنی: الاخبار النوال: ص ۲۱۹، تحقیق عبدالمنعم عامر، الادارۃ العامۃ للثقافت، القاہرہ

میں نے ابو سفیانؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ زیاد اس نطفے سے ہے جو میں نے اس کی ماں سمیہ کے رحم میں ڈالا تھا، لہذا یہ ثابت ہو گیا کہ ابو سفیانؓ نے زیاد کے حق میں اپنا بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔“

جن گواہوں کے نام حافظ ابن حجرؒ نے مدائمی کے حوالے سے لکھے ہیں ان میں حضرت مالک بن ربیعہ سلولیؓ صحابہؓ میں سے ہیں اور بیعت رضوان میں شریک رہے ہیں۔ ان حالات میں ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کا جو استلحاق دس گواہوں کی گواہی پر مجمع عام میں کیا، اس میں شریعت کے کون سے مسلمہ قاعدے کی خلاف ورزی ہوئی، جبکہ ابن اثیر جزیریؒ کی تصریح کے مطابق جاہلی نکاح سے جاہلیت میں پیدا ہونے والی اولاد کو اسلام میں غیر طہارت النسب قرار نہیں دیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ:

”أما والله لقد علمت العرب اني كنت اعزها في الجاهلية وان الاسلام لم يزدني الا عزا وانى لم اتكثر بزياد من قلة ولم اتعزز به من ذلقة ولكن عرفت حقاله فوضعت موضعها“
”خدا کی قسم! تمام عرب جانتے ہیں کہ جاہلیت میں مجھے تمام عربوں سے زیادہ عزت حاصل تھی، اور ظاہر ہے کہ اسلام نے بھی میری عزت میں ہی اضافہ کیا ہے، لہذا نہ تو ایسا ہے کہ میری نظری قلیل ہو اور میں نے زیاد کے ذریعہ اس میں اضافہ کر لیا ہو، اور نہ کبھی میں ذلیل تھا کہ زیاد کی وجہ سے مجھے عزت مل گئی ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ میں نے اس کا حق سمجھا ہے اور اسے اس کے حقدار تک پہنچا دیا ہے۔“

کیا مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں حضرت معاویہؓ کے اس حلیفہ بیان کے بعد (جسے مولانا مودودی نے یقیناً ابن اثیر اور ابن خلدون کی تواریخ میں دیکھا ہو گا) یہ کہنے کی کوئی

۱۔ الاصابہ ص ۳۲۳ ج ۳

۲۔ ابن اثیر ص ۱۷۶ ج ۳ طبع قدیم، البری ص ۱۷۳ ج ۳ مطبعت الاستقامة بالقاهرة ۱۳۵۸ھ و ابن خلدون ص ۱۶ ج ۳ دار الکتاب البستانی بیروت ۱۹۵۷ء میں نے یہ مقولہ نقل کیا ہے البتہ ابن خلدون نے صرف خط کشیدہ جملہ لکھا ہے اور اس میں ”حق اللہ“ کے الفاظ ہیں۔

گنجائش باقی رہتی ہے کہ :

”زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ (ص : ۱۷۵)

یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جو حضرات حضرت معاویہؓ کے اس فعل پر اعتراض کر رہے تھے، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ زیاد تو زنا سے پیدا ہوا تھا اس لئے اس کا نسب حضرت ابوسفیانؓ سے لاحق نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بجائے ان کا اعتراض یہ تھا کہ حضرت ابوسفیانؓ نے سمیہ سے مباشرت ہی نہیں کی، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخالفت کا بڑا شہرہ ہے لیکن کسی بندۂ خدا نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کی وجہ اعتراض کیا تھی؟ حافظ ابن عبدالبر نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے :

لا والله ما علمت سمیةً اباسفیان قط

”نہیں خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں کہ سمیہ نے کبھی ابوسفیانؓ کو دیکھا بھی ہے۔“

اور عبدالرحمان بن الحکم نے اس موقع پر حضرت معاویہؓ کی جہو میں جو شعر کہے تھے، ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے۔

واشہد انہا حملت زیاداً وصخر من سحابة غیر دان
یعنی ”میں گواہی دیتا ہوں کہ سمیہ کے بطن میں زیاد کا استلحاق عمل اس حالت میں ہوا تھا کہ عجز (ابوسفیانؓ) سمیہ کے قریب بھی نہیں تھا۔“
اور ابن مفرغ نے کہا تھا۔

شہدت بان امکم مباشر اباسفیان واضعة القناع
”میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری ماں نے کبھی اوڑھنی اتار کر ابوسفیان کے ساتھ مباشرت ہی نہیں کی۔“

۱۔ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۵۵۰ ج ۱

۲۔ الاستیعاب ص ۵۵۲ ج ۱

۳۔ ایضاً ص ۵۵۱ ج ۱

اور وہ ابن عامر جنہیں ایک خاص وجہ سے اس استحقاق کو ناجائز قرار دینے کی سب سے زیادہ خواہش تھی، انہوں نے بھی ایک شخص کے سامنے بس اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ :

”لقد هممت ان آتی بقسامۃ من قریبش یحلفون ان اباسفیان لم یرسمیۃ“

”میرا ارادہ ہے کہ میں قریب کے بہت سے قسم کھانے والوں کو لاؤں جو اس بات پر قسم کھائیں کہ ابوسفیانؓ نے کبھی عیۃ کو دیکھا تک نہیں۔“

سوال یہ ہے کہ یہ تمام معترضین اس بات کو ثابت کرنے پر کیوں زور لگا رہے تھے کہ حضرت ابوسفیانؓ کبھی عیۃ کے قریب تک نہیں گئے، انہوں نے سیدھی بات یہ کیوں نہیں کہی کہ ابوسفیانؓ اگر عیۃ کے قریب گئے بھی ہوں تو یہ سراسر زنا تھا، اور زنا سے کوئی نسب ثابت نہیں ہوتا، یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ابوسفیانؓ نے عیۃ سے جاہلیت میں مبینہ مباشرت کی تھی تو پھر ان کو بھی زیادہ کے استحقاق میں کوئی اعتراض نہیں تھا، ان کو اعتراض صرف یہ تھا کہ ان کے علم کے مطابق ابوسفیانؓ عیۃ کے قریب تک نہیں گئے، اس لئے زیادہ کا استحقاق درست نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ علم حضرت معاویہؓ پر حجت نہیں ہو سکتا۔ حضرت معاویہؓ کے پاس دس قابل اعتماد شہادتیں اثبات پر گزر چکی تھیں ان کے مقابلے میں یہ حضرات ہزار بار نفی پر شہادت دیں تو شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہم پر تو اس واقعہ کی تمام تفصیلات پڑھنے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جذبہٴ احرام شریعت کا غیر معمولی تاثر قائم ہوا ہے۔ غور فرمائیے کہ حضرت معاویہؓ کی شرافت اور فضیلت کا معاملہ تو بہت بلند ہے، ایک معمولی آدمی کے نفس کے لئے بھی یہ بات کس قدر ناگوار ہوتی ہے کہ جس شخص کو کل تک ساری دنیا ولد الحرام اور غیر ثابت النسب کہتی اور سمجھتی آئی تھی آج اسے اپنا بھائی بنا لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی، سردار اور سردار زادے کیلئے یہ بات کس قدر شاق ہوگی؟ لیکن جب دس گواہوں کے بعد ایسے شخص کو اپنا بھائی قرار دینا ”حق اللہ“ بن جاتا ہے تو وہ اپنے تمام

جذبات کو ختم کر کے اور مخالفین کی کھڑی ہوئی صعوبتوں کو جھیل کر پکاراٹھتے ہیں کہ :
 عرفت حق اللہ فوضعتہ موضعه
 ”میں نے اللہ کے حق کو پہچان لیا۔ اس لئے اسے اس کے حقدار تک پہنچا
 دیا۔“^۱

یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے جن معترفین کو اصل واقعے کا علم ہو گیا انہوں نے اپنے اعتراضات سے رجوع کر لیا۔ حافظ ابن عبدالبرؒ ہی نے نقل کیا ہے کہ عبدالرحمن بن الحکم اور ابن مفرغ جنہوں نے اس واقعہ پر حضرت معاویہؓ کے حق میں جویہ اشعار کہے تھے حضرت معاویہؓ کے مذکورہ بالا ارشاد کے بعد انہوں نے بھی اپنے سابقہ رویہ پر شرمندگی ظاہر کی۔ نیز وہ ابن عامر جن کے بارے میں حافظ ابن جریرؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس استلحاق کی مخالفت کرنے کے لئے نفی پر گواہیاں جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا، طبری ہی کی تصریح کے مطابق وہ بھی بعد میں حضرت معاویہؓ سے معافی مانگنے آئے تھے اور حضرت معاویہؓ نے انہیں معاف کر دیا تھا۔^۲

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بھی شروع میں اس استلحاق کے خلاف تھیں۔ ابن خلدونؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ زیاد نے حضرت عائشہؓ کو ”زیاد بن ابی سفیان“ کے نام سے خط لکھا، مقصد یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ بھی جواب میں ”زیاد بن ابی سفیان“ لکھ دیں گی تو اسے اپنے استلحاق نسب کی سند مل جائے گی۔ لیکن حضرت عائشہؓ نے جواب میں یہ الفاظ لکھے کہ :

”من عائشة ام المومنین الی ابنہا زیاد“

”تمام مومنین کی ماں کی طرف سے اپنے بیٹے زیاد کے نام۔“^۳

لیکن بعد میں جب حقیقت حال سامنے آئی تو خود حضرت عائشہؓ نے زیاد کو ”زیاد بن ابی سفیان“ کے نام سے خط لکھا۔ حافظ ابن عساکرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مرہ قبیلے کے

^۱ ابن خلدون، ص ۱۶ ج ۳

^۲ الاستیعاب ص ۵۵۱ تا ۵۵۵ ج ۱ (تحت الاسابہ)

^۳ اللبری ص ۱۶۳ ج ۳

^۴ ابن خلدون، ص ۱۶ ج ۳

لوگ زیاد کے پاس حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کا سفارشی خط لے جانا چاہتے تھے۔ حضرت عبدالرحمنؓ زیاد کو ”ابن ابی سفیان“ لکھتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ اس لئے حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے حضرت عائشہؓ نے صاف یہ الفاظ لکھے کہ :

”من عائشقام المؤمنین الی زیاد بن ابی سفیان“

”ام المؤمنین عائشہؓ کی طرف سے ابو سفیان کے بیٹے زیاد کے نام“ لے

جب زیاد کے پاس یہ خط پہنچا تو اس نے خوش ہو کر یہ خط مجمع عام میں سنایا۔

ان حالات میں ہمیں یہ توقع رکھنا ہے محل نہیں کہ مولانا موودوی صاحب بھی مجموعی صورتحال سے واقف ہونے کے بعد اپنے اس اعتراض سے رجوع کر لیں گے، اور انہوں نے اس معاملے میں عام معترضین سے زیادہ جو سخت اور مکروہ اسلوب بیان اختیار فرمایا ہے اس پر ندامت کا اظہار فرمائیں گے.....؟

گورنروں کی زیادتیاں

حضرت معاویہؓ پر چھٹا اعتراض مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ :
”حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی
زیادتوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار
کر دیا۔“ (ص ۱۷۵)

حضرت معاویہؓ کے بارے میں اس ”کتاب“ کا استنباط مولانا نے چھ واقعات سے کیا
ہے، پہلا واقعہ وہ یوں نقل فرماتے ہیں :

”ان کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک عربی بصرے میں منبر پر خطبہ
دے رہا تھا، ایک شخص نے دوران خطبہ میں اس کو کھلم کھلا ”اس پر
عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کرایا اور اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی
قانون کی رو سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے،
حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی
دیت تو بیت المال سے ادا کروں گا مگر میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی
سبیل نہیں۔“ (ص ۱۷۵، ۱۷۶)

مولانا نے یہاں بھی واقعے کے انتہائی اہم جزو کو حذف کر کے قصہ اس طرح بیان کیا
ہے کہ جس سے حضرت معاویہؓ کے بارے میں نہایت غلط اور خلاف واقعہ تاثر قائم ہوتا
ہے۔ مولانا نے اس واقعے کے لئے ابن کثیرؒ (ص ۸۷ ج ۸) اور ابن اثیرؒ کا حوالہ دیا ہے، یہاں
ہم ابن کثیرؒ کی پوری عبارت نقل کر دیتے ہیں۔ مولانا کی عبارت کا اس سے مقابلہ کر لیا جائے

”۱۳؎ سال میں حضرت معاویہؓ نے عبد اللہ بن غیلان کو بصرہ سے معزول کر کے اس کی جگہ عبید اللہ بن زیاد کو مقرر کیا۔ اور حضرت معاویہؓ نے ابن غیلان کو جو معزول فرمایا، اس کا سبب یہ تھا کہ ایک مرتبہ وہ خطبہ دے رہا تھا کہ بنو نہبہ کے کسی شخص نے اس کو کنکر مار دیا، اس نے اس شخص کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا اس کے بعد اس شخص کی قوم کے لوگ ابن غیلان کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ اگر امیر المومنین کو یہ معلوم ہو گیا کہ تم نے اس کا ہاتھ اس وجہ سے کاٹا تھا تو وہ اس کے اور اس کی قوم کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو حجر بن عدی کے ساتھ کیا تھا، اس لئے تم ہمیں ایک تحریر لکھ دو جس میں یہ تحریر ہو کہ تم نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شہ کی بنا پر کاٹا تھا ابن غیلان نے ان کو یہ تحریر لکھ دی، ان لوگوں نے کچھ عرصہ تک یہ تحریر اپنے پاس رکھی، پھر حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے اور شکایت کی کہ آپ کے گورنر نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شہ کی وجہ سے کاٹ دیا ہے، لہذا اس سے ہمیں قصاص دلوائیے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ میرے گورنروں سے قصاص کی تو کوئی سبیل نہیں لیکن ویت لے لو چنانچہ انہیں حضرت معاویہؓ نے ویت دلوائی اور ابن غیلان کو معزول کر دیا۔“

الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ بالکل یہی واقعہ علامہ ابن اثیر جزیریؒ نے بھی نقل کیا ہے، ہماری سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ جو شخص قصاص اور ویت کے شرعی قوانین سے واقف ہو، وہ اس واقعہ کو پڑھ کر حضرت معاویہؓ کے اس فیصلہ پر کوئی ادنیٰ اعتراض کس طرح

۱۳؎ نہ دخلت سنة خمس و خمسين فيها عزل معاوية* عبدالله بن غيلان عن البصرة وولى عنها عبدة بن زياد وكان سبب عزله* بنو ابن غيلان عن البصرة انه كان يحطب الناس فحصبه رجل من بني ضبة فامر بقطع يده فجاه قومها اليه فقالوا له: انه متى بلغ امير المؤمنين انك قطعت يده في هذا الصنع فعل به و يقوم نظير ما فعل بحجر بن عدى فاكتب لنا كتابا انك قطعت يده في شبهة فكتب لهم فتركوه عنهم حينئذ جاء ومعاوية* فقالوا له ان نائيك قطع يد صاحبنا في شبهة فاقفنا منه قال: لا سئل الي القوم من عمالي ولكن اليه فاعطاهم اليه وعزل ابن غيلان (البدائي ص ۱۷ ج ۸)

کر سکتا ہے؟

اس واقعہ میں صاف تصریح ہے کہ حضرت معاویہؓ کے سامنے بنو نضیر کے لوگوں نے ابن غیلان کے تحریری اقرار کے ساتھ مقدمے کی جو صورت پیش کی وہ یہ تھی کہ ابن غیلان نے ایک شخص کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دیا ہے۔

”شبہ میں ہاتھ کاٹ دینا“ اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے، قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص پر سزہ کا الزام ہو اور اس کے ثبوت میں کوئی ادنیٰ سا شبہ بھی پیش آجائے تو ہاتھ کاٹنے کی سزا موقوف ہو جاتی ہے اور شبہ کا فائدہ (Benefit of doubt) ملزم کو دیا جاتا ہے، اگر ایسی صورت میں کوئی حاکم غلطی سے ملزم پر سزا جاری کر کے ہاتھ کاٹ دے تو کہا جاتا ہے کہ ”اس نے شبہ میں ہاتھ کاٹ دیا ہے“

”شبہ میں ہاتھ کاٹ دینا“ بلاشبہ حاکم کی سنگین غلطی ہے، لیکن اس غلطی کی بناء پر کسی کے نزدیک بھی یہ حکم نہیں ہے کہ اس حاکم سے قصاص لینے کے لئے اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے۔ کیونکہ شبہ کا فائدہ اس کو بھی ملتا ہے۔

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی حاکم غلطی سے کسی شخص پر شبہ میں سزا جاری کر دے تو حاکم سے قصاص نہیں لیا جاتا۔ اس کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر حاکموں کے ایسے فیصلوں کے وجہ سے ان پر حد جاری کی جایا کرے یا ان سے قصاص لیا جانے لگے تو اس اہم منصب کو کوئی قبول نہیں کریگا۔ کیونکہ انسان سے ہر وقت غلطی کا احتمال ہے۔ اس بات کو حضرت معاویہؓ نے ان الفاظ میں تعبیر فرمایا ہے کہ :

”میرے گورنروں سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں“

پھر چونکہ اس واقعہ سے ایک طرف اس شخص کو نقصان پہنچا تھا جس کا ہاتھ کاٹا گیا، اس لئے حضرت معاویہؓ نے اسے دست دلوادی اور دوسری طرف حاکم کی نااہلیت بھی ظاہر ہو گئی تھی، اس لئے اسے معزول کر دیا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ محض اس بناء پر ابن غیلان سے قصاص نہیں لے رہے تھے کہ وہ ان کے گورنر ہیں تو انہیں معزول کیوں فرمایا؟ اور معزول کرنے کے بعد تو وہ گورنر نہیں رہے تھے، پھر ان سے قصاص کیوں نہیں لیا؟

اس پر حیرت کا اظہار کیجئے یا افسوس کا کہ ابن اثیر اور ابن کثیر (جن کے حوالے سے

مولانا مودودی صاحب نے یہ واقعہ نقل کیا ہے (دونوں نے ابتداء ہی معزولی کے بیان سے کی ہے) اور غیر مبہم الفاظ میں بتلایا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے سامنے ملزم کے اقرار کے ساتھ مقدمہ کس طرح پیش ہوا تھا؟ مگر مولانا نہ تو معزولی کا ذکر کرتے ہیں اور نہ پیش ہونے والے مقدمے کی صحیح نوعیت کا۔ اور صرف حضرت معاویہؓ کا یہ جملہ نقل کر دیتے ہیں کہ :

”میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔“

اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ :

”حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دے دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار

کر دیا“

اس کے بعد دوسرا واقعہ مولانا نے طبری اور ابن اثیر کے حوالے سے یہ بیان فرمایا ہے کہ زیاد نے ایک مرتبہ بہت سے آدمیوں کے ہاتھ صرف اس جرم میں کاٹ دیئے تھے کہ انہوں نے خطبہ کے دوران اس پر تنگ باری کی تھی یہ واقعہ بلاشبہ اسی طرح طبری اور ابن اثیر میں موجود ہے لیکن اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو یہ زیاد کا ذاتی فعل تھا۔ حضرت معاویہؓ پر اس کا الزام اس لئے عائد نہیں ہو سکتا کہ کسی تاریخ میں یہ موجود نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی اور انہوں نے اس پر زیاد کو کوئی تنبیہ نہیں کی ہو سکتا ہے کہ انہیں اس کی اطلاع نہ ہوئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی طرح اطلاع پہنچی ہو جس طرح ابن غیلان کے مذکورہ بالا واقعے میں پہنچی تھی۔ اور یہ بھی مستبعد نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کو اس حرکت پر مناسب سرزنش کی ہو لہذا قطعیت کے ساتھ یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ :

”دربار خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا“ (خلافت و ملوکیت ص ۱۷۶)

تیسرا واقعہ مولانا نے حضرت بسر بن ارطاة کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبید اللہ بن عباسؓ کے دو بچوں کو قتل کر دیا، ہمدان میں بعض مسلمان عورتوں کو لوٹنڈیاں بنا لیا۔

جہاں تک بچوں کو قتل کرنے کا تعلق ہے اگر یہ روایت درست ہو تو یہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت کا نہیں بلکہ مشاجرات کے زمانہ کا قصہ ہے، جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہما کے لشکر باہم برسریا کرتے۔ اس دور کی جنگوں کے بیان میں اس قدر رنگ آمیزیوں کی گئی ہیں کہ حقیقت کا پتہ چلانا بہت دشوار ہے، ٹھیک اسی روایت میں جس سے مولانا نے استدلال کیا ہے علامہ طبریؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بسربن ارطاطہ کے مقابلے کے لئے حضرت علیؓ نے حضرت جاریہ بن قدامہؓ کو دو ہزار کا لشکر دے کر روانہ کیا۔ حضرت جاریہؓ نے نجران پہنچ کر پوری بستی کو آگ لگا دی اور حضرت عثمانؓ کے ساتھیوں میں سے بہت سے افراد کو پکڑ کر قتل کر ڈالا، پھر جاریہؓ مدینہ طیبہ پہنچے، اس وقت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے، وہ انہیں دیکھ کر بیچ ہی میں بھاگ کھڑے ہوئے، جاریہؓ نے کہا۔

”واللہ لو اخذت ابا سنور لضررت عنقہ“

”خدا کی قسم اگر ملی والا (حضرت ابو ہریرہؓ) مجھے ہاتھ آگیا تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔“

(الطبری ص ۱۰۷ ج ۳ مطبوعہ الاستقانت، القاہرہ ۱۳۵۸ھ)

حضرت علیؓ نے انہیں بصرہ بھیجا، وہاں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے گورنر عبداللہ بن المخضری کو گھر میں محصور کر کے زندہ جلا دیا، لیکن ہم ان زیادتیوں سے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو بری سمجھتے ہیں، اور ان ناقابل اعتماد تاریخی روایات کی بناء پر ان حضرات میں سے کسی کو مورد الزام قرار دینا جائز نہیں سمجھتے کیوں کہ ان روایات کی صحت کا کچھ پتہ نہیں۔

انہی بسربن ارطاطہ کے بارے میں جنہیں مذکورہ روایات کی بناء پر مولانا مودودی نے ”عالم محض“ کا خطاب دے دیا ہے، خود حضرت علیؓ کی گواہی تو حافظ ابن کثیرؒ نے اس طرح نقل کی ہے کہ :

عن زہیر بن الارقم قال خطبنا علیؓ یوم جمعة فقال نبئت ان
بسر اقد طلع الیمن، وانی واللہ لا احسب ان هنولاء العوم
سیظہرون علیکم وما یظہرون علیکم الا بعصیانکم
امامکم و طاعتہم امامہم و خیانتکم وامانتہم و افسادکم فی
ارضکم و اصلاحہم“

لے الاستیعاب تحت الاصابہ، ص ۲۳۷ ج اول، ذکر ”جاریہ بن قدامہ“

”زہیر بن ارقمؓ کہتے ہیں کہ ایک جمعہ کو حضرت علیؓ نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ بسر (بن اوطاة) یمن پہنچ گئے ہیں اور خدا کی قسم میرا گمان یہ ہے کہ یہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے اور صرف اس بے باک پر غالب آئیں گے کہ تم اپنے امام کی نافرمانی کرتے ہو اور یہ لوگ اپنے امام کی اطاعت کرتے ہیں تم لوگ خیانت کرتے ہو اور یہ لوگ امین ہیں تم اپنی زمین میں فساد پھالتے ہو اور یہ اصلاح کرتے ہیں“^۱

یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجرؒ ”حافظ ابن حبان“ سے نقل کرتے ہیں کہ:

”وله اخبار شهيرة في الفتن لا ينبغي النشاعل بها“

”فتنہ کے دور میں ان کے (بسر کے) بہت قے مشہور ہیں جن میں مشغول ہونا نہیں چاہیے۔“^۲

اس کے علاوہ ان جنگوں میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے اپنے ماتحتوں کو یہ تاکید فرمائی تھی کہ وہ قتل و قتال میں حد ضرورت سے آگے نہ بڑھیں، حضرت علیؓ کا یہ ارشاد تو متعدد مقامات پر منقول ہے^۳ اور حضرت معاویہؓ کے بارے میں خود انہیں بسر بن اوطاة کا یہ مقولہ بہت سی تواریخ نے نقل کیا ہے کہ:

”يا اهل مدينة لولا ما عهد اللى معاوية ما نركت بها محتلما
الاقنلته“

”اے اہل مدینہ! اگر مجھ سے معاویہؓ نے عہد نہ لیا ہوتا تو میں اس شہر میں کسی بالغ انسان کو قتل کئے بغیر نہ چھوڑتا۔“^۴

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ نے تو انہیں ہر بالغ انسان کو قتل کرنے سے بھی منع کیا تھا، چہ جائیکہ چھوٹے بچوں کو قتل کرنے کی اجازت دیتے۔ لہذا حضرت علیؓ کے

^۱ البدایہ والنہایہ: ص ۳۲۵ ج ۷ مطبوعہ العادۃ

^۲ الاصابہ ص ۱۵۲ ج اول

^۳ مثال کے طور پر طبری ص ۵۰۶ ج ۳ ملاحظہ فرمائیے۔

^۴ الطبری ص ۱۰۶ ج ۳ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۱۶۶ ج ۱ ابن عساکر ص ۲۲۲ ج ۳

گورنریوں یا حضرت معاویہؓ کے اگر انہوں نے فی الواقع دوران جنگ کوئی زیادتی کی بھی ہو تو اس کی کوئی ذمہ داری حضرت علیؓ یا حضرت معاویہؓ پر عائد نہیں ہوتی۔ چنانچہ تواریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ فتنہ کا وقت گزر جانے کے بعد حضرت معاویہؓ نے ان زیادتیوں کی تلافی کر کے بسربن ارطاة کو گورنری سے معزول کر دیا۔ ۱

رہ گیا یہ قصہ کہ بسربن ارطاة نے ہمدان پر حملہ کر کے وہاں کی مسلمان عورتوں کو کنیز بنا لیا تھا، سو یہ بات الاستیعاب کے سوا کسی بھی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ حافظ ابن عساکرؒ جنہوں نے بسربن ارطاة کے حالات چھ صفحات میں ذکر کئے ہیں، ۲ اور ان میں بسربن سے متعلق تمام صحیح و سقیم روایات جمع کی ہیں، ۳ ہمدان پر ان کے حملے کا بھی ذکر کیا ہے انہوں نے بھی کہیں یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے مسلمان عورتوں کو کنیز بنا لیا تھا، یہ روایت صرف حافظ ابن عبد البر نے الاستیعاب میں نقل کی ہے اور اس کی سند بھی نہایت ضعیف ہے۔ بعض متکلم فیہ راویوں سے قطع نظر اس میں ایک راوی موسیٰ بن عبیدہ ہیں، جن کی محدثین نے تصنیف کی ہے امام احمدؒ کا ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ :

لَا تَحِلُّ الرِّوَايَةُ عَنْهُ عَنِ مَوْسَى بْنِ عَبِيدَةَ

”میرے نزدیک موسیٰ بن عبیدہ سے روایت کرنا حلال نہیں“ ۴

آپ اندازہ فرمائیے کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا کہ ”مسلمان عورتوں کو بازار میں کھڑا کر کے بیچا گیا، تو کیا اس واقعہ کو کسی ایک ہی شخص نے دیکھا تھا؟ یہ تو تاریخ کا ایسا منفرد سانحہ ہوتا کہ اس کی شہرت حد تو اترا تک پہنچ جانی چاہیے تھی۔ اور حضرت معاویہؓ سے بغض رکھنے والا گروہ جو پر کا تو بتانے بلکہ بسا اوقات بے پر کی اڑانے پر تلا ہوا تھا، تو اس واقعہ کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا؟ اس کے باوجود اس واقعے کی صرف ایک ہی روایت کیوں ہے؟ اور وہ بھی ضعیف اور مجروح جسے کسی مؤرخ نے بھی اپنی تاریخ میں درج کرنا مناسب

۱۔ دیکھئے ابن خلدونؒ ۳ ج ۹۸ ”بغث معاویہؓ العمل الی الامصار“

۲۔ ابن عساکرؒ ص ۲۲۰ تا ۲۲۵ ج ۳ ”بسربن ابی ارطاة“

۳۔ ابو حاتم الرازیؒ : المجرح والتعديل ص ۱۵۲ ج ۳ قسم اول

۴۔ الاستیعاب ص ۱۲۶ ج ۱

نہیں سمجھا؟ لہذا محض اس ضعیف اور منفرود روایت کی بناء پر صحابہ کرامؓ کی تاریخ پر اتنا بڑا داغ نہیں لگایا جاسکتا۔

چوتھا واقعہ مولانا نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

”سرکات کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا، اسی دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔

سب سے پہلا سر جو زمانہ اسلام میں کاٹ کر لے جایا گیا وہ حضرت عمار بن یاسرؓ کا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے اور ابن سعدؒ نے بھی طبقات میں اسے نقل کیا ہے کہ جنگ ینسین میں حضرت عمارؓ کا سر کاٹ کر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا۔

اور دو آدمی اس پر چلے آئے تھے کہ عمارؓ کو میں نے قتل کیا۔“

یہ روایت تو مولانا نے صحیح نقل کی ہے لیکن اگر یہ واقعہ درست ہو تو اس واقعے سے حضرت معاویہؓ پر الزام عائد کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس روایت میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمارؓ کا سر حضرت معاویہؓ کے پاس لے جایا گیا۔ یہ نہیں بتلایا کہ حضرت معاویہؓ نے اس فعل پر کیا اثر لیا؟ بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ امام ابن سعدؒ ہی نے طبقات میں یہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت علیؓ کے ایک شخص عمیر بن جرموز نے قتل کیا اور ان کا سر تن سے جدا کر کے حضرت علیؓ کے پاس لے گیا۔“

ہماری گزارش یہ ہے کہ ان دونوں قصوں میں کوئی الزام حضرت علیؓ یا حضرت معاویہؓ پر اس لئے عائد نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی نے نہ اس بات کا حکم دیا تھا کہ فلاں کا سر کاٹ کر ہمارے پاس لایا جائے، نہ انہوں نے اس فعل کی توثیق کی تھی، بلکہ یقیناً انہوں نے اس فعل کو برا قرار دے کر ایسا کرنے والے کو تنبیہ کی ہوگی۔ حضرت علیؓ کے بارے میں تو اسی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ انہوں نے حضرت زبیرؓ کی شہادت پر افسوس کا اظہار

فرمایا، حضرت معاویہؓ کے قصے میں راوی نے ایسی کوئی بات ذکر نہیں کی، اگر راوی نے کسی وجہ سے تنبیہ کا ذکر نہیں کیا تو یہ ”عدم ذکر“ ہی تو ہے ”ذکر عدم“ تو نہیں کہ اس سے ان حضرات پر کوئی الزام لگایا جاسکے اور اس سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ ان حضرات نے اپنے ماتحتوں کو شرعی حدود پامال کرنے کی چھٹی دی رکھی تھی۔
آگے مولانا لکھتے ہیں۔

”دوسرا سرعروین الممن کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے تھے، مگر حضرت عثمانؓ کے قتل میں انہوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ زیاد کی ولایت عراق کے زمانے میں ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے، وہاں ایک سانپ نے ان کو کاٹ لیا اور وہ مر گئے تعاقب کرنے والے ان کی مردہ لاش کا سراٹھ کر زیاد کے پاس لے گئے اس نے حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق بھیج دیا وہاں اسے بر سرعام گشت کرایا گیا اور پھر لے جا کر ان کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا۔“

اس واقعے کے لئے مولانا نے چار کتابوں کے حوالے دیئے ہیں (طبقات ابن سعد، استیعاب، البدایہ و النہایہ اور تہذیب التہذیب لیکن اس واقعے کا قابل اعتراض حصہ (یعنی یہ کہ حضرت معاویہؓ نے عمرو بن الممن کے سر کو گشت کرایا) نہ طبقات میں ہے نہ استیعاب میں، نہ تہذیب میں، یہ صرف البدایہ میں نقل کیا گیا ہے اور وہ بھی بلا سند و حوالہ۔ البدایہ و النہایہ کا ماخذ عموماً طبریؒ کی تاریخ ہوا کرتی ہے اور طبریؒ نے عمرو بن الممن کے قتل کا جو واقعہ ذکر کیا ہے اس میں اس داستان کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فتنے کے عروج کے دور میں بھی حضرت معاویہؓ نے عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور انتقام کے جذبات سے مغلوب نہیں ہوئے۔ امام ابن جریر طبریؒ ابو مخنف کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ عمرو بن الممن کو موصل کے عامل نے گرفتار کر لیا تھا اس کے بعد انہوں نے حضرت معاویہؓ سے خط لکھ کر معلوم کیا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ حضرت معاویہؓ نے جواب میں لکھا کہ :

”انہوں نے حضرت عثمان بن عفانؓ پر نیزے کے نو وار کئے تھے، ہم ان پر زیادتی کرنا نہیں چاہتے لہذا تم بھی ان پر نیزے کے نو وار کرو جس طرح انہوں نے حضرت عثمانؓ پر کئے

تھے!

اس روایت میں نہ سرکائے کا ذکر ہے نہ اسے حضرت معاویہؓ کے پاس لے جانے کا بیان ہے نہ اسے گشت کرانے کا قصہ ہے۔ اس کے بجائے حضرت معاویہؓ کا ایک ایسا حکم بیان کیا گیا ہے جو عدل و انصاف کے عین مطابق ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس روایت کا راوی بھی ابو مصنف ہے اور وہ شیعہ ہونے کے باوجود حضرت معاویہؓ کی کسی ایسی بات کا ذکر نہیں کرتا جس سے ان پر الزام عائد ہو سکے۔

اس کے مقابلے میں البدایہ والنہایہ کی روایت نہ سند کے ساتھ ہے، نہ اس کا کوئی حوالہ مذکور ہے نہ وہ حضرت معاویہؓ کے بردبارانہ مزاج سے کوئی مناسبت رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں آخر کس بنا پر طبری کی صاف اور سیدھی روایت کو چھوڑ کر اسے اختیار کیا جائے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے ایک بڑا زریں اصول یہ لکھا ہے کہ :

”جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں تو آخر ہم ان روایات کو کیوں نہ ترجیح دیں جو ان کے مجموعی طرز عمل سے مناسبت رکھتی ہیں اور خواہ مخواہ وہی روایت کیوں قبول کریں جو اس کی ضد نظر آتی ہیں؟“

(خلافت و مملکت ص ۳۳۸)

سوال یہ ہے کہ کیا اس اصول کا اطلاق حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر نہیں ہوتا؟ ان حالات میں مولانا مودودی صاحب کا یہ استنباط بڑا ہی سرسری اور جذباتی استنباط ہے کہ :

”یہ ساری کارروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے، اور سیاسی معاملات میں

۱۰

انہ طعن عثمان بن عفان نسع طعنات بمشاقص کائت معہ وانا لائمردان لختدی علیہ فاجلعه نسع طعنات کمطعن عثمان (اللمبری ۱۹۷۷ ج ۳)

شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں" (ص : ۱۷۷)

جن واقعات سے مولانا نے اس بات کا استنباط فرمایا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالا تر قرار دے دیا تھا، ان کی حقیقت تو آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ اپنے گورنروں کے جن خلاف شرع امور سے واقف ہو جاتے تھے ان پر انہیں مناسب تنبیہ فرمایا کرتے تھے، اس کے بھی بہت سے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں، یہاں ایک واقعہ پر اکتفا کیا جاتا ہے :-

"حافظ ابن عساکر نقل فرماتے ہیں کہ سعد بن سرح حضرت علیؓ کے حامیوں میں سے ایک صاحب تھے، جب حضرت معاویہؓ نے زیاد کو کوفہ میں گورنر بنایا تو اس نے سعد بن سرح کو دھمکیاں دیں، اس لئے یہ حضرت حسن بن علیؓ کے پاس جا کر پناہ گزیں ہو گئے، زیاد نے ان کے پیچھے ان کے بھائی اور ان کے بیوی بچوں کو پکڑ کر قید کر لیا۔ اور ان کے مال و دولت پر قبضہ کر کے ان کا گھر محاصرہ کر دیا۔ جب حضرت حسنؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے زیاد کے نام ایک خط لکھا کہ : "تم نے ایک مسلمان کا گھر محاصرہ کر کے اس کے مال و دولت اور بیوی بچوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ جب میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے تو تم فوراً ان کا گھر دوبارہ تعمیر کراؤ اور اس کے بیوی بچے اور مال و اسباب انہیں واپس کر دو۔ میں نے انہیں پناہ دی ہوئی ہے لہذا تم ان کے بارے میں میری سفارش قبول کرو۔"

اس خط کے جواب میں زیاد نے حضرت حسنؓ کے نام ایک خط لکھا جس میں حضرت حسنؓ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی، حضرت حسنؓ زیاد کا خط پڑھ کر مسکرائے اور حضرت معاویہؓ کے نام ایک خط لکھا جس میں انہیں پورے واقعے سے مطلع کیا، اور زیاد کا خط بھی ساتھ بھیج دیا۔ حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ :

"فلما وصل كتاب الحسن الى معاوية وقرأ معاوية الكتاب ضاقت به الشام"

"جب حضرت حسنؓ کا خط حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچا اور انہوں نے

خط پڑھا تو (رنج و ملال کی وجہ سے) شام کی زمین انہیں جھک معلوم ہونے لگی۔“
اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے زیاد کے نام سخت تہدید آمیز خط لکھا جس میں متعدد ملامتوں کے علاوہ یہ الفاظ بھی تھے کہ :

”تم نے حسنؓ کے نام خط میں ان کے والد کو برا بھلا کہا ہے اور کتنا یہ ان پر فسق کا الزام لگایا ہے، میری زندگی کی قسم! تم فسق کے خطاب کے ان سے زیادہ مستحق ہو، جس باپ کی طرف تم پہلے منسوب تھے وہ حسنؓ کے والد سے زیادہ اس خطاب کے مستحق تھے، جو نہی میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے تم فوراً سعد بن سرح کے عیال کو چھوڑ دو ان کا گھر تعمیر کراؤ، اس کے بعد ان سے کوئی تعرض نہ کرو اور ان کا مال لوٹا دو۔ میں نے حسنؓ کو لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے آدمی کو اختیار دیدیں کہ وہ چاہیں تو انہیں کے پاس رہیں اور چاہیں تو اپنے شہر میں لوٹ آئیں اور تمہارے ہاتھ یا زبان کو ان پر کوئی بالادستی حاصل نہیں ہوگی۔“

حضرت حجر بن عدیؓ کا قتل

یہ تو وہ اعتراضات تھے جو مولانا مودودی نے ”قانون کی بالائے ترسی کا خاتمہ“ کے عنوان کے تحت حضرت معاویہؓ پر عائد کئے تھے اس کے علاوہ ایک اعتراض مولانا نے ”آزادیِ اظہار رائے کا خاتمہ“ کے عنوان کے تحت اس طرح کیا ہے :

”دور طلوعت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور زبانیں بند کر دی گئیں اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو، ورنہ چپ رہو، اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زور دار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لئے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے ان کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔“

اس نئی پالیسی کی ابتداء حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں حضرت حجر بن عدی کے قتل (۵۱ھ) سے ہوئی جو ایک زاہد و عابد صحابی اور صلحاء امت میں ایک اونچے مرتبے کے شخص تھے۔ حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں جب منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ پر لعنت اور سب و شتم کا سلسلہ شروع ہوا تو عام مسلمانوں کے دل ہر جگہ ہی اس سے زخمی ہو رہے تھے۔ کوفہ میں حجر بن عدیؓ سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے جواب میں حضرت علیؓ کی تعریف اور حضرت معاویہؓ کی مذمت شروع کر دی، حضرت مغیرہ جب تک کوفہ کے گورنر رہے وہ ان کے ساتھ رعایت برتتے رہے۔ ان کے بعد جب زیاد کی گورنری میں بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی شامل ہو گیا تو اس کے اور ان کے درمیان کشمکش برپا ہو گئی، وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا

تھا اور یہ اٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے اسی دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے نماز جمعہ میں تاخیر پر بھی اس کو ٹوکا۔ آخر کار اس نے انہیں اور ان کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اس فرد جرم پر لیں کہ ”انہوں نے ایک جھٹا بنا لیا ہے، خلیفہ کو علانیہ گالیاں دیتے ہیں، امیر المومنین کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آل ابی طالب کے سوا کسی کے لئے درست نہیں ہے، انہوں نے شہر میں فساد برپا کیا اور امیر المومنین کے عامل کو نکال باہر کیا، یہ ابو تراب (حضرت علیؓ) کی حمایت کرتے ہیں، ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے مخالفین سے اظہار برأت کرتے ہیں۔“ ان گواہوں میں سے ایک کو ابی قاضی شرح کی بھی شہادت کی گئی مگر انہوں نے ایک الگ خط میں حضرت معاویہؓ کو لکھ بھیجا کہ ”میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس حجر بن عدی کے خلاف جو شہادتیں بھیجی گئی ہیں ان میں سے ایک میری شہادت بھی ہے۔ میری اصل شہادت حجر کے متعلق یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، دامنّاج اور عمرہ کرتے رہتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے اور بدی سے روکتے ہیں ان کا خون اور مال حرام ہے، آپ چاہیں تو انہیں قتل کریں ورنہ معاف کر دیں۔“

اس طرح یہ ملزم حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجے گئے اور انہوں نے ان کے قتل کا حکم دیدیا۔ قتل سے پہلے جلادوں نے ان کے سامنے جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ ”ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علیؓ سے برأت کا اظہار کرو اور ان پر لعنت بھیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائیگا۔“ ان لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور جبر نے کہا! ”میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا جو رب کو ناراض کرے“ آخر وہ اور ان کے ساتھی (سات) قتل کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک صاحب عبدالرحمان بن حسان کو حضرت معاویہؓ نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا، اور اس کو لکھا کہ انہیں بدترین طریقہ سے قتل کر، چنانچہ اس نے انہیں زندہ دفن کرادیا۔

اس واقعہ نے امت کے تمام صلحاء کا دل ہلادیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کو یہ خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہؓ کو اس فعل سے باز رکھنے کے لئے پہلے ہی خط لکھا تھا۔ بعد میں جب ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ ان سے ملنے آئے تو انہوں نے فرمایا ”اے معاویہؓ! تجھے حجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا ذرا خوف نہ ہوا۔“ حضرت معاویہؓ کے گورنر خراسان ربیع بن زیاد الحارثی نے جب یہ خبر سنی تو کہا : ”خدا یا اگر تیرے علم میں میرے اندر کچھ خیر باقی ہے تو مجھے دنیا سے اٹھالے۔“

(خلافت و ملوکیت - ص ۱۲۳ تا ۱۲۵)

اس واقعے میں بھی مولانا موودوی صاحب نے اول تو بعض باتیں ایسی کہی ہیں جن کا ثبوت کسی بھی تاریخ میں یہاں تک کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں بھی نہیں ہے۔ دوسرے یہاں بھی مولانا نے واقعے کے ضروری اجزاء کو سرے سے حذف کر کے بڑا ہی خلاف واقعہ تاثر قائم کیا ہے۔ مولانا موودوی صاحب کی پوری عبارت ہم نے من و عن نقل کر دی ہے، اب اصل واقعہ سنیں!

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت جبر بن عدی کون تھے؟ مولانا نے انہیں علی الاطلاق ”زاہد و عابد صحابی“ کہہ دیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کا صحابی ہونا مختلف فیہ ہے۔ اگرچہ بعض حضرات مثلاً ابن سعدؓ اور مصعب زبیریؓ کا کہنا تو یہی ہے کہ یہ صحابی تھے لیکن امام بخاریؒ ابن ابی حاتمؒ ابو حاتمؒ خلیفہ بن خیاطؒ اور ابن حبان رحمہم اللہ نے انہیں تابعین میں شمار کیا ہے۔ علامہ ابن سعد نے بھی ان کو ایک مقام پر صحابہ میں اور ایک مقام پر تابعین میں شمار کیا ہے اور ابو احمد عسکریؒ فرماتے ہیں کہ :

اکثر المحللین لا یصحون له صحبة ۳

۱۔ الاصابہ ص ۳۱۳ ج اول ۱، مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، القاہرہ ۱۳۵۸ھ

۲۔ طبقات ابن سعد ص ۲۱۷ ج ۶ جزو ۲۲

۳۔ البدایہ و النہایہ ص ۵۰ ج ۸ مطبعۃ السعادیۃ

اکثر محدثین ان کا صحابی ہونا صحیح نہیں قرار دیتے۔ یہ خود شیطان علیؓ میں سے تھے، اور بلاشبہ تمام تاریخی روایات ان کی بزرگی اور عبادت و زہد پر متفق ہیں، لیکن ان کے ساتھ کچھ غالی اور فتنہ پرداز قسم کے روافض لگ گئے تھے جو ان کی بزرگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر امت مسلمہ میں انتشار برپا کرنا چاہتے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔

”وقد النف علی حجر جماعات من شیعة علی یتولون امرہ و یشدون علی یدہ و یسبون معاویة و یتبراون منہ“

”حضرت حجرؓ کو شیطان علیؓ کی کچھ جماعتیں لپٹ گئی تھیں جو ان کے تمام امور کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور حضرت معاویہؓ کو برا بھلا کہتی تھیں“

تقریباً یہی بات علامہ ابن خلدونؒ نے بھی لکھی ہے۔ غالباً ان ہی لوگوں کے کان بھرنے کی وجہ سے ان کی طبیعت حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس قدر مکدر تھی کہ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہؓ سے صلح فرمائی تو یہ حضرت معاویہؓ کی امارت پر کسی طرح راضی نہیں تھے، تیسری صدی کے مشہور مورخ ابو حنیفہ الدینوریؒ اس صلح کا واقعہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں۔

”قالوا: وکان اول من لقی الحسن بن علی رضی اللہ عنہ فندعہ علی ما صنع ودعاه الی رد الحرب حجر ابن علی“ فقال لہ یا ابن رسول اللہ لو ددت انی مت قبل ما رأیت اخرجتہ من العذل الی الجور فترکنا الحق الذی کنا علیہ و دخلنا فی الباطل الذی نہرب منہ، واعطینا النبیة من انفسنا و قبلنا الخسیسة التی لم تلق بنا“

”مورخین کا کہنا ہے کہ (صلح کے بعد) حضرت حسن بن علیؓ کی ملاقات سب سے پہلے حجر بن عدیؓ سے ہوئی، انہوں نے حضرت حسنؓ کو ان کے

۱۔ الاخبار اللوال للدينوري ص ۲۲۳، القاہرہ ۱۹۶۰ء

۲۔ البدایہ النبییہ ص ۸ ج ۵۰

۳۔ ابن خلدون ص ۲۳ ج ۳، الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء

اس فضل پر شرم دلائی اور دعوت دی کہ حضرت معاویہؓ سے لڑائی دوبارہ شروع کر دیں، اور کہا کہ اے رسول اللہ کے بیٹے! کاش کہ میں یہ واقعہ دیکھنے سے پہلے مر جاتا، تم نے ہمیں انصاف سے نکال کر ظلم میں مبتلا کر دیا، ہم جس حق پر قائم تھے، ہم نے وہ چھوڑ دیا اور جس باطل سے بھاگ رہے تھے اس میں جا گھے، ہم نے خود ذلت اختیار کر لی اور اس پستی کو قبول کر لیا جو ہمارے لائق نہیں تھی۔“

اس کے بعد الدیوریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کو حجر بن عدیؓ کی یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے جواب میں اس صلح کے فوائد سے آگاہ فرمایا، لیکن حجر بن عدیؓ راضی نہ ہوئے اور حضرت حسینؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ :

ابا عبد اللہ شریتم النبل بالعز و قبلنم القلیل و ترکتم الکثیر
اطعنا الیوم و اعطینا الدھر، دع الحسن و ما رأی من هنا
الصلح و اجمع الیک شیعتک من اهل الکوفة و غیرها
و ولسی و صاحبی هذه المقیمة فلا یسعر ابن هند الا و نحن
نقارعه بالسیوف

”اے ابو عبد اللہ، تم نے عزت کے بدلے ذلت خرید لی، زیادہ کو چھوڑ کر کم کو قبول کر لیا، بس آج ہماری بات مان لو پھر عمر بھر نہ ماننا، حسنؓ کو ان کی صلح پر چھوڑ دو اور کوفہ وغیرہ کے باشندوں میں سے اپنے شیعہ (حامیوں) کو جمع کر لو اور یہ مقدمہ میرے اور میرے دوست کے سپرد کر دو، ہند کے بیٹے (حضرت معاویہؓ) کو ہمارا پتہ صرف اس وقت چلے گا جب ہم تم لوگوں سے اس کے خلاف جنگ کر رہے ہوں گے۔“

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں یہی جواب دیا کہ۔ انا قد بایعنا و عاہلنا، ولا سبیل الی نقض بیعتنا، ہم بیعت کر چکے، عہد ہو چکا، اب اسے توڑنے کی کوئی سبیل نہیں۔!

اس کے بعد یہ کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے، کوفہ اس وقت فتنہ پرداز قسم کے عالی سبائیوں کا مرکز بنا ہوا تھا جو یوں تو حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی محبت و مودت کا دعویٰ کرتے تھے لیکن ان کا اصل مقصد حضرت معاویہؓ کی حکومت کو ناکام بنانا تھا۔ حضرات حسینؓ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور اسے کسی قیمت پر توڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف حضرت معاویہؓ کا معاملہ بھی یہ تھا کہ بقول علامہ ابو حنیفہ الدنوریؒ :

”لم یر حسن ولا الحسین طول حیاة معاویة منه سواً فی
انفسهما ولا مکروها ولا قطع عنهما شیئاً مما کان شرط
لہما ولا تغیر لہما عن بر“

”حضرت معاویہؓ کی پوری زندگی میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ان کی طرف سے کوئی تکلیف اٹھانی نہیں پڑی، نہ انہوں نے ان کی طرف سے اپنے بارے میں کوئی بری بات دیکھی، حضرت معاویہؓ نے ان سے جو عہد کئے تھے ان میں سے کسی کی خلاف ورزی نہیں کی اور کبھی ان کے ساتھ حسن سلوک کے طرز کو نہ بدلا۔“

گویا اصل فریقین میں مکمل صلح ہو چکی تھی اور اب کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن ان لوگوں کے دل میں بغض معاویہؓ کی آگ برابر جگ رہی تھی اور یہ ہر ایسے موقع کی ٹانگ میں رہتے تھے جس میں حضرت معاویہؓ اور ان کی حکومت کے خلاف کوئی شورش کھڑی کی جاسکے اور چونکہ حضرات حسینؓ اس فتنہ پرداز میں ان کے ساتھ نہیں تھے، اس لئے یہ دل میں ان سے بھی خوش نہ تھے، یہاں تک ان میں سے ایک صاحب نے ایک موقع پر حضرت حسنؓ کو ان الفاظ میں خطاب کیا کہ :

”یا مثل المؤمنین“

”اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے“

چنانچہ جب حضرت حسنؓ کا انتقال ہوا تو انہوں نے کوفہ سے حضرت حسینؓ کو خط لکھا

کہ :

لے ایضاً ص ۲۲۵

”فان من قبلنا من شيعتك متطلعة انفسهم اليك“ لا بعدلون
بک احدا وقد كانوا عرفوا راي الحسن اخيک فی دفع
الحرب، و عرفوک باللين لاوليانک والغلظة علی اعدانک
والشدة فی امر اللہ فان کنت تحب ان تطلب هذا الامر فاقدم
الينا“ فقد وطننا انفسنا علی الموت معک“ ۱

”ہمارے یہاں جتنے آپ کے شیعہ (حاشی) ہیں ان سب کی نگاہیں آپ پر
لگی ہوئی ہیں، وہ آپ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، آپ کے بھائی حسنؓ نے
جنگ کو دفع کرنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی یہ لوگ اس سے واقف ہیں،
اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ اپنے دوستوں کے لئے نرم اور دشمنوں کے
لئے سخت ہیں، اور اللہ کے کام میں اٹل ہیں، لہذا اگر آپ اس
معاطلے (خلافت) کو طلب کرنا پسند کرتے ہوں تو ہمارے پاس آجائیے، اس
لئے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ مرنے کے لئے اپنی جانوں کو تیار کر چکے
ہیں۔“

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ بدستور اپنے عہد پر قائم رہے، ان کو اس انتشار
انگیزی سے روکا اور جواب میں حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہاں تک لکھا کہ :

”فلن يحدث الله به حدثا وانا حسی لله“

”جب تک میں زندہ ہوں اللہ ہرگز ان پر کوئی نئی آفت نہیں بھیجے گا“

اس قماش کے لوگ تھے جو کوفہ میں بقول حافظ ابن کثیر حضرت حجر بن عدیؓ کو چپنے
ہوئے تھے۔ حالات کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر اب زیر بحث واقعے کی طرف آئیے۔
مولانا نے اس واقعے کے لئے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ (طبری، استیعاب، ابن اشعر، البدایہ
والنہایہ، ابن خلدون) ہم یہاں ٹھیک انہی کتابوں سے نقل کر کے اس سے اصل واقعہ ذکر
کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ واقعہ کے جو ضروری اجزاء مولانا نے حذف کر دیئے ہیں
انہیں ہم بیان کر دیں گے، نیز جو باتیں مولانا نے ان کتابوں کی طرف غلط منسوب فرمائی ہیں

۱۔ الدجوری ص ۲۲۱

۲۔ ایضاً ص ۲۲۲

ان پر تنبیہ کر دیں گے۔
واقعہ یہ ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کا معمول ہی یہ بن گیا تھا کہ
بقول ابن جریرؒ وابن کثیرؒ

”انہم کانوا ینالون من عثمان و یطلقون فیہ مقالة الجور
وینقلون علی الامراء و یسارعون فی الانکار علیہم و
یبالغون فی ذلک و ینولون شیعة علی و ینشدون فی البین“
”یہ لوگ حضرت عثمانؓ کی بدگوئی کرتے تھے“ اور ان کے بارے میں ظالمانہ
باتیں کرتے تھے“ اور امراء پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے اور ان کی تردید کی
جگہ میں رہتے تھے۔ اور اس معاملے میں غلو کرتے تھے اور شیخان علیؓ کی
حمایت کرنے اور دین میں تشدد کرتے تھے“ لہ

ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اپنے
خطبہ میں حسب معمول حضرت عثمانؓ کے لئے رحم و مغفرت کی دعا فرمائی اور ان کے قاتلوں
کے حق میں بد دعا فرمائی۔^۱ اس پر حجر بن عدیؓ گھڑے ہو گئے اور حضرت مغیرہؓ کے خلاف
اس زور کا نعرہ لگایا کہ مسجد کے اندر اور باہر سب لوگوں نے سنا اور حضرت مغیرہؓ سے خطاب
کر کے کہا۔

”انک لاندری بمن تولع من ہر مک ایھا الانسان مولنا بارزاقنا
اعطیاتنا فانک قد حبستھا عنا و لیس ذلک لک و لم یکن
یطمع فی ذلک من کان قبلک و قد اصبح مولعا بدم
امیر المومنین و تقریظ المجرمین“

”اے انسان تجھے سٹھیا جانے کی وجہ سے یہ پتہ نہیں کہ تو کس سے عشق کا
انہار کر رہا ہے؟ ہماری تنخواہوں کی ادائیگی کا حکم جاری کر، کیونکہ وہ تو

لہ البدایہ النہایہ ص ۸ ج ۵۳

لہ یہی وہ بد دعا ہے جسے مولانا مودودی نے ”منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ پر لعنت اور سب
و شتم کا سلسلہ“ سے تعبیر فرمایا ہے اور جس کے بارے میں طبری کے الفاظ یہ ہیں کہ
و بدعو علی قتلته فقام حجر بن عدی فنصر نعرہ بالمرغیر قالیح (طبری ۱۸۸، ۱۸۹ ج ۳)

نے روک رکھی ہیں حالانکہ تجھے اس کا حق نہیں اور تجھ سے پہلے گورنروں نے کبھی ہماری تنخواہوں کی لالچ نہیں کی تھی اور تم امیر المومنین (حضرت علیؓ) کی مذمت اور مجرموں (حضرت عثمانؓ) کی مدح کرنے کے بڑے شوقین ہو۔“

لیکن اس پر حضرت مغیرہؓ نے انہیں کچھ نہیں کہا اور گھر تشریف لے گئے، لوگوں نے انہیں سمجھایا بھی کہ ایسے شخص کو تنبیہ کئے بغیر چھوڑنا مناسب نہیں، مگر حضرت مغیرہؓ نے فرمایا ”میں خطا کار سے درگزر کرنے والا ہوں۔“

حضرت مغیرہؓ کے بعد زیاد کوفہ کا بھی گورنر ہو گیا تو اس نے اپنے خطبے میں حضرت عثمانؓ کی تعریف کی اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجی۔ لے اس پر حجر حسب معمول کھڑے ہو گئے اور

لے اسی کو مولانا مودودی نے ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے کہ: ”وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے“ حالانکہ جتنے حوالے مولانا نے دیئے ہیں ان میں کبھی یہ موجود نہیں ہے کہ زیاد حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا: طبری کے الفاظ یہ ہیں:

ذکر عثمان واصحابه فقر ظہم و ذکر قتلہ و لعنہم فقام حجر... الخ

اس نے حضرت عثمانؓ اور ان کے اصحاب کا ذکر کر کے ان کی تعریف کی اور ان کے قاتلین کا ذکر کر کے ان پر لعنت بھیجی تو حجر کھڑے ہو گئے ”طبری ص ۱۹۰ ج ۳“ اور ابن اثیر کے الفاظ یہ ہیں:-
نرحم علی عثمان و ائسی علی اصحابہ بلعن قاتلہ فقام حجر... الخ ”اس نے حضرت عثمانؓ پر رحمت بھیجی اور ان کے اصحاب کی تعریف کی اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجی۔“ (ابن اثیر ص ۱۸۷ ج ۳ طبع قدیم)

اور حافظ ابن کثیر کے الفاظ ہیں: و ذکر فی اخرها فضل عثمان و ذم قتلہ و اذعان علی قتلہ فقام حجر“ خطبے کے آخر میں اس نے حضرت عثمانؓ کی فضیلت بیان کی اور ان کے قتل کرنے والوں اور قتل میں اعانت کرنے والوں کی مذمت کی تو حجر کھڑے ہو گئے (البدایہ ص ۵۰ ج ۸) اور ابن خلدون کے الفاظ یہ ہیں: و رحم علی عثمان و لعن قاتلہ و قال جراح اس نے حضرت عثمانؓ پر رحمت بھیجی اور ان کے قاتلوں پر لعنت اور حجر نے کہا الخ (ابن خلدون ص ۲۳-۳ ج ۳) اور ابن عبد البر نے تو اس خطبے کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان کے الفاظ سے مولانا مودودی صاحب نے یہ کہاں سے مستنبط کر لیا کہ ”وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا۔“

جو باتیں حضرت مغیرہؓ سے کہی تھیں وہی زیاد سے بھی کہیں، زیاد نے اس وقت انہیں کچھ نہ کہا۔

اس کے بعد امام ابن سعد کا بیان ہے کہ زیاد نے حضرت حجر بن عدیؓ کو تنہائی میں بلا کر ان سے کہا کہ :

”اپنی زبان اپنے قابو میں رکھیے اور اپنے گھر کو اپنے لئے کافی سمجھئے اور یہ میرا تخت حاضر ہے، یہ آپ کی نشست ہے، آپ کی تمام ضروریات میں پوری کروں گا، لہذا آپ اپنے معاملے میں مجھے مطمئن کر دیجئے اس لئے کہ آپ کی جلد بازی مجھے معلوم ہے، اے ابو عبد الرحمن! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، ان پست فطرت اور بے وقوف لوگوں سے بچئے، یہ لوگ کہیں آپ کو آپ کی رائے سے پھسلانہ دیں، لہذا اب اگر آپ کی قدر میری نگاہ میں کم ہوئی یا میں نے آپ کے حقوق میں کوتاہی کی تو یہ میری طرف سے ہرگز نہیں ہوگی۔“

حجر بن عدیؓ نے یہ بات سن کر کہا کہ ”میں سمجھ گیا“ پھر وہ اپنے گھر چلے گئے، وہاں ان سے ان کے شیعہ دوست آکر ملے اور پوچھا کہ ”میرے کیا کہا۔؟“ انہوں نے پوری گفتگو بتلا دی اس پر شیعہ ساتھیوں نے کہا کہ ”اُس نے آپ کی خیر خواہی کی بات نہیں کہی۔“

اس کے بعد حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ زیاد حضرت عمرو بن حرثؓ کو کوفہ میں اپنا نائب بنا کر بلصرہ جانے لگا تو اس نے حجر بن عدیؓ کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا، تاکہ پیچھے کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو لیکن حجر بن عدیؓ نے یہ عذر کر دیا کہ ”میں بیمار ہوں“ اس پر زیاد نے جل

لے یہاں تک کا واقعہ طبری، ابن اثیر، ابن کثیر اور ابن خلدون نے متفقہ طور پر بیان کیا ہے۔

امذک علیک لسانک و لیسعک منزاک و ہذا سریری فہو مجلسک و حوائجک مفصیلتی
فاکفنی نفسک فانی اعرف عجلتک فانشدک اللہ یا ایہا عبدالرحمن فی نفسک وایاک و ہذہ السفنۃ و
ہولاء السفہاء ان یسنزلوک عن رابک وانک لو ہنت علی او استخففت بحقک لہ انحصک بہنا من

نفسی (طبقات ابن سعد ص ۲۱۸ ج ۲۲ دار صادر بیروت)

تہ ایضاً والبدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸ مطبعہ العادۃ مصر

کر کہا کہ ”تم دین، قلب اور عقل ہر اعتبار سے بیمار ہو، خدا کی قسم! اگر تم نے کوئی ہنگامہ کیا تو میں تمہارے قتل کی کوشش کروں گا۔“^۱

امام ابن سعد لکھتے ہیں کہ جب زیاد بصرہ چلا گیا تو شیعہ صاحبان حجر بن عدیؓ کے پاس بکثرت آتے جاتے تھے، اور ان سے کہتے تھے کہ :

”انک شیخنا و احق الناس بانکار ہذا الامیر“

”آپ ہمارے شیخ ہیں، اور تمام لوگوں سے زیادہ اس بات کے حقدار ہیں کہ

اس معاہلے (خلافت معاویہؓ) کا انکار کریں۔“

حجر بن عدیؓ مسجد میں جاتے تو یہ لوگ بھی ان کے ساتھ جاتے۔ زیاد کے نائب حضرت عمرو بن حریشؓ نے جب یہ دیکھا تو ایک قاصد کے ذریعہ حجرؓ کو پیغام بھیجا کہ ”اے ابو عبدالرحمنؓ آپ تو امیر سے اپنے بارے میں عہد کر چکے ہیں، پھر یہ جماعت آپ کے ساتھ کیسی ہے؟“ حجرؓ نے جواب میں کہا بھیجا کہ جن چیزوں میں تم مبتلا ہو، تم ان کا انکار کرتے ہو، پیچھے ہٹو، تمہاری خیریت اسی میں ہے۔“^۲

اس پر حضرت عمرو بن حریشؓ نے زیاد کو لکھا کہ ”اگر تم کوفہ کو بچانے کی ضرورت سمجھتے ہو تو جلدی آ جاؤ۔“^۳

علامہ ابن جریر طبری وغیرہ فرماتے ہیں کہ زیاد کو یہ اطلاع ملی کہ حجر کے پاس شیعان علی جمع ہوتے ہیں اور حضرت معاویہؓ پر علی الاعلان لعنت کرتے اور ان سے برأت کا اظہار کرتے ہیں اور انہوں نے حضرت عمرو بن حریشؓ پر پتھر بھی برسائے ہیں۔^۴

۱۔ البدایہ والنہایہ، ص ۵۱ ج ۸

۲۔ پورا جملہ یہ ہے: تنکرون ما انتم علیہ الیکوراء ک اوسع لک۔ دوسرے جملہ کا مضمون یقینی طور سے میں نہیں سمجھ سکا۔

۳۔ طبقات ابن سعد ص ۲۱۸ ج ۸ ج ۲۲ و البدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

۴۔ الطبری ص ۱۹ ج ۳۔ ابن اثیر ص ۱۸۷ ج ۳۔ ابن خلدون ص ۲۳ ج ۳ البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸ پہلی تین کتابوں کے الفاظ یہ ہیں۔ فبلغنا من حجر ان اجتماع البیہ شیعة علی و تطہرون عن معاویة

والبراءة منهم و انهم حصوا عمرو بن حربت

امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ زیاد یہ اطلاع پا کر بڑی برق رفتاری سے کوفہ پہنچا، یہاں آکر اس نے مشہور صحابہ حضرت عدی بن حاتمؓ، حضرت جریر بن عبد اللہ الجلیؓ اور حضرت خالد بن عرفطہ الازدی رضی اللہ عنہم اور کوفہ کے بعض دوسرے شرفاء کو بلایا اور ان سے کہا کہ آپ جا کر حجر بن عدیؓ کو اتمام حجت کے طور پر سمجھائیں کہ وہ اس جماعت سے باز رہیں اور جو باتیں وہ کہتے رہتے ہیں ان سے اپنی زبان ٹکاؤ میں رکھیں۔ یہ حضرات ان کے پاس گئے مگر حجر بن عدیؓ نے نہ کسی سے بات کی، نہ کسی کی بات کا جواب دیا بلکہ ان کا ایک اونٹ گھر کے ایک کونے میں کھڑا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے اپنے غلام سے کہا کہ ”لو کے! اونٹ کو چارہ کھلاؤ۔“ جب انہوں نے ان حضرات کی بات اس طرح سنی ان سنی کر دی تو حضرت عدیؓ بن حاتم رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

”کیا تم دیکھتے ہو؟ میں تم سے بات کر رہا ہوں، اور تم کہتے ہو کہ لڑکے!

اونٹ کو چارہ کھلاؤ“

اس کے بعد حضرت عدی بن حاتمؓ نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کر کے فرمایا ”مجھے گمان بھی نہ تھا کہ یہ بے چارہ ضعف کے اس درجے کو پہنچ گیا ہو گا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس طرح یہ حضرات واپس آگئے اور زیاد کے پاس آکر حجر کی کچھ باتیں بتائیں اور کچھ چھپالیں، اور زیاد سے درخواست کی کہ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے، زیاد نے جواب میں کہا کہ ”اگر میں اب ان کے ساتھ نرمی کروں تو میں ابوسفیان کا بیٹا نہیں“۔ علامہ ابن جریر طبریؒ وغیرہ نے حضرت عدی بن حاتمؓ کا یہ واقعہ نقل نہیں کیا اس کے بجائے انہوں نے لکھا ہے کہ زیاد نے کوفہ میں ایک خطبہ دیا، غالباً یہ خطبہ حضرت عدی بن حاتمؓ کی واپسی کے بعد دیا ہو گا۔ بہر حال! ابن جریرؒ وغیرہ کے بیان کے مطابق زیاد جمعہ کے دن منبر پر پہنچا، اس وقت حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی حلقہ بنائے بیٹھے تھے، زیاد نے کہا :

”حمد و صلوة کے بعد یاد رکھو کہ ظلم اور بغاوت کا انجام بہت برا ہے۔ یہ لوگ (حجر اور ان کے ساتھی) جتھہ بنا کر بہت اتر آگئے ہیں۔ انہوں نے مجھے

۱ البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸

۲ طبقات ابن سعد ص ۲۱۸ و ۲۱۹ ج ۸ ج ۲۲ و البدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

اپنے حق میں بے ضرر پایا تو مجھ پر جری ہو گئے اور خدا کی قسم! اگر تم سیدھے نہ ہوئے تو میں تمہارا علاج اسی دوا سے کر دوں گا جو تمہارے لائق ہے، اور اگر میں کوفہ کی زمین کو حجر سے محفوظ نہ کر دوں اور اس کو آنے والوں کے لئے سامان عبرت نہ بنا دوں تو میں بھی کوئی چیز نہیں لے گا۔
حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس کے بعد زیاد نے خطبہ میں یہ بھی کہا کہ :

”ان من حق امیر المؤمنین یعنی کذا و کذا“

تم پر امیر المؤمنین کے فلاں اور فلاں حقوق ہیں۔“

اس پر حجر بن عدیؓ نے کنکریوں سے ایک مٹھی بھری اور زیاد پر دے ماری اور کہا کہ :

”کنیت! علیک لعنة الله“

تم پر خدا کی لعنت! تم نے جھوٹ کہا

اس پر زیاد منبر سے اتر ا اور نماز پڑھی۔

بعض راویوں نے اس خطبہ میں یہ قصہ ذکر کیا ہے کہ جب زیاد کا خطبہ طویل ہو گیا اور نماز کو دیر ہونے لگی تو حجر بن عدیؓ نے مٹھی بھر کنکریاں زیاد پر دے ماریں تب زیاد منبر سے اتر ا اور نماز پڑھی۔

بہر کیف! اس خطبے میں حجر بن عدیؓ کے کنکریاں مارنے کی وجہ خواہ کچھ ہو، اسی خطبے کے بعد زیاد نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حجر بن عدیؓ کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ بھیجے، اس پر حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ ”حجر کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو“۔
اس مرحلے پر زیاد نے اپنے امیر شرطہ (پولیس سپرنٹنڈنٹ) شداد بن ابی شہم کو حکم دیا کہ حجر کو بلا کر لاؤ، حسین بن عبد اللہ ہمدانی کہتے ہیں کہ جس وقت زیاد کا یہ حکم آیا، میں شداد

سنة البری ص ۹۰ ج ۳ ابن اثیر ص ۱۸۷ ج ۳ البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸ الفاظ یہ ہیں:

اما بعد فان غلب البغی والغی وخیم ان هولاء جموا فاشروا وامنونی فاجتروا و اعلی و اہم اللہ ان لم نستقیمو الا وینکم بلونکم و قال ما انا بشیئی ان لم امنع باحة الکوفة من حجو و ادعہ نکالا لمن

سنة البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸

بعده

سنة البری ص ۹۰ ج ۳۔ البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۵۵ ج ۱

کے پاس بیٹھا تھا۔ شدا نے مجھ سے کہا کہ تم جا کر حجر کو بلا لاؤ، میں نے حجر کے پاس جا کر کہا کہ ”میرا آپ کو بلاتے ہیں“ اس پر ان کے ساتھیوں نے کہا ”یہ اس کے پاس نہیں جائیں گے“ میں نے واپس آ کر شدا کو ان کا جواب سنایا تو اس نے میرے ساتھ کچھ اور آدمی بھیج دیئے ہم سب نے جا کر ان سے کہا کہ امیر کے پاس چلئے۔“

فسبونا و شتمونا

تو حجر کے ساتھیوں نے ہمیں گالیاں دیں اور برا بھلا کہا۔

جب صورت حال اس درجہ سنگین ہو گئی تو زیاد نے شرفاء کو فہم جمع کر کے ایک جو شلی تقریر کی اور کہا کہ ہر شخص اپنے اپنے رشتہ داروں کو حجر کی جماعت سے الگ کرنے کی کوشش کرے، اس کے بعد پھر امیر شرطہ شدا بن ابیہشم کو زیادہ آدمی دے کر بھیجا اور تاکید کی کہ اگر حجر تمہاری بات مان لیں تو انہیں لے آؤ، ورنہ ان سے لڑائی کرو، چنانچہ شدا نے تیسری بار جا کر حجر سے کہا کہ ”میرے پاس چلو“ مگر حجر کے ساتھیوں نے جواب میں کہا کہ ”ہم پلک جھپکنے کی دیر کے لئے بھی امیر کا یہ حکم نہیں مانیں گے“ لہٰذا اس پر فریقین میں لڑائیوں اور پتھروں سے سخت لڑائی ہوئی مگر زیاد کی پولیس حجر اور ان کے ساتھیوں پر غالب نہ آسکی اور وہ گرفتار نہ ہوئے۔

اس کے بعد حجر بن عدی جائے واردات سے فرار ہو کر کندہ کے محلے میں پہنچ گئے، کندہ میں سب حجر بن عدی کی قوم کے افراد آباد تھے، حجر کے ساتھیوں نے یہاں کے تمام لوگوں کو جنگ پر آمادہ کیا، حجر کا ایک ساتھی قیس بن عبدان ایک گدھے پر سوار ہو کر یہ اشعار پڑھتا پھر رہا تھا کہ :

یا قوم حجر دافعوا و صاولوا و عن اخیکم ساعة فقا تلوا
لا یلفین منکم لحجر خائل ایس فیکم رامج و نابل
وفارس مستلم و راجل و ضارب بالسيف لا یزائل

لہ البری ص ۱۹۱ ج ۳

لہ لا و لائمة عین لاجبہ (طبری ص ۱۹۱ ج ۳)

لہ طبری ص ۱۹۱ ج ۳، الہدایہ ص ۵۱ ج ۸، طبقات ابن سعد ص ۲۱۹ ج ۶، ابن کثیر کے الفاظ ہیں
فکان یسبھم قتال بالحجار فوالعصی فعجز واعنه اور ابن سعد فرماتے ہیں فقاتلھم بمن معہ

”اے حجر کی قوم! دفاع کرو اور آگے بڑھ کر حملے کرو، اور اسی وقت اپنے بھائی کی طرف سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تم میں کوئی شخص ایسا نہ ہو جو حجر کو بے یار و مددگار چھوڑ جائے، کیا تم میں کوئی تیر انداز اور نیزے کا دھنی نہیں؟ کیا تم میں کوئی جم کر بیٹھنے والا شہسوار نہیں؟ کیا تم میں کوئی ایسا تیغ زن نہیں جو ہٹنا نہ جانتا ہو؟“

زیاد نے کوفہ کے مختلف باشندوں کو کندہ پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیجا، یہاں بھی سخت جنگ ہوئی۔ مگر جبرین عدی فرار ہو کر روپوش ہو گئے۔ تب جب ان کو پکڑنے کی کوئی اور صورت نہ رہی تو زیاد نے محمد بن الاشعث کو بلا کر ان سے کہا کہ تم تین دن کے اندر حجر کو تلاش کر کے پہنچا دو، ورنہ تمہاری خیر نہیں، محمد بن الاشعث سواروں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کو تلاش کرتے رہے بالآخر حجر نے خود ہی اپنے آپ کو اس شرط پر حاضر ہونے کے لئے پیش کیا کہ ”مجھے امان دی جائے اور معاویہؓ کے پاس بھیج دیا جائے۔“ زیاد نے اس شرط کو منظور کر لیا تو حجر اس کے پاس پہنچے، زیاد نے انہیں دیکھ کر کہا:

”مرحبا! ابو عبدالرحمن! تم جنگ کے زمانے میں تو جنگ کرتے ہی تھے، اس

وقت بھی جنگ کرتے ہو جب سب لوگ صلح کر چکے ہیں۔“

اس کے جواب میں حجر نے کہا:

”میں نے اطاعت نہیں چھوڑی، اور نہ جماعت سے علیحدگی اختیار کی ہے

میں اب بھی اپنی بیعت پر قائم ہوں۔“

زیاد نے کہا:

”حجر: افسوس ہے کہ تم ایک ہاتھ سے زخم لگاتے ہو اور دوسرے

سے مرہم، تم یہ چاہتے ہو کہ جب اللہ نے ہمیں تم پر قابو دیا تو ہم تم

سے خوش ہو جائیں۔“

حجر نے کہا: ”کیا تم نے معاویہؓ کے پاس پہنچنے تک مجھے امن نہیں دیا؟“

زیاد نے کہا: ”کیوں نہیں ہم اپنے عہد پر قائم ہیں“

۱۔ اللبری ص ۱۹۳ ج ۳

۲۔ طبری نے ص ۱۹۳ سے ۱۹۶ تک اس لڑائی اور روپوشی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں

یہ کہہ کر زیاد نے انہیں قید خانہ بھیج دیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ”اگر مجھے امانت کا خیال نہ ہو تا تو یہ شخص جان بچا کر یہاں سے نہ جاسکتا۔“
اس طرح حجر بن عدیؓ تو گرفتار ہو گئے، لیکن ان کے دوسرے ساتھی جو اصل فتنے کا سبب تھے بدستور روپوش رہے۔ اس کے بعد زیاد نے کوفہ کے چار سرداروں حضرت عمرو بن حریثؓ، حضرت خالد بن عرفطہؓ، حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰؓ اور قیس بن الولید کو جمع کر کے ان سے کہا:

اشهدوا علی حجر بما راہتم منہ

”حجر کے بارے میں تم نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی گواہی دو“

ان چاروں حضرات نے جو گواہی دی، اس کے الفاظ طبریؒ نے اس طرح نقل کئے ہیں

”حجرؓ نے اپنے کردہ بدعت سے جتنے جمع کر لئے ہیں اور خلیفہ کو کھلم کھلا برا بھلا کہا ہے اور امیر المومنین کے خلاف جنگ کرنے کی دعوت دی ہے اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کا آل ابی طالب کے علاوہ کوئی مستحق نہیں، انہوں نے ہنگامہ برپا کر کے امیر المومنین کے گورنر کو نکال باہر کیا اور یہ ابو ترابؓ (حضرت علیؓ) کو معذور سمجھے اور ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے دشمن اور ان سے جنگ کرنے والوں سے براعت کا اظہار کرتے ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ ان کے ساتھیوں کے سرگروہ ہیں، اور ان ہی جیسی رائے رکھتے ہیں۔“

پھر زیاد نے چاہا کہ ان چار حضرات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس گواہی میں شریک ہوں، چنانچہ اس نے ان حضرات کی گواہی لکھ کر لوگوں کو جمع کیا، ان کو یہ گواہی پڑھ کر سنائی اور لوگوں کو دعوت دی کہ جو لوگ اس گواہی میں شریک ہونا چاہیں وہ اپنا نام لکھوادیں، چنانچہ لوگوں نے نام لکھوانے شروع کئے، یہاں تک کہ ستر افراد نے اپنے نام لکھوائے لیکن ان حجرا جمع الیہ الجموع و اظہر شتم الخلیفۃ و دعا الی حرب امیر المومنین و زعم ان ہذا الامر لا یصلح الا فی آل ابی طالب و وثب بالمصر و اخرج عامل امیر المومنین و اظہر عن ابی تراب و الترحم علیہ و البراء من عنوہ و اهل حریرہ و ان ہولاء النفر الذین معہم رنوس اصحابہ و علی مثل رباہ و امرہ۔

زیاد نے کہا کہ ان میں سے صرف وہ نام باقی رکھے جائیں جو اپنی دینداری اور حسب و نسب کے اعتبار سے معروف ہوں، چنانچہ چوالیس نام لکھے گئے اور باقی ساقط کر دیئے گئے۔^۱ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چوالیس گواہوں میں سے بعض حضرات کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

جن چار گواہوں نے ابتداءً گواہی دی ان میں سب سے پہلے تو حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ ہیں یہ باتفاق صحابہ میں سے ہیں۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر کیا تھی؟ بعض حضرات نے بارہ سال عمر بتائی ہے مگر ابو داؤد میں ان ہی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک مکان کی جگہ عطا فرمائی تھی۔ اس سے حافظ ابن حجر نے استدلال کیا ہے کہ یہ کبار صحابہ میں سے ہیں، انہوں نے بعض احادیث براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بعض حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ کبار صحابہ کے واسطے سے۔^۲

دوسرے حضرت خالد بن عرفطہ ازوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، یہ بھی مشہور صحابی ہیں، انہوں نے بھی براہ راست آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں، جنگ قادسیہ میں حضرت سعدؓ نے ان کو نائب سپہ سالار بنایا تھا، اور حضرت عمرؓ نے بذات خود حضرت سعدؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ ان کو امیر لشکر بنایا جائے، ایک مرتبہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ان کو کوفہ میں اپنا نائب بھی بنایا تھا۔^۳

تیسرے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے حضرت ابو بردہؓ ہیں جو صحابی تو نہیں، مگر جلیل القدر تابعی ہیں، اعلیٰ درجے کے فقہاء میں سے ہیں، اور بے شمار احادیث کے راوی ہیں، حضرت علیؓ کے شاگردوں میں سے ہیں، ان کے علاوہ بہت سے

۱۔ الطبری ص ۱۹۳ تا ۲۰۱ ج ۴

۲۔ طبقات ابن سعد ص ۲۳ ج ۶ جزو ۲۱ و تنزیب التنزیب ص ۷۸ ج ۸، دائرة المعارف دکن ۱۳۲۶ھ

والاصابہ ص ۵۲۳ ج ۲ و تجرید اسماء الصحابة لابن اثیر الجزری ص ۳۳۵ ج ۱، دائرة المعارف دکن

۱۳۱۵ھ

۳۔ ابن سعد ص ۲۱ ج ۶ جزو ۲۱ والاصابہ ص ۳۰۹ ج ۱ و تنزیب التنزیب ص ۱۰۶ ج ۳

جلیل القدر صحابہ سے بکثرت احادیث روایت کی ہیں، کوفہ کے قاضی بھی رہے ہیں، امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ کان ثقة کثیر الحدیث (ثقة ہیں اور بہت سی احادیث کے راوی ہیں) امام عجل فرماتے ہیں۔

کوفی تابعی ثقة ۱

چوتھے صاحب قیس بن الولید ہیں، ان کے حالات ہمیں کہیں نہ مل سکے۔ اس کے بعد جن ستر حضرات نے اپنے نام لکھوائے ان میں سے ایک حضرت وائل ابن حجر حضری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو معروف صحابہ میں سے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث روایت کی ہیں۔ ۲

دوسرے حضرت کثیر بن شہابؓ ہیں، ابن عساکر نے انہیں صحابی قرار دیا ہے، ابن عبد البر کہتے ہیں کہ ان کا صحابی ہونا مشکوک ہے، مگر حافظ ابن حجر نے راجح اسی کو قرار دیا ہے کہ یہ صحابی ہیں، اور حضرت عمرؓ نے انہیں کسی جگہ کا امیر بھی بنایا تھا۔ ۳

ان کے علاوہ ایک بزرگ حضرت موسیٰ بن طلحہؓ ہیں جو مشہور صحابی حضرت طلحہؓ کے صاحبزادے ہیں۔ اور بے شمار احادیث کے راوی ہیں۔ امام عجل فرماتے ہیں کہ ”تابعی ثقة و کان خیاراً“ اور حضرت مروء کا کہنا ہے کہ کوفی ثقة رجل صالح امام ابو حاتم فرماتے ہیں کہ انہیں حضرت طلحہؓ کے تمام صاحبزادوں میں محمد کے بعد سب سے افضل کہا جاتا ہے اور اپنے زمانے میں لوگ انہیں ہدایت یافتہ کہا کرتے تھے، ابن خراش کا کہنا ہے کہ ”جلیل القدر مسلمانوں میں سے ہیں“ کہ امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ ثقہ تھے اور بہت سی احادیث کے راوی۔ ۴

اسی طرح حضرت طلحہؓ کے ایک اور صاحبزادے حضرت اسحاق بن طلحہؓ نے بھی گواہوں میں اپنا نام لکھوایا تھا، یہ بھی راوی حدیث ہیں۔ اور ابن حبان نے انہیں ثقہ قرار

۱۔ تہذیب التہذیب ص ۱۸ ج ۱۲ و طبقات ابن سعد ص ۲۶۸ ج ۶ ج ۲۳

۲۔ الاصابہ ص ۵۹۲ ج ۳ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۶۰۵ ج ۳ ابن سعد ص ۳۶ ج ۶ ج ۲۱

۳۔ الاصابہ ص ۲۷۱ ج ۳ الاستیعاب ص ۳۰۳ ج ۳ ابن سعد ص ۱۳۹ ج ۶ ج ۲۲

۴۔ تہذیب التہذیب ص ۳۵۰ ج ۱۰۔ ابن سعد ص ۲۱۲ ج ۶ ج ۲۲

دیا ہے۔^۱

ان کے علاوہ دوسرے گواہوں کے حالات کی تحقیق کی ہم نے ضرورت نہیں سمجھی۔ یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ طبری ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان گواہیوں پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ زیاد نے مختار بن ابی عبید اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کے صاحبزادے عروہ کو بھی گواہی دینے کے لئے بلایا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا چنانچہ ان کا نام گواہوں میں نہ لکھا گیا۔^۲

غرض ان تمام گواہوں کی گواہی قلم بند کی گئی، اور گواہیوں کا یہ صحیفہ شرعی اصول کے مطابق حضرت وائل بن حجر اور حضرت کثیر بن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالے کیا گیا کہ وہ خود جا کر حضرت معاویہؓ کو پہنچائیں، حجر بن عدی اور ان کے بارہ ساتھی بھی ان ہی دو حضرات صحابہ کی تحویل میں دے دیئے گئے۔

اس کے ساتھ زیاد نے حضرت معاویہؓ کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

”اللہ نے امیر المومنین سے بڑی بلا دور کر کے احسان فرمایا ہے کہ آپ کے دشمنوں کو زیر کر دیا، ان ترابلی اور سہائی سرکشوں نے جن کے سرگردہ حجر بن عدی ہیں، امیر المومنین کے خلاف بغاوت کی تھی، اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالا تھا، اور ہمارے خلاف جنگ ٹھان لی تھی، اللہ نے ہمیں ان پر غلبہ عطا فرمایا اور ہمیں ان پر قابو دے دیا، میں نے شہر کے چیدہ صلحاء، اشراف، معمر اور بزرگ افراد کو بلایا تھا انہوں نے جو کچھ دیکھا اس کی شہادت دی، اب ان لوگوں کو میں نے امیر المومنین کے پاس بھیج دیا ہے اور اہل شہر کے صلحاء کی گواہی میں نے اپنے اس خط کے ساتھ بھیج دی ہے۔“^۳

اس طرح یہ مقدمہ حضرت وائل بن حجر اور حضرت کثیر بن شہابؓ نے حضرت معاویہؓ

^۱ تہذیب التہذیب ص ۲۳۸ ج ۱

^۲ الطبری ص ۲۰۱ ج ۳

^۳ ایضاً ص ۲۰۲ ج ۳

کی خدمت میں پیش کیا۔

حضرت معاویہؓ کو حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کی شورشوں کا پہلے ہی کافی علم ہو چکا تھا، اب ان کے پاس چوالیس قابل اعتماد گواہیاں ان کی باغیانہ سرگرمیوں پر پہنچ گئیں، ان گواہوں میں حضرت وائل بن حجرؓ، حضرت کثیر بن شہابؓ، حضرت عمرو بن حریثؓ اور حضرت خالد بن عرفہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ بھی تھے اور حضرت ابو بردہؓ، حضرت موسیٰ بن طلحہ اور حضرت اسحاق بن طلحہؓ جیسے فقہاء و محدثین اور صلحائے امت بھی، حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کے جرم بغاوت کو ثابت کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ ان کا یہ جرم روز روشن کی طرح ثابت ہو گیا اور ظاہر ہے کہ بغاوت کی سزا ”موت“ ہے۔

لیکن حضرت معاویہؓ نے اپنے طبعی حلم اور بردباری کی بناء پر قتل کے فیصلے میں جلدی نہیں کی، چنانچہ زیاد کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا کہ :

”حجر اور ان کے اصحاب کے بارے میں جو واقعات تم نے لکھے وہ میں نے سمجھ لئے، تم نے جو شہادتیں بھیجیں ان سے بھی باخبر ہو گیا، اب میں اس معاملے میں غور کر رہا ہوں، یہی سوچتا ہوں کہ ان لوگوں کو قتل کروانا ہی بہتر ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ قتل کی یہ نسبت معاف کروانا افضل ہے۔ والسلام

زیاد نے اس کے جواب میں لکھا کہ :

حجر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں آپ کی رائے مجھے معلوم ہو گئی، مجھے تعجب ہے کہ آپ کو اس معاملے میں تردد کیوں ہے، حالانکہ ان لوگوں کے خلاف ان حضرات نے گواہی دی ہے جو ان لوگوں کو زیادہ جانتے ہیں، لہذا اگر آپ کو اس شہر (کوفہ) کی ضرورت ہو تو آپ حجر اور ان ساتھیوں کو میرے پاس واپس نہ بھیجیں۔“

اس کے باوجود حضرت معاویہؓ نے بعض صحابہؓ کے کہنے پر چھ افراد کو چھوڑ دیا اور آٹھ افراد کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ حجر بن عدیؓ کے بارے میں ایک صاحب نے سفارش کی تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا :

لے البری ۲۰۳ ج ۴

”یہ تو ان سب لوگوں کے سردار ہیں اور اگر میں نے ان کو چھوڑ دیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ پھر شہر میں فساد کریں گے۔“^۱

چنانچہ حضرت معاویہؓ نے انہیں قتل کرنے کا حکم جاری فرمایا۔

حجر بن عدیؓ کے عبادت و زہد کی دور دور شہرت تھی، اس لئے جب حضرت عائشہؓ کو علم ہوا کہ حضرت معاویہؓ نے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے تو انہوں نے حضرت معاویہؓ کے نام پیغام بھیجا کہ حجر بن عدیؓ کو رہا کر دیں، پیغام حضرت معاویہؓ کو اس وقت ملا جب وہ قتل کا حکم صادر فرما چکے تھے لیکن انہوں نے فوراً ایک قاصد جلاؤں کے پاس روانہ کیا کہ ابھی حجر بن عدیؓ کو قتل نہ کریں لیکن جب یہ قاصد پہنچا و حجر اور ان کے چھ ساتھی قتل کئے جا چکے تھے۔^۲ یہ ہے حجر بن عدیؓ کے قتل کا وہ واقعہ جو خود مولانا مودودی کے حوالوں سے ماخوذ ہے۔^۳ ہم نے یہ واقعہ انہی کتب سے لیا ہے جن کا مولانا مودودی نے حوالہ دیا ہے اور زیادہ تفصیلات طبری سے نقل کی ہیں جو مولانا کا پسندیدہ ماخذ ہے۔ اگرچہ طبریؒ نے اس واقعہ میں تقریباً تمام روایات ابو سعید خدریؓ کے حوالے سے بیان کی ہیں جس کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ نہایت ناقابل اعتماد شیعہ راوی ہے۔ اور اس نے یہ روایت اپنے جن استادوں سے لی ہے ان کے بارے میں بھی ہم ”حضرت علیؓ پر سب دشتم“ کے عنوان کے تحت بتلا چکے ہیں کہ وہ شیعہ تھے۔^۴ لیکن خود ان شیعہ راویوں نے حجر بن عدیؓ کا واقعہ جس طرح نقل کیا ہے وہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اب آپ مولانا مودودی صاحب کی عبارت ایک بار پھر پڑھئے۔ مولانا نے اس واقعہ کے اہم ترین اجزاء کو یکسر حذف کر کے جس طرح یہ واقعہ ذکر کیا ہے اس سے یہ تاثر قائم

۱۔ الفہری ۲۰۳ ج ۲

۲۔ البدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸ و طبقات ابن سعد ص ۲۱۹ و ۲۲۰ ج ۶ و ۲۲ و ابن خلدون ص ۲۹ ج ۳

۳۔ طبقات ابن سعد کا حوالہ اگرچہ مولانا نے نہیں دیا لیکن ان کی جتنی باتیں ہم نے بیان کی ہیں وہ سب البدایہ والنہایہ میں بھی موجود ہیں جس کا حوالہ مولانا نے دیا ہے۔

۴۔ لہذا جیسا کہ ہم آگے وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے، ان روایات کا وہ حصہ ناقابل اعتماد ہے جن میں بعض صحابہؓ کی طرف حضرت علیؓ کے خلاف سب و شتم کو منسوب کیا گیا ہے۔

ہوتا ہے کہ :

- ۱۔ حجر بن عدی قطعی طور پر بے گناہ تھے۔
 - ۲۔ اصل گناہ حضرت مغیرہؓ اور زیاد کا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو برسبر گالیاں دیا کرتے تھے۔
 - ۳۔ حجر بن عدیؓ نے اس گناہ پر ان دونوں کو ٹوکا۔
 - ۴۔ اس ٹوکے کی پاداش میں زیاد نے انہیں گرفتار کر لیا۔
 - ۵۔ شہادتیں لینے کا ذکر بھی مولانا نے اس طرح کیا ہے کہ گویا ساری شہادتیں جھوٹی تھیں اور کرائے کے چند گواہ جمع کر لئے گئے تھے۔
 - ۶۔ اور خواہ مخواہ ان پر بغاوت کا الزام عائد کر کے ان کے خلاف شہادتیں لیں۔
 - ۷۔ حضرت معاویہؓ نے بے سمجھے بوجھے غصے میں آکر قتل کا حکم دے دیا۔
- واقعے کی مذکورہ تفصیلات کو ذہن میں رکھ کر انصاف فرمائیے کہ کیا ان میں سے کوئی ایک بات بھی صحیح ہے؟

پھر واقعے کی اس قطعی طور پر غلط اور خلاف واقعہ تصویر سے مولانا نے پورے زور قلم کے ساتھ اس کلمے کا استنباط کر لیا ہے کہ اس دور میں زبانیں بند کر دی گئی تھیں، ضمیروں پر قفل چڑھادیئے گئے تھے، اظہار رائے کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اور حق گوئی کی پاداش قتل قرار پائی تھی۔

حضرت معاویہؓ کا معاملہ تو بہت ہی بلند و بالا ہے۔ واقعے کی تمام تفصیلات دیکھنے کے بعد ہمیں تو کہیں زیادہ کے بارے میں بھی یہ نظر نہ آسکا کہ اس نے حجر بن عدیؓ کے معاملے میں اصول شرع کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں نے کھلم کھلا اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی اور اگر ان کو اس وقت گرفتار نہ کیا جاتا تو نہ جانے کوفہ میں کتنے مسلمانوں کا خون بہہ جاتا۔ حضرت معاویہؓ نے ایک صاحب کے سوال کے جواب میں بالکل درست فرمایا کہ۔ ”قتلہ احب الی من ان اقتل مع مائة الف“ (حجر بن عدی کا قتل کرنا مجھے زیادہ پسند تھا، بہ نسبت اس کے کہ میں ان کے ساتھ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کروں)۔

آپ نے دیکھ لیا کہ :

○ (۱) حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی سرے سے حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف تھے۔

○ (۲) حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے مکمل طور سے مطمئن ہو جانے کے باوجود یہ انہیں بار بار بغاوت پر اکساتے رہے اور جب وہ بغاوت پر راضی نہ ہوئے تو ان سے بھی ناراضی کا اظہار کیا۔

○ (۳) حضرت معاویہؓ کے کسی گورنر سے کبھی حضرت علیؓ کی شان میں کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا ثابت نہیں جسے گالی کہا جاسکے۔

○ (۴) اس کے بجائے یہ لوگ حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر کھلم کھلا لعن طعن کرتے تھے۔

○ (۵) امراء کی بات بات پر ان کے خلاف شورش کرنا ان کی عادت بن گئی تھی۔

○ (۶) حضرت مغیرہؓ اور زیادؓ نے انہیں اولاً نہایت معقولیت اور شرافت کے ساتھ فمائش کی کہ ان حرکتوں سے باز آجائیں۔

○ (۷) انہوں نے اس فمائش کے دوران سکوت اختیار کیا، کوئی شکایت پیش نہیں کی لیکن واپس آکر پھر خلافت معاویہؓ کا انکار کیا اور ان پر لعنت بھیجی شروع کی، اور گورنر کوفہ حضرت عمرو بن حصفؓ پر پتھر برسائے۔

○ (۸) زیادؓ نے اس موقع پر بھی کوئی سخت کارروائی کرنے کے بجائے حضرت عدی بن حاتمؓ، حضرت جریر بن عبداللہ الجلیؓ اور حضرت خالد ابن عرفطہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کو بھیجا کہ انہیں سمجھانے کی کوشش کریں، مگر انہوں نے ان سے رخ دے کر بات ہی نہ کی۔

○ (۹) اس موقع پر زیادؓ نے دھمکی دی کہ ”اگر تم سیدھے نہ ہوئے تو تمہارا علاج اس دوا سے کرونگا جو تمہارے لائق ہے۔“ اور اس دھمکی کے ساتھ انہیں پھر سمجھایا کہ امیر المومنین کے تم پر کیا حقوق ہیں مگر حجر بن عدیؓ نے اس موقع پر پھر زیاد پر کنکر برسائے اور کہا کہ ”تجھ پر خدا کی لعنت، تو نے جھوٹ کہا۔“

○ (۱۰) انہیں زیادؓ نے بحیثیت گورنر حکم دیا کہ وہ اس کے پاس آئیں، مگر انہوں نے یہ حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسری بار آدمی بھیجے گئے، انہوں نے بھی سوائے امیر کا پیغام پہنچانے کے انہیں کچھ نہیں کہا، مگر حجرؓ کے ساتھیوں نے انہیں گالیاں دے کر رخصت

کر دیا۔

○ (۱۱) تیسری بار کوفہ کے شرفاء اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کو بھیجا گیا کہ انہیں بلا کر لائیں، انہوں نے بھی شروع میں سوائے اس کے کچھ نہ کہا کہ ”امیر کے پاس چلو“ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ حکم نہیں مانیں گے، اس پر پولیس نے زبردستی کی تو یہ لوگ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لاشیوں اور پتھروں سے باقاعدہ لڑائی لڑی اور قابو میں نہ آئے۔

○ (۱۲) پھر کندہ پہنچ کر پورے محلے کو بغاوت کا گڑھ بنا دیا۔ اور باقاعدہ جنگ کی تیاریاں ہوئیں اور رزمیہ اشعار پڑھے گئے۔ اور جب زیاد نے یہاں اپنے آدمی بھیجے تو ان لوگوں نے سخت جنگ کی، اور بالآخر روپوش ہو گئے۔

○ (۱۳) اس کے بعد جب انہیں گرفتار کر لیا گیا تو کہنے لگے ”ہم اپنی بیعت پر قائم ہیں۔“

○ (۱۴) چوالیس مقتدر ہستیوں نے ان کے خلاف بغاوت کی شہادت دی، جن میں جلیل القدر صحابہ کرام، فقہاء اور محدثین شامل تھے، اور اس شہادت میں کسی پر جبر کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

○ (۱۵) ان تمام واقعات سے باخبر ہو کر اور مذکورہ شہادتیں دیکھ کر حضرت معاویہؓ نے ان کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شورش حجر بن عدیؓ اور ان کے اصحاب نے کھڑی کر دی تھی، اگر اسی کا نام ”حق گوئی“ اور ”اظہار رائے“ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بغاوت ”قتل و فساد“ اور ”شورش“ کے الفاظ لغت سے خارج کر دینے چاہئیں۔

مولانا مودودی صاحب نے یہ دیکھنے کے لئے کہ حجر بن عدیؓ کا قتل شرعاً جائز تھا یا نا جائز ان واقعات کی تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی جو خود کوفہ میں پیش آئے تھے، اور جنہیں علامہ طبریؒ نے کم و بیش دس پندرہ صفحات میں بیان کیا ہے۔ اس کے بجائے اس قتل کے ناجائز ہونے پر ایک خراسان کے گورنر ریح بن زیاد حادثی کے مجمل قول کا حوالہ دیا ہے جو اس وقت کوفہ اور شام سے سینکڑوں میل دور بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تعالیٰ عنہا کے ایک محرف ارشاد کا جو اس وقت مدینہ طیبہ میں تشریف فرما تھیں، تیسرے ان جلاذوں کے قول کا جنہوں نے حجر بن عدیؓ کو قتل کیا۔ اب ان تینوں اقوال کی حقیقت بھی دیکھ لیجئے۔

جہاں تک ربیع بن زیاد حارثی کا تعلق ہے۔ سو وہ خراسان کے گورنر تھے اور وہیں پر انہیں حجر بن عدیؓ کے قتل کی اطلاع ملی۔ انہوں نے فرمایا کہ ”خدا یا! اگر تیرے علم میں میرے اندر کوئی خیر باقی ہے تو مجھے دنیا سے اٹھالے“ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ حجر بن عدیؓ کے عابد و زاہد ہونے کی بڑی شہرت تھی اور قدرتی بات یہ ہے کہ جو شخص بھی پورے حالات سے ناواقف رہ کر صرف یہ سنے گا کہ انہیں قتل کر دیا گیا تو وہ لامحالہ اس پر رنج و افسوس کا اظہار کرے گا۔ لیکن یہ رنج و افسوس اس شخص کے خلاف کیسے جت بن سکتا ہے جس کے سامنے چوالیس قابل اعتماد گواہیاں گذر چکی ہوں اور وہ سب اس بات پر متفق ہوں کہ حجر بن عدیؓ نے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے، جہاں تک عبادت و زاہد کا تعلق ہے تو وہ اس بات کی وجہ جواز نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کیا جائے، نظیر کے طور پر (بلا تشبیہ و مثال) خارجیوں کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ کچھ کم عابد و زاہد نہ تھے، لیکن کیا امت کا کوئی فرد یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ خارجی بہت زیادہ عابد تھے اس لئے انہیں قتل کرنا حضرت علیؓ کا ناجائز فعل تھا؟

رہ گیا حضرت عائشہؓ کا ارشاد، سو اس کے الفاظ مؤرخین نے مختلف طریقے سے نقل کئے ہیں۔ تاریخ طبریؒ میں ایک جگہ تو وہی الفاظ مذکور ہیں جن کا ترجمہ مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ :

”اے معاویہ! جہیں حجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا ذرا خوف نہ ہوا۔“

لیکن خود طبریؒ ہی نے دوسرے مقامات پر، نیز دوسرے بیشتر مؤرخین نے واقعہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ اسی سال حج کو تشریف لائے گئے، اور حضرت عائشہؓ سے ملاقات ہوئی تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ :

”معاویہ! حجر کے معاملے میں تمہاری بردباری کہاں چلی گئی تھی۔“

ابن جریر طبریؒ، ابن اثیر جزری اور ابن خلدونؒ نے تو یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ۔

ابن کان حلمگ عن حجر

اور حافظ ابن کثیرؒ یہ الفاظ نقل فرماتے ہیں :

ابن زہب عنک حلمک یا معاویہ حین قنلت حجراً^۱
 ”جب تم نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا اس وقت تمہاری
 بردباری کہاں گئی تھی۔“
 امام ابن سعد اور امام ابن عبدالبرؒ یہ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

ابن عزب عنک حلم ابی سفیان فی حجر واصحابہ
 ”حجر اور ان کے اصحاب کے معاملے میں تم سے ابو سفیان کی بردباری
 کہاں چلی گئی تھی۔“

حضرت عائشہؓ نے جو الفاظ استعمال کئے ان میں ”بردباری“ کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ
 حضرت عائشہؓ کے نزدیک بھی حضرت معاویہؓ کا یہ فعل ”انصاف“ یا شریعت کے خلاف نہیں
 تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اسے بردباری کے خلاف سمجھتی تھیں، اور اب یہ بھی سن لیجئے کہ
 خود حضرت عائشہؓ کی ذاتی رائے حجر اور ان کے اصحاب کے بارے میں کیا تھی؟ امام ابن
 عبدالبرؒ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے مذکورہ جملے کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ :

الاحسبنتھم فی السجون وعرضتھم لبطاعون
 ”تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ انہیں قید خانوں میں بند رکھتے اور انہیں طاعون
 کا نشانہ بننے دیتے۔“^۲

یہ تھا حضرت عائشہؓ کے نزدیک بردباری کا زیادہ سے زیادہ تقاضا جو حجر اور ان کے
 ساتھیوں کے ساتھ روا رکھی جاسکتی تھی۔ اگر حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی بقول مولانا
 منوودی صاحب ”حق گوئی“ ہی کے ”مجرم“ تھے تو اس ”حق گوئی“ کی کم سے کم سزا حضرت
 عائشہؓ کے نزدیک بھی ”قید خانہ“ ہی تھی۔

بہر کیف! حضرت عائشہؓ کے جواب میں حضرت معاویہؓ نے ”بردباری“ کا جواب یہ دیا
 کہ ام المومنین، آپ جیسے حضرات مجھ سے دور ہیں اور میرے پاس کوئی ایسا بردبار آدمی
 نہیں رہا جو ایسے مشورے دے سکے، اور جہاں تک قانونی بات تھی آپ نے فرمایا کہ :

۱ البدایہ والنہایہ ص ۸۵۳ ج ۸

۲ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۵۵ ج ۱

انما قتلنا الذین شهدوا علیہ
قتل تو انہوں نے کیا جنہوں نے ان کے خلاف گواہی دی۔

اور فرمایا کہ :

فما اصنع کتب الی فیہم زیاد یشدد امرہم ویدکر انہم
سیفتقون علی فتقلا لایرقع
”میں کیا کرتا؟ زیاد نے مجھے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کا معاملہ
بڑا سنگین ہے، اور اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو یہ لوگ میری حکومت کے
خلاف ایسی رخنہ اندازی کریں گے جسے بھرانہ جاسکے گا۔“

اور آخر میں حضرت معاویہ نے یہاں تک فرمایا کہ :

غذالی ولحجر موقف بین یدی اللہ عزوجل
”کل مجھے اور حجروں کو اللہ عزوجل کے سامنے کھڑا ہونا ہے“

اور

قد عیننی و حجرا حتی للمقی عند ربنا
”لہذا میرے اور حجر کے معاملے کو اس وقت تک کے لئے چھوڑ دیجئے جب

ہم دونوں اپنے پروردگار سے ملیں۔“

رہ گئی یہ بات کہ حجر بن عدیؓ کے قتل کے وقت جو بات پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ اگر تم
حضرت علیؓ پر لعنت کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے، سو یہ بات علامہ ظہریؒ نے ابو مخنف کی
روایت سے ذکر کی ہے، اور روایتِ درایتِ قطعی طور پر جھوٹ ہے، سوچنے کی بات ہے کہ اگر
یہ روایت صحیح ہو تو حجر بن عدیؓ کی عبادت و زہد کا تو بہت شہرہ ہے، کیا انہیں شریعت کا یہ
معمولی مسئلہ معلوم نہیں تھا کہ حضرت علیؓ پر لعنت کرنا ایک گناہ ہے اور اگر کسی شخص کو گناہ
کے ارتکاب پر اس طرح مجبور کیا جائے کہ اس کی جان خطرے میں ہو تو اس وقت اس گناہ کا
ارتکاب کر کے جان بچانا واجب ہو جاتا ہے، اور عزیمت کا تقاضا ہی اس وقت یہ ہوتا ہے کہ

۱۔ البدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

۲۔ الاستیعاب ص ۳۵۶ ج ۱

۳۔ البدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

اس گناہ کا ارتکاب کر لیا جائے۔ اور پھر اس روایت سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ گویا حجر بن عدی سے سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ وہ حضرت علیؓ پر (معاذ اللہ) لعنت نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم پیچھے تفصیل سے ثابت کر چکے ہیں کہ نہ حضرت معاویہؓ نے خود کبھی اس فعل شنیع کا ارتکاب کیا نہ اس معاملے میں ان کے کسی ساتھی نے۔ درحقیقت حجر بن عدیؓ کی گرفتاری کا اصل سبب ان کی بغاوت اور شورش انگیزی تھی، اور کیا حضرت معاویہؓ ایسے بچے تھے کہ ایک باغی ان کے سامنے اپنی جان بچانے کے لئے زبان سے حضرت علیؓ کو برا بھلا کہہ دے تو وہ مطمئن ہو جائیں خواہ اس کی ساری عمر حضرت علیؓ کے نام پر جتھے بنانے اور حکومت کے خلاف لوگوں کو پورا نگہبختہ کرنے میں گزری ہو؟ کیا اب حضرت معاویہؓ کے مخالفین (معاذ اللہ) انہیں عمل، تدبیر اور سیاسی بصیرت سے بھی بالکل خالی قرار دیں گے؟ ابو مخنف جیسے شیعہ راویوں نے حضرت علیؓ کی مذمت اور ان پر سب و شتم کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے گویا حضرت معاویہؓ کے نزدیک دنیا کا سب سے اہم مسئلہ حضرت علیؓ کی مذمت تھی۔ اور ان کی زندگی کا اہم ترین مشن یہی تھا کہ وہ لوگوں کو حضرت علیؓ کی مذمت پر آمادہ کیا کریں۔ لیکن کیا حضرت معاویہؓ کی مجموعی زندگی، ان کی سوانح، ان کے فہم و تدبیر اور حلم و بردباری کے بے شمار واقعات میں اس خسیس ذہنیت کا کوئی ادنیٰ سراغ بھی ملتا ہے؟

یہاں ہم پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے طبری کے حوالے سے حجر بن عدیؓ کے قتل کے سلسلے میں جتنی روایات پیچھے ذکر کی ہیں ان میں سے بیشتر روایات ابو مخنف ہی کی ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ اس مقام پر ہم اس کی روایت کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں؟ لیکن اس اعتراض کا جواب بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ ابو مخنف شیعہ اور حجر بن عدیؓ کا حامی ہے، لہذا اصول کا تقاضا ہے کہ ان روایات کو قبول کیا جائے جو حجر بن عدیؓ کے خلاف جاتی ہیں کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حجر بن عدیؓ کی بغاوت کے واقعات اس قدر ناقابل انکار تھے کہ ابو مخنف ان کا پر زور حامی ہونے کے باوجود ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔ اس کے برعکس ابو مخنف کی جو روایات حضرت معاویہؓ کی ذات کو مجروح کرتی ہوں، انہیں ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ حضرت معاویہؓ سے اس کی دشمنی بالکل واضح ہے اور ان کے مقدمے کو کمزور کر کے پیش کرنا اس کی عادت میں داخل ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر ایک عیسائی مؤرخ خود اپنے ہم مذہب لوگوں کی کوئی برائی

بیان کرے تو آپ اسے سند کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن اگر وہی مؤرخ (معاذ اللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے یا آپ کے صحابہ کرام کے خلاف کوئی ایسی بات لکھے جو مسلمانوں کی روایات سے ثابت نہ ہو تو آپ اسے سراسر جھوٹ اور افتراء قرار دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے مطلب کی باتیں چن کر بددیانتی کا ارتکاب کر رہے ہیں بلکہ اس طرح آپ تنقید روایات کے اس اصول پر عمل کرتے ہیں جو سو فیصد معقول، فطری اور دنیا بھر میں مسلم ہے۔

سب سے آخر میں مولانا مودودی صاحب نے حضرت حسن بصریؒ کی طرف منسوب ایک قول اس طرح ذکر کیا ہے کہ :

”حضرت معاویہؓ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی ارتکاب کرے تو وہ اس کے حق میں مسلک ہو۔ ایک ان کا اس امت پر گوارا سنت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا..... دوسرے ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا..... تیسرے ان کا زیادہ کو اپنے خاندان میں شامل کرنا..... چوتھے ان کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا۔“

(”خلافت و حکومت“ ص ۶۵-۶۶)

لیکن مولانا نے حضرت حسن بصریؒ کی طرف منسوب اس فقرے کا آخری جملہ نقل نہیں فرمایا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس جملہ سے اس روایت کا سارا بھرم نکل جاتا ہے۔ طبریؒ اور ابن اثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ حسن بصریؒ نے آخر میں یہ بھی کہا کہ :

وإذا له من حجر و اصحاب حجر و یا وبلالہ من حجر و اصحاب حجر

”حجر اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے معاویہؓ پر دردناک عذاب ہوگا حجر اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے ان پر دردناک عذاب ہو۔“

یہ الفاظ لکھتے وقت ہمارا قلم بھی لرز رہا تھا، مگر ہم نے یہ اس لئے

نقل کر دیئے کہ ان ہی جملوں سے اس روایت کی حقیقت واضح ہوتی ہے، کیا حضرت حسن بصریؒ سے کسی بھی درجہ میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اس بے دردی اور بے باکی کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی شان میں یہ الفاظ استعمال کئے ہوں گے؟ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر اعتراضات کی خواہ کتنی بھرمار کی ہو لیکن ان پر لعن طعن کرنے کو انہوں نے خود بھی ”ظلم“ اور ”زیادتی“ قرار دیا ہے۔ کیا حضرت حسن بصریؒ سے اس ظلم عظیم کی توقع کوئی ایسا شخص کر سکتا ہے جو ان سے واقف ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت بھی ابو مخنف کی ہے (ملاحظہ ہو طبریؒ) اور یہ بلاشبہ حضرت حسن بصریؒ پر اس کا بہتان و افتراء ہے جسے کسی حال درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

یہ حضرت حسن بصریؒ تو وہ ہیں کہ مشاجرات صحابہؓ کے بارے میں مشہور اور مستند مفسر علامہ قرطبیؒ نے ان کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ :

”وقد سئل الحسن البصری عن قتالهم فقال: قتال شهيد اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم وعيننا وعلموا وجهلنا واجتمعوا فاتبعنا واختلفوا فوقفنا قال المجاسبي فنحن نقول كما قال الحسن“

اور حضرت حسن بصریؒ سے صحابہؓ کی باہمی جنگ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ”یہ ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب، وہ سب حالات سے واقف تھے، ہم ناواقف ہیں، جس چیز پر ان کا اتفاق ہے، ہم اس میں ان کی اتباع کرتے ہیں، اور جس میں اختلاف ہو گیا اس میں توقف اور سکوت اختیار کرتے ہیں“ حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حسن بصریؒ نے کہی ہے۔“

غور فرمائیے کہ جو حسن بصریؒ صحابہؓ کی باہمی لڑائیوں میں کسی ایک کی طرف اجتہادی غلطی منسوب کرنے میں بھی تامل کرتے ہوں، وہ حضرت معاویہؓ کو عذابِ جنم کی بددعا دے کر یہ بات آخر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے چار کام ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ان کی ہلاکت کے لئے کافی ہے؟ نعوذ باللہ منہ!

حضرت معاویہؓ

کے زمانے میں اظہار رائے کی آزادی

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ پر یہ اعتراض کہ ان کے دور میں اظہار رائے کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا تھا ان پر اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ ہم یہاں چند واقعات مختصراً ذکر کرتے ہیں جن سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) حضرت مسور بن عزمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ اپنے کسی کام سے حضرت معاویہؓ کے پاس تشریف لے گئے، وہ خود فرماتے ہیں کہ جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا : ”مسور! آپ ائمہ (امراء) پر جو طعن کیا کرتے ہیں اس کا کیا حال ہے؟“

میں نے کہا : ”اس وقت اس بات کو رہنے دیجئے اور جس کام کے لئے ہم آئے ہیں اس میں ہمارے ساتھ نیک سلوک کیجئے“ مگر حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ :

”نہیں، آپ مجھے اپنے دل کی ساری باتیں بتائیے۔“ حضرت مسور فرماتے ہیں کہ اس پر میں جتنے عیب ان پر لگایا کرتا تھا وہ سب بیان کر دیئے، ایک نہیں چھوڑا، حضرت معاویہؓ نے سن کر فرمایا : ”گناہوں سے کوئی بری نہیں، کیا آپ اپنے اندر ایسے گناہ محسوس نہیں کرتے جن کے بارے میں آپ کو یہ خوف ہو کہ اگر اللہ نے انہیں معاف نہ فرمایا تو آپ کو ہلاک کر دیں گے؟“

میں نے عرض کیا : ”ہاں میرے بھی ایسے گناہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہ فرمائے تو میں ان کے سبب سے ہلاک ہو جاؤں۔“ حضرت معاویہؓ نے فرمایا : ”پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ مغفرت کا مستحق سمجھتے ہیں؟ خدا کی قسم! میں عوام کی

اصلاح، حدود شرعیہ کی اقامت اور جہاد فی سبیل اللہ کی جن خدمات میں مشغول ہوں، وہ ان عیوب سے زیادہ ہیں جو آپ نے بیان کئے۔ اور میں ایک ایسے دین کا پیرو ہوں جس میں خدا حسنت کو قبول فرماتا اور سینات سے درگزر فرماتا ہے۔“

اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے فرمایا :

”واللہ علیٰ ذلک ما کنت لآخرین بین اللہ وغیرہ الا اخترت اللہ علی غیرہ مما سواہ“

”اس کے علاوہ وہ خدا کی قسم! جب بھی مجھے اللہ اور غیر اللہ کے درمیان

اختیار ملتا ہے، میں اللہ کے سوا اور کسی کو اختیار کرنے والا نہیں ہوں۔“

حضرت مسور بن مخرمہؓ فرماتے ہیں کہ ”ان کے ارشادات پر میں غور کرتا رہا تو مجھے پتہ چلا کہ انہوں نے واقعہ دلائل میں مجھے مظلوم کر دیا۔“ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت مسور رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بھی حضرت معاویہؓ کا ذکر کرتے تو ان کے حق میں دعائے خیر فرماتے۔

(۲) حافظ ابن کثیرؒ نقل فرماتے ہیں کہ ”ایک شخص نے حضرت معاویہؓ کو ان کے منہ پر بہت برا بھلا کہا اور ان کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آیا۔ کسی نے کہا کہ ”آپ اس پر حملہ کیوں نہیں کرتے؟“ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ :

”انی لاسنجسی من اللہ ان یضیق حلمی عن ذنب احد من رعیتی“

”مجھے اللہ سے اس بات پر شرم آتی ہے کہ میری بردباری میری رعایا کے کسی گناہ سے ٹک ہو جائے۔“

(۳) ابن خلدونؒ نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عدی بن حاتمؓ کو چھیڑا، اور مذاق میں انہیں حضرت علیؓ کا ساتھ دینے پر توجیح کی، اس کے جواب میں حضرت عدیؓ نے فرمایا : ”خدا کی قسم! جن دلوں سے ہم نے تمہیں برا سمجھا تھا وہ ابھی

نہ یہ واقعہ حافظ ابن کثیرؒ نے مصنف ابن عبدالرزاقؒ کے حوالے سے دو سندوں کے ساتھ ذکر فرمایا ہے (البدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸)

ت البدایہ ص ۱۳۵ ج ۸

ہمارے سینوں میں ہیں، اور جن تلواروں سے تمہارا مقابلہ کیا تھا، وہ ابھی ہمارے کاندھوں پر لٹکی ہوئی ہیں اور اب اگر تم غدر کی طرف ایک بالشت بڑھے تو ہم جنگ کی طرف دو ہاتھ بڑھ جائیں گے، اور یاد رکھنا کہ ہمیں اپنی شہ رگ کٹنے کی آواز اور سینے سے نکلنے والی موت کی سسکیاں زیادہ محبوب ہیں، یہ نسبت اس کے کہ ہم علیؓ کے بارے میں کوئی بری بات سنیں۔“
حضرت معاویہؓ نے یہ سن کر لوگوں سے فرمایا: ”یہ ساری باتیں حق ہیں، انہیں لکھ لو۔“ اس کے بعد وہ دیر تک حضرت عدیؓ سے باتیں کرتے رہے۔^۱

(۳) عبداللہ بن میر فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت معاویہؓ کو بہت دیر تک سخت سُت کہا، حضرت معاویہؓ خاموش رہے تو لوگوں نے کہا: ”کیا آپ اس پر بھی بردباری کا مظاہرہ فرمائیں گے؟“ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ ”میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا، الایہ کہ وہ ہماری حکومت کے درمیان حائل ہونے لگیں“ یعنی بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔

(۵) ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنر زیاد کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ:

”لوگوں کے ساتھ ہمیشہ ایک جیسا طرز عمل اختیار کرنا ٹھیک نہیں، نہ اتنی نرمی کرنی چاہئے کہ وہ اترا جائیں اور نہ اتنی سختی کہ وہ لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دے، بلکہ ایسا کرو کہ سختی کے لئے تم کافی ہو جاؤ اور رحمت و الفت کے لئے میں، تاکہ اگر کوئی شخص خوف کی حالت میں ہو تو اسے داخل ہونے کے لئے ایک دروازہ مل جائے۔“^۲

(۶) علامہ ابن اثیرؒ نقل فرماتے ہیں کہ عبدالرحمن بن الحکم ایک شاعر تھے، شاعروں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ امراء کی مدح میں قصیدے کہا کرتے ہیں، حضرت معاویہؓ نے ان سے فرمایا:

”مدح سے بچو اس لئے کہ وہ بے حیاءوں کی غذا ہے۔“^۳

^۱ ابن اثیر ص ۵۵ ج ۳

^۲ ابن خلدون ص ۷ ج ۳

^۳ ابن اثیر ص ۵۵ ج ۳

^۴ البدایہ والنہایہ ص ۱۳۶ ج ۸

(۷) طبرانیؒ اور حافظ ابن عساکرؒ نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، خطبے میں ”فرار من الطاعون“ کی حدیث ذکر فرمائی، اس میں کوئی فروگذاشت ہو گئی تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ کے سچ ہی میں کھڑے ہو کر فرمایا :

”تمہاری ماں ہندہ تم سے زیادہ عالم تھی۔“

حضرت معاویہؓ نے نماز کے بعد حضرت عبادہؓ کو بلا کر اس طرز کلام پر تو زبانی تنبیہ فرمائی مگر جب ان سے تحقیق ہو گئی کہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح حضرت عبادہؓ بیان فرما رہے تھے تو عصر کی نماز کے بعد منبر سے خود اعلان فرمایا کہ :

”میں نے تم سے منبر پر ایک حدیث ذکر کی تھی، گھر جا کر پتہ چلا کہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح عبادہؓ کہتے ہیں، لہذا انہی سے استفادہ کرو، کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ فقیر ہیں۔“

حضرت معاویہؓ اور ان کے عہد حکومت کی ایک تصویر یہ ہے جو ان جیسے بے شمار واقعات سے سامنے آتی ہے مگر مولانا ممدودی صاحب ان کے عہد حکومت کی منظر کشی اس طرح فرماتے ہیں کہ :

”ضمیموں پر قتل چڑھادیئے گئے، زبانیں بند کر دی گئیں، اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو، ورنہ چپ رہو، اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زور دار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لئے تیار ہو جاؤ، چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے ان کو بدترین

نے ابن عساکر ص ۲۱۱ و ۲۱۰ ج ۷ ”عبادہ بن الصامت“

نے مذکورہ سات واقعات ہم نے بغیر کسی خاص جتو کے سرسری طور سے لکھ دیئے ہیں، ورنہ اس قسم کے واقعات جو یہ مضمون لکھتے وقت ہماری نظر سے گزرے ہیں، اتنے زیادہ ہیں کہ بلا مبالغہ ان سے ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ابن خلدونؒ فرماتے ہیں کہ :

”واخبارہ فی الحکم کثیرہ“

(ان کی بیماری کے واقعات بہت ہیں)

سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔“ (س ۱۲۳ و ۱۲۴)
 اور اس عمومی منظر کشی کی دلیل کیا ہے؟ صرف ایک حجر بن عدیؓ کا واقعہ جس کی
 حقیقت پوری تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت معاویہؓ کی قبر کو
 نور سے بھر دے ان کے درجات کی بلندی کے لئے اللہ تعالیٰ کیسے کیسے سامان مہیا فرما رہے
 ہیں؟

یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک مشہور اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے یزید کو
 اپنا ولی عہد نامزد کیا، چنانچہ جناب مولانا مودودی صاحب نے بھی یہ اعتراض کیا ہے اور ساتھ
 ہی یہ بھی کہا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ کام خالص اپنے مفاد کے لئے کیا تھا، وہ لکھتے ہیں :
 ”یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں
 ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہ بن شعبہؓ) نے اپنے ذاتی مفاد
 کیلئے دوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس
 تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ
 اس طرح امت محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔“

(خلافت و ملوکیت ص ۱۵)

اس کے بعد انہوں نے ابن اثیرؒ وغیرہ کی مختلف روایات سے یہ ثابت کرنے کی
 کوشش کی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کے لئے بیعت لینے میں جبر و اکراہ، خوف و طمع اور
 رشوت کے ذرائع سے کھلم کھلا کام لیا۔
 اس موضوع پر اپنی گفتگو شروع کرنے سے قبل ہم ابتدائی میں یہ بات صاف کر دینا
 چاہتے ہیں کہ یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں :

(۱) حضرت معاویہؓ کا یزید کو ولی عہد بنانا رائے، تدبیر اور نتائج کے اعتبار سے صحیح تھا یا

غلط؟

(۲) دوسرے یہ کہ حضرت معاویہؓ نے یہ کام نیک نیتی کے ساتھ جواز شرعی کی حدود میں

رہ کر کیا تھا یا خالص اپنے ذاتی مفاد کے لئے حدود اللہ کو پامال کر کے؟
جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے اس میں ہمیں مولانا مورودی صاحب سے اختلاف نہیں ہے۔ جمہور امت کے محقق علماء ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہوا۔ اور اس کی وجہ سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا۔ لہذا اگر مولانا مورودی صاحب اپنی بحث کو اس حد تک محدود رکھتے تو ہمیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

البتہ مولانا سے ہمارا اختلاف دوسرے مسئلے میں ہے، مولانا نے حضرت معاویہؓ کے اس اقدام کو محض رائے اور تدبیر کے اعتبار سے غلط قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ براہ راست حضرت معاویہؓ کی نیت پر تہمت لگا کر اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ ان کے پیش نظر بس اپنا ذاتی مفاد تھا۔ اور اس ذاتی مفاد پر انہوں نے پوری امت کو قربان کر دیا۔

جمہور امت کا موقف اس معاملے میں یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو بلحاظ تدبیر و رائے تو غلط کہا جاسکتا ہے لیکن ان کی نیت پر حملہ کرنے اور ان پر مفاد پرستی کا الزام عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے لہذا ہماری آئندہ گفتگو کا حاصل یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اقدام واقعی کے اعتبار سے سو فیصد درست اور نفس الامری میں بالکل صحیح تھا یا انہوں نے جو کچھ کیا وہ بالکل ٹھیک کیا، بلکہ ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ وہ اپنے اس اقدام میں نیک نیت تھے، انہوں نے جو کچھ کیا وہ نیک نیتی کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور خلافت کا مسئلہ ہمارے زمانے میں بڑی نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس مسئلے پر بحث و مباحثہ کی گرم بازاری نے مسلمانوں میں دو ایسے گروہ پیدا کر دیئے ہیں جو افراط و تفریط کی بالکل آخری حدود پر کھڑے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو یزید کو کھلا فاسق و فاجر قرار دے کر حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر مفاد پرستی، خود غرضی، رشوت ستانی اور ظلم وعدوان کے الزامات عائد کر رہا ہے، دوسری طرف ایک گروہ ہے جو یزید کو فرشتہ قرار دیکر حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کو ہوس اقتدار، جاہ طلبی اور انتشار پسندی کا مجرم بنا رہا ہے اور جمہور امت نے اعتدال کا جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ مناظرے کے جوش و خروش میں دونوں کی نگاہوں سے اوچھل ہو چکا

ہے

اس افراط و تفریط کی ساری وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کے باہمی اختلافات کو موجودہ زمانے کی سیاسی پارٹیوں کے اختلافات پر قیاس کر لیا گیا ہے اور چونکہ آج کی مفاد پرست دنیا میں یہ تصور مشکل ہی سے آتا ہے کہ دو مخالف سیاسی جماعتیں بیک وقت نیک نیتی کے ساتھ کسی صحیح، جائز اور نیک مقصد کے لئے ایک دوسرے سے لڑ سکتی ہیں، اس لئے صحابہ کرام کی جماعتوں کے بارے میں بھی یہ تصور کرنا مذکورہ گروہوں کو مشکل نظر آتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وہ سرسری طور پر کسی ایک جماعت کے برحق اور نیک نیت ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، اور یہ فیصلہ ذہن میں جما کر اس کی تائید و حمایت کے لئے دلائل تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں دوسرے فریق کے صحیح موقف کو سمجھنے کی کوشش کئے بغیر اس پر الزامات و اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔

ہم دونوں فریقوں کو سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو جمعہ کے دن ہر خطبے میں دہرایا جاتا ہے کہ :

اللہ اللہ فی اصحابی لا یتخذنہم غرضاً من بعدی
میرے صحابہ کے معاملے میں خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو، میرے بعد انہیں
(اعتراضات) کا نشانہ مت بناؤ۔

ہم سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا واسطہ دیکر یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ صحابہ کرام کی عظمت شان کو پیش نظر رکھ کر ان کے صحیح موقف کو ٹھنڈے دل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں، اور دل سے بدگمانیوں کا غبار دھو کر اس مسئلے پر غور فرمائیں۔

اس درد مندانه گزارش کے بعد ہم اس مسئلے میں اپنے مطالعے کا حاصل پیش کرتے ہیں، یہاں تین چیزیں قابل غور ہیں :-

(۱) ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲) یزید خلافت کا اہل تھا یا نہیں؟

(۳) ان روایات کی کیا اصلیت ہے جن میں یزید کی بیعت کے لئے خوف و طمع کے ذرائع

سے کام لینے کا ذکر کیا گیا ہے؟ ہم مسئلے کے ان تینوں گوشوں پر مختصر گفتگو کرتے ہیں :

ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت

یہاں دو مسئلے قابل تحقیق ہیں، ایک یہ کہ کوئی خلیفہ وقت اپنے بعد کے لئے کسی کو، خاص طور سے اپنے کسی رشتہ دار کو اپنا ولی عہد بنا دے تو اس کی یہ وصیت امت پر لازم ہو جاتی ہے یا اس کی وفات کے بعد اہل حل و عقد کی منظوری کی پابند رہتی ہے؟

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے، اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفہ وقت اگر کسی شخص میں نیک نیتی کے ساتھ شرائط خلافت پاتا ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کو ولی عہد بنا دے، خواہ وہ اس کا باپ بیٹا یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، البتہ بعض علماء نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر وہ اس کا باپ یا بیٹا ہو تو اہل حل و عقد کے مشورے کے بغیر ولی عہد بنانا بھی جائز نہیں ہے۔

رہا دوسرا مسئلہ تو اس میں علامہ ماوردیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور ابن خلدونؒ کے بیانات سے تو بڑے تو سعات معلوم ہوتے ہیں، ان کا رجحان اس طرف ہے کہ اگر کوئی خلیفہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنا دے جس میں خلافت کی اہلیت ہو تو اس کی وصیت ساری امت پر لازم ہو جاتی ہے اور اس کا نفاذ اہل حل و عقد کی مرضی پر موقوف نہیں ہوتا، لیکن علماء محققین کی رائے یہی ہے کہ ولی عہد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے، اور جب تک امت کے ارباب حل و عقد اسے منظور نہ کر لیں، یہ تجویز امت پر واجب العمل نہیں ہوتی، خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ کی گئی ہو بلکہ امت کے ارباب حل و عقد کو حق ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو باہمی مشورے سے اس تجویز کو قبول کریں اور چاہیں تو رد کریں۔ اسلامی سیاست کے مشہور عالم اور مصنف قاضی ابو یعلیٰ الفراء الحنبلیؒ (متوفی ۳۵۸ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ:

”خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بعد کے لئے کسی شخص کو ولی عہد بنائے اور اس معاملہ میں اہل حل و عقد کی موجودگی کوئی ضروری نہیں ہے اس

لے تفصیل کے لئے دیکھئے۔ ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء ص ۵ جلد اول مطبع صدیقی بریلی ۱۳۸۶ھ والا حکام السلطانیہ للماوردی ص ۸، المبدعۃ المحمودیۃ مصر، الاحکام السلطانیہ لابن یعلیٰ الفراء ص ۹ مصنف ابالی مصر ۱۳۵۶ھ، مقدمہ ابن خلدون ص ۳۷۶ و ۳۷۷ دار الکتب اللبنانی بیروت ۱۹۵۶ھ

لئے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد بنایا اور حضرت عمرؓ نے چھ صحابہ کرام کو یہ فریضہ سپرد کیا اور سپرد کرتے وقت کسی نے بھی اہل حل و عقد کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا۔ اس کی عقلی وجہ یہ ہے کہ کسی کو ولی عہد بنانا اس کو خلیفہ بنانا نہیں ہے۔ ورنہ ایک ہی زمانے میں مختلف افراد کا اجتماع لازم آجائے گا جو جائز نہیں ہے اور جب یہ خلافت کا عقد نہیں ہے تو اہل حل و عقد کی موجودگی بھی ضروری نہیں ہاں ولی عہد بنانے والے کی وفات کے بعد ان کی موجودگی ضروری ہے۔“

چند سطروں کے بعد وہ لکھتے ہیں :

”خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنائے جو اس کے ساتھ باپ یا بیٹے کا رشتہ رکھتا ہو بشرطیکہ وہ خلافت کی شرائط کا حامل ہو اس لئے کہ خلافت محض ولی عہد بنانے سے منع نہیں ہو جاتی بلکہ مسلمانوں کے قبول کرنے سے منع ہوتی ہے۔ اور اس وقت ہر قسمت دور ہو جاتی ہے۔“

محقق علماء کے نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ اگر خلیفہ وقت تھا اپنی مرضی سے کسی کو ولی عہد بنا دے تو اس کے لئے تو یہ جائز ہے، لیکن اس کا یہ فیصلہ ایک تجویز کی حیثیت رکھتا ہے جسے امت کے اہل حل و عقد اس کی وفات کے بعد قبول بھی کر سکتے ہیں اور رد بھی۔ دلائل کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے مختصر یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد تو بلاشبہ بنایا تھا، لیکن بنانے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اہل شوری سے استصواب فرمایا اور جب دیکھا کہ تمام لوگ ان پر متفق ہیں تب اپنے فیصلے کا اعلان فرمایا۔ نیز ان کی وفات کے بعد بھی امت ان پر متفق ہو گئی۔

۱۔ ابو یعلیٰ القراءۃ الاحکام السلطانیہ ص ۹، مصطفیٰ البابی الجلبلی مصر ۱۳۵۶ھ، عبارت یہ ہے:

ویجوز ان یعہد الی من ینسب الیہ بابوہ او بنوہ اذا کان المعہود لہ علی صفات الائمۃ لان الامامۃ لا

تتعقد للمعہود الیہ بنفس العہد وانما یتعقد بعہد المسلمین والتہمة تنفی عنہ

۲۔ ملاحظہ ہو الجبری ص: ۶۱۸ ج ۲ والامامۃ والسیاستہ لابن قتیبہ ص ۱۹ و ۲۰ مصطفیٰ البابی مصر

اس تفصیل سے دو باتیں بہر حال واضح ہو جاتی ہیں۔

(۱) اگر کوئی خلیفہ وقت نیک نیتی کے ساتھ اپنے بیٹے کو خلافت کا اہل سمجھتا ہے تو وہ اسے اپنا ولی عہد مقرر کر سکتا ہے، یہ بات علماء کے ان دونوں گروہوں کے نزدیک متفق علیہ ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) علماء محققین کے نزدیک بیٹے کو ولی عہد بنانے کے لئے ارباب حل و عقد سے مشورہ کرنا اور ان کا منظور کرنا ضروری ہے اس کے بغیر اس کی خلافت منعقد نہیں ہوتی، اور یہی قول صحیح و مختار ہے، البتہ ایک جماعت اس بات کی بھی قائل رہی ہے کہ خلیفہ وقت تنہا اپنی مرضی سے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اہل حل و عقد کی منظوری کی بھی ضرورت نہیں ہے، اور اس کی وصیت تمام امت پر لازم ہو جاتی ہے۔

اب یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر غور فرمائیے، مندرجہ بالا احکام کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیانت داری سے اپنے بیٹے یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے تو اسے ولی عہد بنا دینا شرعی اعتبار سے بالکل جائز تھا۔ اگر وہ یہ کام پوری امت کے مشورے سے کرتے تب تو بافتاق ان کا یہ فیصلہ ہر فرد کے لئے واجب الاتباع ہوتا، اور اگر تنہا اپنی رائے سے کرتے تو ان کے فعل کی حد تک تو یہ فیصلہ بافتاق جائز تھا اور علماء کے ایک گروہ کے نزدیک امت کے لئے واجب العمل بھی تھا، لیکن علماء کے راجح قول کے مطابق اس سے اہل حل و عقد کی منظوری کے بغیر یزید کی خلافت منعقد نہیں ہو سکتی تھی۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا یا محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے؟

کیا حضرت معاویہؓ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل ہے۔ متعدد تواریخ میں منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ کے صاحبزادے حضرت سعید بن عثمانؓ نے آکر حضرت معاویہؓ سے شکایت کی کہ ”آپ نے

یزید کو ولی عہد بنا دیا ہے، حالانکہ میرا باپ اس کے باپ سے میری ماں اسکی ماں سے اور خود میں اس سے افضل ہوں۔“ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ ”خدا کی قسم! تمہارے والد مجھ سے بہتر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تھے۔ تمہاری ماں بھی یزید کی ماں سے افضل ہے، لیکن جہاں تک یزید کا تعلق ہے، اگر سارا غوطہ تم جیسے آدمیوں سے بھر جائے تو بھی یزید تم سے بہتر اور زیادہ محبوب ہو گا۔“ حضرت معاویہؓ کے یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ کسی ذاتی برتری کے تصور یا رشتے کی بناء پر یزید کو افضل نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ ان کی دیانت دارانہ رائے یہی تھی۔ اس کے علاوہ متعدد تواریخ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک خطبہ میں یہ دعا فرمائی کہ :

اللهم ان كنت تعلم اني وليته لانه فيما اراه اهل لذلک فانتم له
ما وليته وان كنت وليته لاني احبه فلا تتم له ما وليته^۱
”اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے اسے (یزید کو) اس لئے ولی عہد بنا
لیا ہے کہ وہ میری رائے میں اس کا اہل ہے تو اس ولایت کو اس کے لئے
پورا فرما دے اور اگر میں نے اس لئے اس کو ولی عہد بنایا ہے کہ مجھے اس
سے محبت ہے تو اس ولایت کو پورا نہ فرما۔“

اور حافظ طحس الدین ذہبیؒ اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے عطیہ بن قیس کے حوالہ سے اس دعا کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں :

اللهم ان كنت عهدت ليزيد لما رايت من فضله فبلغه ما املت
واعنته وان كنت انما حملني حب الوالد لولده وان له ليس لما
صنعت به اهلا فاقبضه قبل ان يبلغ ذلك^۲

”اے اللہ! اگر میں نے یزید کو اس کی فضیلت دیکھ کر ولی عہد بنایا ہے تو
اسے اس مقام تک پہنچا دے جس کی میں نے اس کے لئے امید کی ہے“

۱۔ البدایۃ والنہایۃ ص ۸۰ ج ۸

۲۔ الذمعی: تاریخ الاسلام و طبقات الشاہر و الاعلام ص ۲۶۷ ج ۲: کتبۃ القدسی قاہرہ ۱۳۶۸ھ و

السیوطی: تاریخ الخلفاء ۱۵ ص الطابع، کراچی ۱۳۷۸ھ

اور اس کی مدد فرما اور اگر مجھے اس کام پر صرف اس محبت نے آمادہ کیا ہے
جو باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے تو اس کے مقام خلافت تک پہنچنے سے پہلے
اس کی روح قبض کر لے“

غور کرنے کی بات ہے کہ جس باپ کے دل میں چور ہو، کیا وہ جمعہ کے دن مسجد کے منبر
پر کھڑے ہو کر قبولیت کی گھڑی میں اپنے بیٹے کے لئے ایسی دعا کر سکتا ہے؟ حضرت معاویہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس پر خلوص دعا کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ انہوں نے
یزید کو نا اہل سمجھنے کے باوجود محض بیٹا ہونے کی وجہ سے خلافت کے لئے نامزد کیا تھا تو یہ اتنا
بڑا تحکم ہے جس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ کسی شخص کی نیت پر حملہ کرنا
زندگی میں بھی شریعت نے جائز قرار نہیں دیا، چہ جائیکہ اس کی وفات کے ساڑھے تیرہ سو
بیس بعد اس ظلم کا ارتکاب کیا جائے۔

یزید کی جو مکروہ تصویر عموماً ذہنوں میں بسی ہوئی ہے، اس کی بنیادی وجہ کربلا کا المناک
حادثہ ہے، ایک مسلمان کے لئے واقعتاً یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ جس شخص پر کسی نہ کسی
درجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب نواسے کے قتل کی ذمہ داری عائد ہوتی
ہے، اسے صالح اور خلافت کا اہل قرار دیا جائے۔ لیکن اگر حقیقت حال کی واقعی تحقیق
مقصود ہو تو اس معاملے میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جس وقت یزید کو ولی عہد
بنایا جا رہا تھا، اس وقت حادثہ کربلا واقع نہیں ہوا تھا اور کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا
تھا کہ یزید کی حکومت میں حضرت حسینؑ کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس وقت
یزید کی شہرت جھوٹوں کو بھی اس حیثیت سے نہیں تھی جس حیثیت سے آج ہے۔ اس وقت
تو وہ ایک صحابی اور ایک خلیفہ وقت کا صاحبزادہ تھا۔ اس کے ظاہری حالات، صوم و صلوات کی
پابندی، اس کی دینی نجابت، اور اس کی انتظامی صلاحیت کی بناء پر یہ رائے قائم کرنے کی
پوری گنجائش تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے، اور صرف یہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی
رائے نہیں تھی بلکہ بہت سے دوسرے جلیل القدر صحابہؓ اور تابعین بھی یہ رائے رکھتے
تھے۔ دوسری صدی ہجری کے مشہور مورخ علامہ بلاذریؒ مورخ بدائنی کے حوالے سے امام
المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کرتے ہیں :

”قال عامر بن مسعود الجمحی انابمکة اذمر بنابرید یعنی

معاویة فنهضنا الی ابن عباسؓ وهو بمكة وعنده جماعة وقد وضعت المائدة ولم یوت بالطعام فقلنا له یا ابن عباس جاء البرید بموت معاویة فوجم طویلاً ثم قال اللهم اوسع لمعاویة اما والله ما كان مثل من قبله ولا یاتی بعده مثله وان ابنه یزید لمن صالحی اهله فالزموا مجالسکم واعطوا اطاعتکم وبیعتکم" ۱۱

عمر بن مسعودؓ بھی کہتے ہیں کہ جب ایک قاصد حضرت معاویہؓ کی وفات کی خبر لے کر آیا تو ہم مکہ مکرمہ میں تھے۔ ہم اٹھ کر حضرت ابن عباسؓ کے پاس چلے گئے وہ بھی مکہ ہی میں تھے، ان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے اور دسترخوان بچھ چکا تھا مگر ابھی کھانا نہیں آیا تھا، ہم نے ان سے کہا کہ اے ابن عباسؓ! قاصد حضرت معاویہؓ کی موت کی خبر لے کر آیا ہے، اس پر وہ کافی دیر خاموش بیٹھے رہے پھر انہوں نے کہا کہ "یا اللہ! حضرت معاویہؓ کے لئے اپنی رحمت کو وسیع فرما دے، خدا کی قسم! وہ اپنیوں سے پہلوں کی طرح نہیں تھے، اور ان کے بعد ان جیسا نہیں آئے گا" اور بلاشبہ ان کا بیٹا یزید ان کے صالح اہل خانہ میں سے ہے، لہذا تم اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو، اور اپنی طاعت اور بیعت اسے دے دو۔"

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہؓ کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ فتنہ حرہ کے موقع پر عبداللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی حضرت محمد بن حنفیہؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "یزید شراب پیتا ہے اور نماز چھوڑتا ہے، اور کتاب اللہ کے احکام سے تجاوز کرتا ہے۔" اس کے جواب میں حضرت محمد بن حنفیہؓ نے فرمایا:

قد حضرته واقمت عنده فرأيتہ مواظباً علی الصلوة متحرباً
للخیر یسال عن الفقه ملازمًا للسنة

"میں اس کے پاس گیا ہوں، اور ٹھہرا ہوں، میں نے اس کو نماز کا پابند اور

خیر کا طالب پایا، وہ فقہ کے مسائل پوچھتا ہے، اور سنت کا پابند ہے۔"

انہوں نے کہا کہ یزید نے آپ کے سامنے تصنعاً ایسا کیا ہوگا، حضرت محمد بن حنفیہؓ نے

فرمایا کہ ”اے مجھ سے کون سا خوف یا کون سی امید تھی؟ اور کیا اس نے تمہیں خود بتایا ہے تو تم بھی اس کے شریک ہو گے“ اور اگر اس نے تمہیں نہیں بتایا تو تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ بغیر علم کے شہادت دو۔“ انہوں نے کہا کہ ”اگرچہ ہم نے دیکھا نہیں لیکن ہم اس خبر کو سچ سمجھتے ہیں“ حضرت محمد بن حنفیہؓ نے فرمایا ”اللہ نے شہادت دینے والوں کے لئے ایسی بات کہنے کو جائز قرار نہیں دیا“ قرآن کا ارشاد ہے۔ الامن شہد بالحق فہم یعلمون۔ لہذا مجھے تمہارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے“ انہوں نے کہا ”شاید آپ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ اس معاملے (یزید کے خلاف بغاوت) کی سرداری آپ کے سوا کسی اور کو ملے لہذا ہم آپ ہی کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں“ حضرت محمدؐ نے فرمایا کہ ”میں قتال کو نہ تابع ہو کر حلال سمجھتا ہوں نہ قاتل بن کر“۔

ان روایات سے یہ بات واضح ہے کہ یزید کے ظاہری حالات ایسے تھے کہ ان کی موجودگی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابی اس کے صالح اور اہل خلافت ہونے کی رائے رکھ سکتے تھے۔ دوسری طرف اگر اس ماحول کو پیش نظر رکھا جائے، جس میں یہ خلافت منعقد ہو رہی تھی تو بلاشبہ یہ رائے قائم کرنے کی بھی پوری گنجائش تھی کہ وہ موجودہ حالات میں خلافت کا اہل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ماحول میں حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابہؓ صلحائے امت اور مدبرین موجود ہوں، اس ماحول میں یزید کو خلافت کے لئے نااہل یا غیر موزوں سمجھنا کچھ بعید نہیں ہے، زمانہ صحابہ کرامؓ اور کبار تابعین کا تھا، امت میں خیر و صلاح کا دور دورہ تھا، ایسے حالات میں خلافت کیلئے عدالت و انصافی کے جس معیار بلند کی ضرورت تھی، ظاہر ہے کہ یزید اس پر پورا نہیں اترتا تھا، اسی لئے بعض صحابہ کرامؓ نے اس نامزدگی کی کھل کر مخالفت کی۔

تیسرے صحابہ کرامؓ کا ایک گروہ وہ تھا جو حضرت حسینؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ جیسے صحابہ کے مقابلے میں یزید کو خلافت کے لئے بہتر تو نہیں سمجھتا تھا لیکن اس خیال سے اس کی خلافت کو گوارا کر رہا تھا کہ امت میں افتراق و انتشار برپا نہ ہو مثلاً حمید بن عبدالرحمان کہتے ہیں کہ میں یزید کی ولی عہدی کے وقت حضرت بشیرؓ کے پاس گیا جو صحابہ میں

سے تھے، تو انہوں نے فرمایا :

”يقولون انما يزيد ليس بخير امة محمد صلى الله عليه وسلم
وانا اقول ذلك ولكن لان يجمع الله امة محمد احب الي من ان
نفترق له“

لوگ کہتے ہیں کہ يزيد امت محمد میں سب سے بہتر نہیں ہے، اور میں بھی
یہی کہتا ہوں لیکن امت محمد کا جمع ہو جانا مجھے افتراق کی بہ نسبت زیادہ پسند
ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ يزيد کے بارے میں صحابہ کرامؓ کا یہ اختلاف بھی درحقیقت رائے
اور اجتہاد کا اختلاف تھا، اور اس معاملے میں کسی کو بھی مطعون نہیں کیا جاسکتا، حضرت
معاویہؓ يزيد کو محض اچھا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے خلافت کا اہل سمجھنے کے وجہ سے،
ولی عہد بنانا چاہتے تھے اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت دیانت داری کے ساتھ ان کی ہمنوا
تھی اور وہ پانچ صحابہ کرامؓ جنہوں نے اس کی مخالفت کی تھی، وہ کسی ذاتی خصومت یا حرص
اقتدار کی بناء پر مخالفت نہیں کر رہے تھے، بلکہ وہ دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ يزيد
خلافت کا اہل نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں، مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے
کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رائے واقعہ کے لحاظ سے سو فیصد
درست تھی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ نفس الامر میں ٹھیک کیا، بلکہ مذکورہ بحث سے یہ بات
ثابت ہوتی ہے کہ ان کی رائے کسی ذاتی مفاد پر نہیں بلکہ دیانت داری پر مبنی تھی، اور انہوں
نے جو کچھ کیا وہ امانت کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔ ورنہ جہاں تک رائے
کا تعلق ہے، جمہور امت کا کہنا ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی حضرات صحابہؓ کی صحیح تھی
جو يزيد کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے، جس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں :

(۱) حضرت معاویہؓ نے تو بے شک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ
خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا، لیکن ان کا عمل ایک ایسی نظیر بن گیا
جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ناجائز قائدہ اٹھایا، انہوں نے اس کی

آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظام شوریٰ کو درہم برہم کر ڈالا۔ اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خانوارے میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

(۲) بلاشبہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں یزید کا فسق و فجور کسی قابل اعتماد روایت سے ثابت نہیں اس لئے اس کو خلافت کا اہل تو سمجھا جاسکتا تھا، لیکن امت میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی جو نہ صرف دیانت و تقویٰ بلکہ ملکی انتظام اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے بھی یزید کے مقابلے میں بہ درجہ بلند مقام رکھتے تھے، اگر خلافت کی ذمہ داری ان کو سونپی جاتی تو بلاشبہ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر اہل ثابت ہوتے۔

یہ درست ہے کہ افضل کی موجودگی میں غیر افضل کو خلیفہ بنانا شرعاً جائز ہے، (بشرطیکہ اس میں شرائط خلافت موجود ہوں) لیکن افضل یہی ہے کہ خلیفہ ایسے شخص کو بنایا جائے جو تمام امت میں اس منصب کا سب سے زیادہ لائق ہو۔

(۳) نیک نیچی کے ساتھ بیٹے کو ولی عہد بنانا بھی شرعاً جائز تو ہے، لیکن ایک طرف موضع تمت ہونے کی وجہ سے اس سے بچنا ہی بہتر ہے، اور شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنا اپنے آپ کو ایک سخت آزمائش میں ڈالنا ہے، اسی لئے تمام خلفاء راشدین نے اس سے پرہیز کیا۔ خاص طور سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے تو لوگوں کے کہنے کے باوجود اپنے قابل اور لائق فرزندوں کو ولی عہد بنانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

یزید اور اس کی ولی عہدی کے سلسلہ میں ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے، جمہور امت کے معتدل اور محقق علماء کا یہی مسلک ہے، قاضی ابو بکر بن عربی مالکیؒ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو جائز قرار دینے کے ساتھ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں :

لے الماوردی: الاحکام السلطانیہ ص ۶، المطبعت المحمودیہ مصر، ابو یعلیٰ القراء: الاحکام السلطانیہ ص ۷
مصطفیٰ البابی ۱۳۵۶ھ و ابن العربی: العواصم من القواصم ص ۲۸، السلفیۃ ۱۳۷۱ھ و ابن اللھام:
المسیرۃ ص ۱۳۶ و ۱۳۷، دارالعلوم دیوبند ۱۳۷۷ھ

۲۔ الجبری ص ۲۹۲ ج ۳ و ص ۱۱۳ و ۱۱۴ ج ۳، مطبعت الاستقانت، القاہرہ ۱۳۵۸ھ

ان معاویۃ ترک الافضل فی ان يجعلها شورى، والا یخص بها
احدا من قرانیه فکیف ولداً وان یقتدی بما اشار به عبداللہ ابن
الزبیر فی الترمک والفضل

بلاشبہ افضل یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ خلافت کے معاملے کو شوریٰ کے سپرد
کردیتے اور اپنے کسی رشتہ دار اور خاص طور سے بیٹے کے لئے اس کو
مخصوص نہ کرتے اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کو جو مشورہ دیا تھا،
ولی عمد بنانے یا نہ بنانے میں اسی پر عمل کرتے، لیکن انہوں نے اس
افضل کام کو چھوڑ دیا۔

اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

کان معاویۃ لما صالح الحسن عهد للحسن بالامر من بعده
فلما مات الحسن قوی امر یزید عند معاویۃ وراى انه لنالک
اهلا وداک من شنة محبة الوالد لو لندو لما کان یتوسم فیہ من
النجابة الننیویۃ و حیما اولاد الملوک و معرفتهم بالحروب و
ترتیب الملک و القیام بابہم و کان ظن ان لا یقوم احد من
ابناء الصحابة فی هذا المعنی ولہذا قال لعبد اللہ بن عمر
فیما خاطبه به انی خفت ان افر الرعیۃ من بعدی کالغنم
المظیرۃ لیس لہا راع ۱۱

”جب حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے صلح کی تھی تو انہی کو اپنا ولی
عہد بھی بتایا تھا، لیکن جب ان کی وفات ہو گئی تو یزید کی طرف حضرت
معاویہ کا رجحان قوی ہو گیا، ان کی رائے یہ تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے،
اور یہ رائے باپ بیٹے کی شدید محبت کی وجہ سے تھی، نیز اس لئے تھی کہ
وہ یزید میں دنیوی نجات اور شاہزادوں کی سی خصوصیت، فنون جنگ سے
واقفیت، انتظام سلطنت اور اس کی ذمہ داری پورا کرنے کے صلاحیت

۱ العواصم من القواصم ص ۲۲۲

۲ البدایہ و النہایہ ص ۸۰ ج ۸

دیکھتے تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کے صاحبزادوں میں سے کوئی اس اعتبار سے بہتر انتظام نہ کر سکے گا، اسی لئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے خوف ہے کہ میں عوام کو بکریوں کے منتشر گلے کی طرح چھوڑ کر نہ چلا جاؤں جس کا کوئی پرواہ نہ ہو۔

اور علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

یزید کے بارے میں لوگوں کے دو فریق ہیں، اور کچھ لوگ بیچ کی رائے رکھتے ہیں، بعض لوگوں کا اعتقاد تو یہ ہے کہ وہ صحابہ یا خلفائے راشدین یا انبیاء میں تھا، یہ اعتقاد بالکل باطل ہے اور کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ اور اس کا اصل مقصد اپنے کافر رشتہ داروں کا بدلہ لینا تھا۔ یہ دونوں قول باطل ہیں، ہر عقلمند انسان ان اقوال کو باطل سمجھے گا۔

اس لئے کہ یہ شخص (یزید) مسلمان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اور شاہی طرز کے خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا، نہ وہ ایسا تھا (جیسے پہلے گروہ نے کہا) اور نہ ویسا (جیسا دوسرے گروہ نے کہا)۔

اور علامہ ابن خلدونؒ لکھتے ہیں :

”حضرت معاویہؓ کے دل میں دوسروں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کو دل محمد بنانے کا جو داعیہ پیدا ہوا اس کی وجہ امت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی، بنو امیہ کے اہل حل و عقد اس پر متفق ہو گئے تھے، کیونکہ وہ اس وقت اپنے علاوہ کسی اور پر راضی نہ ہوتے۔ اور اس وقت قریش کی سرر آوردہ جماعت وہی تھی، اور اہل ملت کی اکثریت ان ہی میں سے تھی، اس لئے

ابن تیمیہ: منہاج السنۃ ص ۲۳۶ و ۲۳۷ ج ۲ بولاق مہر ۱۳۲۱ھ عبارت یہ ہے:

الناس فی یزید طرفان ووسط قوم یعتقدون انہ من الصحابة او من الخلفاء الراشدين المہدین او من الانبیاء و ہذا کلمہ باطل و قوم یعتقدون انہ کافر منافق فی الباطن و انہ کان نہ فصفاً اخذناہ کفار قاریہ من اہل المینتہ و بنی ہاشم۔ و کلا القولین باطل یعلم بطلانہ کل عاقل فان الرجل ملک من منوک المسلمین و خلیفۃ من الخلفاء الملوک لا ہذا ولا ہذا

حضرت معاویہؓ نے اس کو ترجیح دی اور افضل سے غیر افضل کی طرف رجوع کیا... حضرت معاویہؓ کی عدالت اور صحابیت اس کے سوا کچھ اور گمان کرنے سے مانع ہے۔^۱

اصل میں جمہور امت کا طرز عمل صحابہ کرامؓ کے بارے میں ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اگر ان کے کسی فعل کی کوئی ایسی توجیہ ہو سکتی ہو جو صحابیت کے مقام بلند اور ان کی مجموعی سیرت کے شایان شان ہو تو ان کے فعل کو اسی توجیہ پر محمول کیا جاتا ہے مولانا مودودی صاحب بھی اصولی طور پر اس طریق کار کو درست قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

تمام بزرگان دین کے معاملے میں عموماً اور صحابہ کرام کے معاملہ میں خصوصاً میرا طرز عمل یہ ہے کہ جہاں تک معقول تاویل سے یا کسی معتبر روایت کی مدد سے ان کے کسی قول یا عمل کی صحیح تعبیر ممکن ہو، اسی کو اختیار کیا جائے اور اس کو غلط قرار دینے کی جسارت اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اس کے سوا چارہ نہ رہے۔“

(خلافت و ملوکیت ص: ۳۰۸)

سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا بحث کے بعد یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اقدام کی ”معقول تاویل“ ممکن ہے اور بقول مولانا مودودی صاحب ”لیپ پوت“ یا ”بھونڈی وکالت“ کے بغیر ان کے اس عمل کو نیک نیتی پر محمول کیا جاسکتا ہے اور جب صورتحال یہ ہے تو خود مولانا کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں انہیں ”بدنیت“ اور ”مغادر پرست“ قرار دینا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

خلافت یزید کے بارے میں صحابہؓ کے مختلف نظریات

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ

یزید کو ولی عہد بنانے کی ابتدائی تحریک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے ہوئی تھی، جناب مولانا مودودی صاحب نے اس تحریک کو بھی حضرت مغیرہؓ کے ذاتی مفاد پر مبنی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”اس تجویز کی ابتداء حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے ہوئی حضرت معاویہؓ انہیں کوفہ کو گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہیں اس کی خبر مل گئی۔ فوراً کوفہ سے دمشق پہنچے اور یزید سے مل کر کہا کہ ”صحابہ اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیرالمومنین تمہارے لئے بیعت لے لینے میں تامل کیوں کر رہے ہیں۔“ یزید نے اس بات کا ذکر اپنے والد ماجد سے کیا۔ انہوں نے حضرت مغیرہؓ کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ جو تم نے یزید سے کہی، حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا ”امیرالمومنین آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتل عثمان کے بعد کیسے کیسے خون خرابے ہوئے اب بہتر یہی ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف نہ ہو“ حضرت معاویہؓ نے پوچھا ”اس کام کو پورا کرنے

کی ذمہ داری کون لیگا؟“

انہوں نے کہا ”اہل کوفہ کو میں سنبھال لوں گا اور اہل بصرہ کو زیادہ“ یہ بات کر کے حضرت مغیرہ کوفہ آئے اور تیس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دے کر اس بات پر راضی کیا..... الخ“ (ص ۱۳۸، ۱۳۹)

مولانا نے یہ قصہ کامل ابن اثیر سے نقل کیا ہے اور ساتھ البدایہ اور ابن خلدونؒ کا حوالہ دے کر یہ کہا ہے کہ ان میں بھی اس واقعے کے بعض حصوں کا ذکر ہے، واقعہ یہ ہے کہ البدایہ اور ابن خلدون میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی بناء پر حضرت مغیرہؓ کی اس تجویز کو ذاتی مفاد پر مبنی قرار دیا جائے۔ ہم یہاں ابن خلدون کی عبارت نقل کر دیتے ہیں جو انہوں نے طبری کے حوالہ سے لی ہے اور البدایہ والنہایہ میں بھی واقعہ کم و بیش اسی طرح نقل کیا گیا ہے :

”حضرت مغیرہؓ حضرت معاویہؓ کے پاس آئے اور ان سے اپنے ضعف کی شکایت کر کے (گور نری سے) استعفیٰ دے دیا۔ حضرت معاویہؓ نے اسے منظور کر لیا اور حضرت سعید بن العاص کو ان کی جگہ گور نری بنانے کا ارادہ کیا، مغیرہؓ کے ساتھیوں نے ان سے کہا کہ معاویہؓ آپ سے ناراض ہو گئے ہیں، انہوں نے کہا ”ذرا ٹھہرو“ پھر وہ بڑید کے پاس پہنچ گئے اور اسکے سامنے بیعت کا معاملہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکابر صحابہ اور قریش کے بڑے لوگ رخصت ہو چکے ہیں..... الخ“

طبریؒ حافظ ابن کثیرؒ اور ابن خلدونؒ کے بیانات سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کو از خود معزول نہیں کیا تھا، بلکہ خود حضرت مغیرہؓ نے اپنے ضعف کی بناء پر استعفاء پیش کیا تھا۔ تاریخ کے اولین ماخذ میں تو واقعہ صرف اتنا ہی لکھا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت مغیرہؓ کو گور نری کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ وہ اسکے لئے امت

لہ ابن خلدون ص ۳۳ ج ۳۔ بیروت ۱۹۵۷ء عہدت یہ ہے:

ذکر الطبری بسندہ قال قدم المغيرة على معاوية فشكا اليه الضعف فاستعفاه فاعفاه و اراد ان يولي سعید بن العاص وقال اصحاب المغيرة للمغيرة ان معاوية فلاك فقال لهم رويدنا ونهض الي برید و عرض بالبيعة وقال ذهب اعيان الصحابة وكبراء قریش... الخ

محمدیہ کے مفاد کو قربان کر سکتے تھے تو انہوں نے خود آکر استعفاء کیوں پیش کیا؟ اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے جو علامہ ابن اثیرؒ اور مولانا مودودی صاحب نے دیا ہے، وہ یہ ہے کہ درحقیقت یہ استعفاء بھی اپنی قیمت بڑھانے کی ایک چال تھی۔ انہیں پہلے یہ معلوم ہو چکا ہو گا کہ حضرت معاویہؓ کسی وجہ سے ان کو معزول کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا انہوں نے یزید کی ولی عہدی کو آڑ بنا کر حضرت معاویہؓ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہی مگر یہ سمجھا کہ اگر بحالات موجودہ یہ رائے پیش کروں گا تو حضرت معاویہؓ سمجھ جائیں گے کہ یہ تجویز محض گورنری بچانے کے لئے پیش کی جا رہی ہے، اس لئے انہوں نے پہلے مصنوعی طور پر استعفاء پیش کر دیا تاکہ لوگوں پر اور خود حضرت معاویہؓ پر واضح ہو جائے کہ میں ان کا سچا خیر خواہ ہوں اور پھر وہ زبردستی مجھے گورنر بنا دیں گے۔

اور دوسرا جواب اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے واقعہ خلوص کے ساتھ اپنے ضعف کی بناء پر استعفاء پیش کیا تھا لیکن جب حضرت معاویہؓ نے کچھ کئے بغیر استعفاء منظور کر کے دوسرے کو گورنر بنانے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے ان سے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تمہارے استعفاء دینے سے امیر المومنین ناراض ہو گئے ہیں (جیسا کہ پرانے ماتحت کے اچانک استعفاء دے دینے سے عموماً افسر بالا کو گرائی ہوا کرتی ہے) اس پر حضرت مغیرہؓ نے حضرت معاویہؓ پر یہ واضح کرنا چاہا کہ میں نے کسی رجسٹریٹ کے امور سے عدم دلچسپی کی بناء پر استعفاء نہیں دیا، بلکہ ضعف کی بناء پر استعفاء دیا ہے۔ درمہ جہاں تک امت کے اجتماعی امور کا تعلق ہے ان سے میری دلچسپی اب بھی برقرار ہے جس کا عمل ثبوت یہ ہے کہ میں حضرت معاویہؓ کے بعد یزید کو ولی عہد بنانا چاہتا ہوں، جو میری نظر میں خلافت کا اہل ہے اور اس کی ولی عہدی میرے خیال میں امت کو افتراق سے بچا سکتی ہے۔ اور اگر اس مقصد کے لئے مجھے دوبارہ گورنری کی ضرورت پیش آئی تو میں یہ خدمت دوبارہ انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔

اس واقعہ کی جو عبارت طبریؒ حافظ ابن کثیرؒ اور ابن خلدونؒ نے نقل کی ہے، اس میں واقعے کی ان دونوں توجیہات کی یکساں گنجائش ہے۔ یہ عبارتیں نہ پہلے مفہوم میں صریح ہیں نہ دوسرے مفہوم میں، بلکہ پہلے مفہوم پر بھی کچھ عقلی اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں، اور دوسرے مفہوم پر بھی اور دونوں ہی صورتوں میں واقعے کے مبہم خلاء کو قیاسات سے پر کرنا

پڑتا ہے۔

اب یہ فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ علامہ ابن اثیرؒ اور مولانا مودودی صاحب کو غلطی سے میراث ثابت کرنے کے لئے پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں جو حضرت مغیرہؓ کے ساتھ بدگمانی ہی بدگمانی پر مبنی ہے یا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی جلالت شان اور صحابیت کے مقام بلند کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوسرے مفہوم کو اختیار کرتے ہیں جو ہر طرح ان کے شایان شان ہے۔ خود ہمارا ضمیر تو یہ کہتا ہے کہ جس صحابی کی ساری زندگی اسلام کی خدمت میں گزری ہو، جو غزوہٴ حدیبیہ کے ان خوش نصیب مجاہدین میں شامل ہو جن سے خوش ہونے کا اعلان خود اللہ نے کر دیا ہے۔ جس نے اپنی آنکھ غزوہٴ یرموک کے مقدس معرکے میں اللہ کے لئے قربان کر دی ہو۔ جس نے جنگ قادسیہ کے موقع پر پوری امت مسلمہ کا نمائندہ بن کر اپنی قوت ایمانی سے کسریٰ کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا ہو۔ جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سو چھتیس احادیث روایت کی ہوں۔ تہ اور جو اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اقتدار کی حالت میں گزار کر جاہ و منصب سے سیر ہو چکا ہو وہ محض اپنے اقتدار کی مدت کو کچھ اور بڑھانے کے لئے جھوٹ، فریب، مکر، رشوت، ضمیر فروشی اور امت محمدیہؐ سے غداری جیسے سنگین اور گھناؤنے جرائم کا ارتکاب نہیں کر سکتا، اس لئے اس تاریخی قصے کی وہ تعبیر بالکل غلط ہے جو علامہ ابن اثیرؒ اور مولانا مودودی صاحب نے اختیار کی ہے۔

اس واقعے کی اصل حقیقت اور اس کی تعبیر و تشریح کے دونوں رخ ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ اب ہم خود مولانا مودودی صاحب ہی کے الفاظ نقل کئے دیتے ہیں جو حضرت علیؓ کے بارے میں انہوں نے لکھے ہیں :

”کسی کا جی چاہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔

تاریخ کے صفحات تو بہر حال اس سے آلودہ ہی ہیں، مگر ساتھ ہی پھر یہ ماننا

۱۔ تہذیب التہذیب ص ۲۶۳ ج ۱۰ و ابن سعد ص ۲۰ ج ۶ جزو ۱

۲۔ ابن سعد ص ۲۰ ج ۶ جزو ۱

۳۔ البدایہ و النہایہ ص ۳۹ ج ۷

۴۔ النورانی تہذیب الاسماء و اللغات ص ۱۰۹ ج ۱ جزو ۲ ادارۃ الباعثہ النیریہ مصر

پڑے گا کہ خاکم بدہن رسالت کا دعویٰ محض ڈھونگ تھا، قرآن شاعرانہ
الفاظی کے سوا کچھ نہ تھا اور تقدس کی ساری داستانیں خالص ریاکاری کی
داستانیں تھیں۔“

اور....

”ہم خواہ مخواہ کسی کے ساتھ بحث و مناظرہ میں نہیں الجھنا چاہتے ہم نے یہ
دونوں تصویریں پیش کر دی ہیں۔ اب ہر صاحب عقل کو خود سوچنا چاہیے
کہ ان میں کون سی تصویر مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل
بیت و اصحاب کبار کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اگر پہلی تصویر
کو کسی کا دل رہ بھتا ہے تو ترجمے، مگر اس کے ساتھ امیدواری و دعویٰ داری
کا مسئلہ ہی نہیں پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہو جائیگا۔“

یزید کی بیعت کے سلسلے میں ”بدعنوانیاں“

مولانا مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کی بیعت کے سلسلے میں
خوف و طمع کے ذرائع سے کام لیا، اس لئے مختصر ان روایات کے بارے میں بھی چند مختصر
باتیں ذہن نشین کر لیجئے۔ جن سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے تاریخ میں جو روایات اس سلسلے
میں ملتی ہیں وہ تین قسم کی ہیں، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے بیعت یزید پر جبر
و اکراہ کیا۔ دوسری وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس معاملے میں مکرو و فریب
سے کام لیا تیسری وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے لوگوں کو
رشوت دی۔

جہاں تک جبر و اکراہ کا تعلق ہے یہ صرف کامل ابن اشیر کی ایک روایت سے معلوم
ہوتا ہے جو مولانا مودودی صاحب نے نقل کی ہے۔ یعنی یہ کہ حضرت معاویہؓ نے بیعت یزید
کے مخالف صحابہؓ سے کہا کہ ”اگر تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی
کہا تو دوسری بات اس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی تلوار اس کے سر پہلے پڑ چکی

ہوگی۔“ لیکن یہ روایت صرف کامل ابن اثیرؒ کی ہے۔ جو انہوں نے حسب عادت بغیر سند کے ذکر کی ہے۔ طبریؒ میں بھی جو ابن اثیرؒ کا سب سے بڑا ماخذ ہے اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے برعکس مشہور مورخ احمد الیعقوبیؒ حضرت معاویہؓ کے اسی سفر کا ذکر کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں۔

وَجِجَ مَعَاوِيَةَ نَلِكُ السَّنَةِ فَنَالَفَ الْقَوْمَ وَلَمْ يَكْرِهَهُمْ عَلَى
الْبَيْعَةِ

اور حضرت معاویہؓ نے اس سال حج کیا تو لوگوں کی دلداری کی اور (یزید کی بیعت پر انہیں مجبور نہیں کیا)۔

واضح رہے کہ یعقوبیؒ وہ مورخ ہیں جن کا شیعہ ہونا بہت مشہور ہے، اس کے باوجود وہ حضرت معاویہؓ سے بیعت یزید کے سلسلے میں جبراً کراہ کی صراحتاً تردید کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ کون سی معقول وجہ ہے جس کی بناء پر ابن اثیرؒ کی روایت کو قبول کیا جائے اور یعقوبیؒ کی اس روایت کو چھوڑ دیا جائے؟

رہ گئی یہ بات کہ حضرت معاویہؓ نے اس معاملے میں (معاذ اللہ) مکرو فریب سے کام لیا ہو۔ یہ بات طبریؒ نے اس طرح نقل کی ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ اور دوسرے ان صحابہؓ سے الگ الگ لے جو یزید کی ولی عہدی کے مخالف تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک سے کہا کہ ”یزید کے مخالفین کے پیڑر آپ ہیں، آپ نے بیعت کر لی تو سب کر لیں گے“ لیکن اس روایت کا راوی کون ہے؟ طبریؒ فرماتے ہیں۔

رجل بنخلۃ

مقام نجد کا ایک شخص

کچھ پتہ نہیں کہ یہ شخص کون ہے؟ کافر ہے یا مسلمان؟ یا سبائی اور منافق؟ سچا ہے یا جھوٹا؟ آخر اس جیسی روایات کی بنیاد پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کیسے اتنا بڑا الزام کر دیا جائے؟

۱۔ تاریخ الیعقوبیؒ ص ۲۲۹ ج ۲ دار صادر بیروت ۱۳۷۹ھ

۲۔ البربریؒ ص ۲۲۵ ج ۲

آخری اعتراض یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے رشوتیں دے دے کر لوگوں کو اس بیعت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ مولانا موودوی صاحب لکھتے ہیں :

”حضرت مغیرہؓ کو فہ آئے اور دس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دیکر اس بات پر راضی کیا کہ ایک وفد کی صورت میں حضرت معاویہؓ کے پاس جائیں اور یزید کی ولی عہدی کے لئے ان سے کہیں، یہ وفد حضرت مغیرہؓ کے بیٹے موسیٰ بن مغیرہ کی سرکردگی میں دمشق گیا اور اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ بعد میں حضرت معاویہؓ نے موسیٰ کو الگ بلا کر پوچھا ”تمہارے باپ نے ان لوگوں سے کتنے میں ان کا دین خریدا ہے؟“ انہوں نے کہا تیس ہزار درہم میں، حضرت معاویہؓ نے کہا ”تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے“

رشوت کی یہ روایتیں بھی صرف کامل ابن اثیر میں بغیر کسی سند اور حوالہ کے نقل کی گئی ہیں۔ ابن جریر طبریؒ جو علامہ ابن اثیرؒ کا سب سے بڑا ماخذ ہے، اس میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں، اور حافظ ابن کثیرؒ ان کے بعد آئے ہیں، اور بقول مولانا موودوی صاحب ”وہ اتنے شدید ہیں کہ تاریخ نگاری میں واقعات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے“، وہ بھی اس تیس ہزار درہم کے قصے کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں دیتے۔ اگر ایسی غیر مستند اور بے حوالہ روایتوں کی بنیاد پر ایک صحابی کو رشوت دینے کا ملزم قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر ایک حضرت معاویہؓ ہی کا نہیں تمام صحابہ کرام بلکہ انبیاء علیہم السلام تک کا کردار داغدار دکھایا جا سکتا ہے اور پھر ملوکیت کی جو تصویر مولانا موودوی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے عہد کے بارے میں دکھائی ہے کوئی اور ”محقق“ اس کی ابتداء اس سے پہلے بھی خلافت راشدہ کے عہد سے کر سکتا ہے۔ اسی کامل ابن اثیرؒ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار کی خوبصورت بیوی سے نکاح کرنے کے لئے اسے پے در پے کئی خطرناک محاذوں پر صرف اس لئے بھیجا کہ وہ قتل ہو جائے اور جب وہ مارا گیا تو اس کی بیوی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا، اور اسی میں کئی مقامات پر حضرت علیؓ کی تصویر اس طرح پیش کی گئی

۱۔ خلافت و ملوکیت ص ۳۱۵

۲۔ کامل ابن اثیر ص ۷۷ ج ۱

ہے جیسے (معاذ اللہ) ان کی ساری عمر عمدہ خلافت کی آرزو میں بیتاب ہوئے گذری تھی۔^۱ اس پہلو کو ہم آگے قدرے تفصیل کے ساتھ واضح کریں گے ان تاریخی روایات کی حیثیت کیا ہے؟ اور علمی مباحث میں ان سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت حسینؓ کا موقف

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یزید کی ولی عمدی نیک نیتی کے ساتھ عمل میں آئی تھی اور وہ کھلا فاسق و فاجر نہیں تھا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف خروج کیوں کیا؟ یہ سوال اگرچہ ہمارے موضوع زیر بحث سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا، لیکن چونکہ اس معاملے میں ایک دوسرے گروہ نے دوسری انتہاء پر پہنچ کر حضرت حسینؓ پر اعتراضات و الزامات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے،^۲ اس لئے یہاں تفصیل میں جائے بغیر نہایت اختصار کے ساتھ حضرت حسینؓ کا وہ موقف بھی پیش کر دیتے ہیں جو ہم نے سمجھا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، علماء کا راجح قول یہ ہے کہ ولی عمد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے اور خلیفہ کی وفات کے بعد امت کے ارباب حل و عقد کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو ولی عمد ہی کو خلیفہ بنائیں اور چاہیں تو باہمی مشورے سے کسی اور کو خلیفہ مقرر کر دیں۔ لہذا حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید کی خلافت اس وقت تک منعقد نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ امت کے ارباب حل و عقد اسے منظور نہ کر لیں۔

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بذات خود شروع ہی سے یزید کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے، یہ ان کی دیانتدارانہ رائے تھی۔ جب حضرت معاویہؓ کی وفات ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ حجاز کے اکابر اور اہل حل و عقد نے جن میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ وغیرہ شامل تھے، ابھی تک یزید کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا، ادھر عراق سے ان کے پاس خطوط کا انبار لگ گیا جس سے واضح ہوتا تھا کہ اہل عراق بھی یزید کی خلافت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں وہاں کے لوگ مسلسل انہیں یہ لکھ رہے تھے کہ

^۱ مثال کے طور پر دیکھئے ص ۳۷ ج ۳

^۲ جناب محمود احمد عباسی: خلافت معاویہ و یزید اور تحقیق مزید

ہمارا کوئی امام نہیں ہے اور ہم نے ابھی تک کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ لہٰذا ان حالات میں ان کا موقف یہ تھا کہ صرف اہل شام کی بیعت پوری امت پر لازم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس کی خلافت ابھی منعقد ہی نہیں ہوئی اس کے باوجود وہ پورے عالم اسلام پر بزور متصرف ہونا چاہ رہا ہے تو اس کی حیثیت ایک ایسے سلطان متغلب کی سی ہے جو غلبہ پانا چاہتا ہے مگر ابھی پانہیں سکا۔ ایسی حالت میں اس کے غلبہ کو روکنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے اور اسی لئے انہوں نے پہلے حالات کی تحقیق کے لئے حضرت مسلم بن عقیلؓ کو روانہ کیا تاکہ صحیح صورتحال معلوم ہو سکے۔ لہٰذا کوفہ کی طرف ان کا کوچ فقہی نقطہ نظر سے بغاوت کے لئے نہیں تھا بلکہ ایک متغلب کے غلبہ کو روکنے کے لئے تھا۔ اگر ان کی نظر میں صورتحال یہ ہوتی کہ یزید پورے عالم اسلام پر بزور قابض ہو چکا ہے اور اس کا تسلط مکمل ہو گیا ہے، تب بھی وہ بہ حالت مجبوری احکام شریعت کے مطابق یزید کو سلطان متغلب تسلیم کر کے خاموش ہو جاتے، لیکن ان کی نظر میں صورت حال یہ تھی کہ یزید کا تسلط ابھی مکمل نہیں ہوا، اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کے اقتدار کو ابھی روکا جاسکتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جب کوفہ کے قریب پہنچنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ کوفہ کے لوگوں نے غداری کی ہے اور یزید کا تسلط وہاں پر مکمل ہو گیا ہے تو انہوں نے وہ تین مشہور تجاویز پیش نہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ :

اما ان اصعب بنی فسی ید یزیدؓ

یا پھر میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دوں گا۔

اس کا صاف مطلب ہی یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ یزید کا تسلط پوری طرح قائم ہو چکا ہے تو سلطان متغلب کی حیثیت سے وہ اس کے ہاتھ پر بیعت کے لئے رضامند ہو گئے تھے، لیکن عبید اللہ بن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن کے مشورے پر عمل کر کے ان کی کسی بات کو نہ مانا اور اس بات پر اصرار کیا کہ وہ غیر مشروط طور

۱۔ الطبریؒ: ص ۲۳۳ ج ۳۔ والہدایہ ص ۱۵۱ و ۱۵۲ ج ۸ و الیعقوبی ص ۲۳۲ ج ۲ والامت والسیاست۔

۲۔ الطبریؒ ص ۳۱۳ ج ۳، الہدایہ والنہایہ ص ۱۷۵ ج ۸ وغیرہ میں بھی اس تجویز کا ذکر ہے ایک راوی کا کہنا ہے کہ حضرت حسینؑ نے یہ تجویز پیش نہیں کی لیکن اس کے مقابلے میں وہ روایات زیادہ ہیں جن میں اس تجویز کا ذکر کیا گیا ہے۔

پر عبید اللہ بن زیاد کے پاس حاضری دیں۔ ظاہر ہے کہ عبید اللہ بن زیاد کی اس نامعقول بات کو ماننا حضرت حسین پر لازم نہیں تھا اور وہ اس میں اپنی جان کا خطرہ سمجھتے تھے، اس لئے بالآخر انہیں مقابلہ کرنا پڑا۔ اور کربلا کا المیہ پیش آکر رہا۔

جہاں تک یزید کا تعلق ہے، یہ بالکل درست ہے کہ کسی بھی معتبر روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے خود حضرت حسینؑ کو شہید کیا یا انہیں شہید کرنے کا حکم دیا بلکہ بعض روایات سے یہ ثابت ہے کہ اس نے آپ کی شہادت پر افسوس کا اظہار کیا اور عبید اللہ بن زیاد کو اپنی مجلس میں برا بھلا کہا۔ لیکن اس کی یہ غلطی ناقابل انکار ہے کہ اس نے عبید اللہ بن زیاد کو اس سنگین جرم پر کوئی سزا نہیں دی۔ لہذا مولانا مودودی صاحب نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ:

”ہم یہی روایت صحیح مان لیتے ہیں کہ وہ حضرت حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے سرد کچھ کر آبدیہ ہو گیا اور اس نے کہا کہ ”میں حسینؑ کے قتل کے بغیر بھی تم لوگوں کی طاعت سے راضی تھا“ اللہ کی لعنت ہو ابن زیاد پر، خدا کی قسم اگر میں وہاں ہوتا تو حسینؑ کو معاف کر دیتا“ اور یہ کہ ”خدا کی قسم اے حسینؑ میں تمہارے مقابلے میں ہوتا تو میں تمہیں قتل نہ کرتا“ پھر بھی یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ اس ظلم عظیم پر اس نے اپنے سر پھرے گورنر کو کیا سزا دی؟ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس نے ابن زیاد کو نہ کوئی سزا دی نہ اسے معزول کیا، نہ اسے ملامت ہی کا کوئی خط لکھا۔“

چند اصولی مباحث

اس مقالہ میں ہمیں ”خلافت و ملوکیت“ کی جن جزئیات پر گفتگو کرنی تھی وہ پوری ہو گئیں اب ہم وعدہ کے مطابق چند اصولی مسائل پر مختصر بحث کریں گے۔

عدالت صحابہؓ کا مسئلہ :

مولانا مودودی صاحب کی کتاب ”خلافت و ملوکیت“ کو جس وجہ سے سب زیادہ تنقید کا نشانہ بنا پڑا ہے اور جس وجہ سے سنجیدہ علمی حلقوں نے بھی اس کی تردید کرنا ضروری سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اگر اس کتاب کے ان مندرجات کو درست مان لیا جائے جو خاص طور سے حضرت معاویہؓ سے متعلق ہیں تو اس سے عدالت صحابہؓ کا وہ بنیادی عقیدہ مجروح ہوتا ہے جو اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے اور جسے مولانا مودودی صاحب بھی اصولی طور پر درست مانتے ہیں۔ مولانا نے اپنی کتاب کے ضمیمے میں یہ سوال اٹھا کر تقریباً پانچ صفحات میں اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے ان کی اس بحث کو بار بار بنظرِ غائر پڑھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے اصل زیر بحث سوال بالکل حل نہیں ہوتا۔ مولانا نے ”اصحابہ کلمہ عدول“ (تمام صحابہؓ عادل ہیں) کو اصولی طور پر اپنا عقیدہ قرار دے کر یہ لکھا ہے کہ اس عقیدے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ صحابہؓ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ روایت حدیث میں انہوں نے پوری دیانت اور ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی شخص سے کوئی کام عدالت کے منافی سرزد ہونے کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ صفت عدالت اس سے بالکل مستغنی ہو جائے اور ہم سرے سے اس کے عادل ہونے ہی کی نفی کر دیں اور وہ روایت حدیث کے معاملے میں ناقابلِ اعتماد ٹھہرے؟ میرا جواب یہ ہے کہ کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر گزرنے

سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عدالت کی کلی نفی ہو جائے اور وہ عادل کے بجائے فاسق قرار پائے در آنحالیکہ اس کی زندگی میں مجموعی طور پر عدالت پائی جاتی ہو۔“

لیکن اس گفتگو میں مولانا نے اس بحث کو صاف نہیں فرمایا، عقلی طور پر عدالت صحابہؓ کے تین مفہوم ہو سکتے ہیں :-

- ۱۔ صحابہ کرامؓ معصوم اور غلطیوں سے بالکل پاک ہیں۔
- ۲۔ صحابہ کرامؓ اپنی عملی زندگی میں ”معاذ اللہ“ فاسق ہو سکتے ہیں، لیکن روایت حدیث کے معاملہ میں وہ بالکل عادل ہیں۔
- ۳۔ صحابہ کرامؓ نہ تو معصوم تھے اور نہ فاسق یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی سے بعض مرتبہ بتقاضائے شریعت ”دو ایک یا چند“ غلطیاں سرزد ہو گئی ہوں، لیکن حنبہ کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور اللہ نے انہیں معاف فرمادیا۔ اس لئے وہ ان غلطیوں کی بناء پر فاسق نہیں ہوئے۔ چنانچہ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی صحابی نے گناہوں کو اپنی ”پالیسی“ بنا لیا ہو جس کی وجہ سے اسے فاسق قرار دیا جاسکے۔

اصل سوال یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب ان میں سے کون سے مفہوم کو درست سمجھتے ہیں؟ پہلے مفہوم کو تو انہوں نے صراحتاً غلط کہا ہے اور جمہور اہل سنت بھی اسے غلط کہتے ہیں۔ اب آخری دو مفہوم رہ جاتے ہیں، مولانا نے یہ بات صاف نہیں کی ان میں سے کونسا مفہوم وہ درست سمجھتے ہیں؟ اگر ان کی مراد دو سرا مفہوم ہے یعنی یہ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صرف روایت حدیث کی حد تک عادل ہیں، ورنہ اپنی عملی زندگی میں وہ ”معاذ اللہ“ فاسق و فاجر بھی ہو سکتے ہیں تو یہ بات ناقابل بیان حد تک غلط اور خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی صحابی کو فاسق و فاجر مان لیا جائے تو آخر روایت حدیث کے معاملے میں اسے فرشتہ تسلیم کرنے کی کیا وجہ ہے؟ جو شخص اپنے ذاتی مفاد کے لئے جھوٹ، فریب، رشوت، خیانت اور غداری کا مرتکب ہو سکتا ہے وہ اپنے مفاد کے لئے جھوٹی حدیث کیوں نہیں گھڑ سکتا؟ روایت حدیث کے معاملے میں آپ اس کے اعتماد کو یہ کہہ کر کیسے بحال کر سکتے ہیں کہ :

”کبھی کسی فریق نے کوئی حدیث اپنے مطلب کے لئے اپنی طرف سے گھڑ

کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کی، نہ کسی صحیح حدیث کو اس بناء پر جھٹلایا کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف پڑتی ہے۔“
 ۵۔ اسی لئے تمام محدثین اس اصول کو مانتے آئے ہیں کہ جو شخص فاسق و فاجر ہو اس کی روایت صحیح نہیں ہوتی، ورنہ اگر روایات کو مسترد کرنے کے لئے یہ شرط لگادی جائے کہ راوی کا ہر روایت میں جھوٹ بولنا ثابت ہو تو شاید کوئی بھی روایت موضوع ثابت نہیں ہو سکے گی اور حدیث کے تمام راوی معتبر اور مستند ہو جائیں گے، خواہ وہ عملی زندگی میں کتنے ہی فاسق و فاجر ہوں۔

اور اگر مولانا مودودی صاحب عدالت صحابہؓ کو تیسرے مفہوم میں درست سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کی اوپر نقل کی ہوئی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے سو یہ مفہوم جمہور اہل سنت کے نزدیک درست ہے، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر انہوں نے جو اعتراضات اپنی کتاب میں کئے ہیں اگر ان کو درست مان لیا جائے تو عدالت کا یہ مفہوم ان پر صادق نہیں آسکتا۔ مولانا مودودی صاحب کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے :

- ۱۔ اپنے بیٹے کے لئے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لی۔ (ص ۱۳۸)
- ۲۔ اس غرض کے لئے رشوتیں دیں۔ (ص ۱۳۹-۱۵۰)
- ۳۔ مخالفین کو قتل کی دہمکیاں دے کر مجبور کیا۔ (ص ۱۵۳)
- ۴۔ حجر بن عدیؓ جیسے ”زاہد و عابد صحابی“ اور ان کے ساتھیوں کو محض ان کی حق گوئی کی وجہ سے قتل کیا۔ (ص ۱۶۳، ۱۶۵)
- ۵۔ مسلمان کو کافر کا وارث قرار دینے کی بدعت جاری کی۔ (ص ۱۷۳)
- ۶۔ دیت کے احکام میں بدعت جاری کر کے آدمی دیت خود اپنے ذاتی استعمال کے لئے یعنی شروع کر دی۔ (ص ۱۷۳)
- ۷۔ حضرت علیؓ پر خود برسر منبر سب و شتم کرنے کی بدعت جاری کی۔ (ص ۱۷۳)
- ۸۔ مال غنیمت کی تقسیم میں خیانت کر کے سونا چاندی اپنے استعمال میں لانے کا حکم دے دیا۔ (ص ۱۷۳)
- ۹۔ ”اپنے والد ماجد کی زنا کاری پر (جھوٹی) شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد ان ہی کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی قرار دے دیا۔“ (ص ۱۷۵)

۱۰۔ ”اپنے گورنروں کو قانون سے بالا تر قرار دے دیا۔“ (ص ۱۷۵)

۱۱۔ ان کے گورنروں نے (ان کی عملی رضامندی سے) مسلمان عورتوں کو کثیر بتایا اور ”یہ ساری کارروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے اور سیاسی معاملات میں شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں۔“

بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر یہ ”چارچ شیٹ“ درست ثابت ہو جائے تو اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ”معاذ اللہ“ فاسق۔ قرار پاتے ہیں یا نہیں؟ اگر فاسق قرار پاتے ہیں تو عدالت کا یہ تیسرا مفہوم جسے آپ درست مان کر آئے ہیں، ان پر کیسے صادق آ سکتا ہے؟ اور اگر وہ ان ”مکروہ بدعتوں“ اور ”قرآن و سنت کے احکام کی صریح خلاف ورزیوں“ کے باوجود فاسق نہیں ہیں تو آخر کیوں؟ جو شخص رشوت، جھوٹ، مکرو فریب، قتل نفس، اجراء بدعت، غلول (مال غنیمت میں خیانت)، جھوٹی گواہی، جھوٹی نسبت، اعانت ظلم اور دہشت (مسلمان عورتوں کی آموریزی پر عملاً راضی رہنا) جیسے سنگین اور گھناؤنے جرائم کا مجرم ہو اسے آخر کس بناء پر فسق کے الزام سے بری کیا جاسکتا ہے؟ ان تمام جرائم کا الزام اس کے سر تھوپنے کے بعد بات کو یہ کہہ کر کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے کہ :

”کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر

گذرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عدالت کی کلی نئی ہو جائے اور وہ

عادل کے بجائے فاسق قرار پائے“ (ص ۳۰۳)

کیا ان جرائم کو ”ایک دو یا چند گناہ“ کر گزرنے سے تعبیر کرنا اس ”لیپ پوت“ کی تعریف میں نہیں آتا جس سے مولانا موودوی صاحب بچنا چاہتے ہیں؟ جبکہ ان گناہوں میں سے ہر گناہ کبیرہ ہے، اس پر عذاب جہنم کی شدید وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اور خود مولانا موودوی صاحب کے کہنے کے مطابق یہ گناہ اتفاقی طور سے سرزد نہیں ہو گئے تھے، بلکہ باقاعدہ ”پالیسی“ بنا لیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا موودوی صاحب نے جو کچھ حضرت معاویہؓ کے بارے میں لکھا ہے، اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو انہیں ”فسق“ کے الزام سے بری قرار دینے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں، پھر تو لازماً یہ کہنا پڑے گا کہ ”معاذ اللہ“ وہ فاسق تھے، اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ”السماعیہ کلمہ عدول“ کا عقیدہ سلامت نہیں رہ سکتا۔ اور پھر اس ایک عقیدے

پر کیا موقوف ہے، احکام کے سارے عقائد اور سارے احکام ہی خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔

تاریخی روایات کا مسئلہ :

مولانا مودودی صاحب نے اپنی کتاب کے ٹھیسے میں اس پہلو پر بھی بحث کی ہے کہ جن تاریخی کتابوں کے حوالے سے انہوں نے روایات نقل کی ہیں، وہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں؟ انہوں نے حدیث اور تاریخ کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جرح و تعدیل کے معروف طریقے دراصل احکامی احادیث کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، اور تاریخی روایت کی اس معیار پر تحقیق شروع کی گئی تو تاریخ اسلام کا کم از کم ۹۰ حصہ ناقابل قبول ہو جائے گا۔

یہاں ہمیں دو گزارشیں کرنی ہیں :

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بات کتے وقت مولانا نے مسئلے کی صحیح نوعیت کو محسوس نہیں فرمایا، یہ مسئلہ جو اس وقت زیر بحث ہے، محض تاریخ کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ عقائد و کلام کا مسئلہ ہے، مشاجرات صحابہؓ میں کون حق پر تھا؟ کس سے کس قسم کی غلطی سرزد ہوئی؟ اور اس غلطی کا اثر عدالت صحابہؓ کے عقیدے پر کیا پڑتا ہے؟ یہ تمام مسائل عقائد کے مسائل ہیں، ساری امت ان مسائل کو عقائد کا جزو مانتی آئی ہے۔ علم عقائد و کلام کی کوئی کتاب ان سے خالی نہیں ہے۔ اور ان ہی مسائل کی بنیاد پر اسلام میں بہت سے فرقے پیدا ہو گئے ہیں، اور جب مولانا مودودی صاحب خود یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ احکام شریعت کا استنباط ان مجروح تاریخی روایات سے نہیں ہو سکتا تو عقائد کا معاملہ بہر حال بلند ہے، علماء کی تصریح کے مطابق صحیح بلکہ حسن خبر واحد سے بھی احکام کا استنباط ہو سکتا ہے، لیکن عقائد کے استنباط کے لئے نری خبر واحد بھی کافی نہیں ہوتی، ایسی صورت میں اس مسئلے کا فیصلہ ان مجروح تاریخی روایات کی بنیاد پر کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟ کیا کسی صحابی رسولؐ پر گناہ کبیرہ کا الزام عائد کرنا اتنی ہی معمولی بات ہے کہ اس کے کہنے والے کے بارے میں یہ تحقیق کرنے کی اجازت بھی نہ دی جائے کہ وہ کون تھا؟ اس کے عقائد کیسے تھے؟ اور وہ جھوٹا تھا یا سچا تھا؟

یہ بات صرف عقیدت اور محبت کی بنیاد پر نہیں کہی جا رہی، بلکہ یہ عقل کا فطری تقاضا ہے کہ جس شخص کی زندگی میں مجموعی طور سے خیر غالب ہو، اس پر کسی گناہ کبیرہ کا الزام اس

وقت تک درست تسلیم نہیں کیا جائے جب تک وہ مضبوط اور قوی دلائل سے صحیح ثابت نہ ہو چکا ہو۔ صحابہ کرام کا معاملہ تو بہت بلند ہے، ہم تو دیکھتے ہیں کہ تمام معقولیت پسند لوگ عام مسلمانوں کے بارے میں اسی طرز فکر کو ضروری سمجھتے ہیں، آسانی کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں:-

مولانا مودودی صاحب سے بہت سے مسائل میں اختلاف کے باوجود ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ اتنے باکردار ضرور ہیں کہ اپنا ضمیر بیچ کر ملک و ملت کی غداری پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ اب اگر کوئی شخص آکر یہ اطلاع دے کہ وہ (خدا نہ کردہ) ضمیر فروشی اور ملت کی غداری کے مرتکب ہوئے ہیں تو کیا اس خبر کی مکمل تحقیق کئے بغیر اس کی تصدیق کر لینا کسی معقولیت پسند انسان کا کام ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں! ہر حقیقت پسند انسان اس خبر کی تصدیق کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنی کو چاہئے کہ یہ خبر دینے والا کون ہے؟ اس نے کس سے یہ بات سنی ہے؟ بلا واسطہ سنی ہے یا بیچ میں کوئی واسطہ ہے؟ یہ واسطے کس حد تک قابل اعتماد ہیں اور ان میں کوئی شخص ایسا تو نہیں جو مولانا سے عناد رکھتا ہو؟ اگر تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو کہ یہ خبر دینے والے ناقابل اعتماد ہیں، یا ان میں سے کوئی ایک شخص افواہ طراز ہے، یا ان کا معاند ہے تو کیا پھر بھی اس خبر کو بنیاد بنا کر مولانا پر یہ عہمت لگانا قرن انصاف ہو گا؟ اور اگر یہ خبر کسی مستند اخبار میں چھپ جائے تو کیا اس کے بعد اس کے راویوں کی تحقیق ممنوع قرار پائیگی؟ اور جو شخص اس مطبوعہ خبر کی تردید کے لئے اس کے راویوں کے حالات کی چھان بین کرے کیا اسے یہ کہہ کر روکا جاسکے گا کہ اس اخبار کا ایڈیٹر ثقہ آدمی ہے، لہذا اس کی چھاپی ہوئی ہر خبر قابل تسلیم ہے؟ اور اگر کوئی شخص رپورٹوں کو ناقابل اعتماد قرار دے کر اس خبر کو جھٹلائے تو کیا اسے یہ طعنہ دیا جاسکے گا کہ اگر ان غیر معتبر رپورٹوں کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے تو اخبار کی کوئی خبر تسلیم کرنے کا تمہیں حق نہیں ہے کیونکہ اخبار کی تمام خبریں انہی رپورٹوں کی دی ہوئی ہیں؟

اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے، اور ظاہر ہے کہ نفی ہی میں ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ اور دوسرے صحابہؓ کے بارے میں یہ تحقیق ممنوع قرار پا جاتی ہے، اور جو شخص ان پر گناہ کبیرہ کا الزام لگائے والے راویوں کی تحقیق کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں، کھولنا چاہتا ہے وہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک گروں زدنی ہوتا ہے؟

مولانا مودودی صاحب نے اس فرق پر بہت زور دیا ہے جو حدیث اور تاریخ کے معیار استناد میں ان کے نزدیک ملحوظ رہنا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ واقدی، سیف بن عمر، کلبی اور ابو مخنف جیسے راوی ”حکامی احادیث“ میں تو واقعی ناقابل اعتماد ہیں مگر تاریخی واقعات میں ان کے بیانات قابل قبول ہیں۔ مولانا نے فرمایا ہے کہ اگر تاریخ کے معاملہ میں بھی انہیں ناقابل اعتماد قرار دے دیا گیا تو ہماری تاریخ کا کم از کم ۹۰ حصہ بالکل غیر معتبر قرار پائے گا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، تاریخی واقعات میں ان راویوں کے قابل اعتماد ہونے کے معنی یہ نہیں کہ ان کے بیان کئے ہوئے وہ واقعات بھی بے چوں و چرا تسلیم کر لئے جائیں جن کی زو عقائد یا احکام پر پڑتی ہے۔ کسی بات کے محض ”تاریخی“ ہونے کا فیصلہ صرف اس بات سے نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی تاریخ کی کتاب میں لکھی ہوئی ہے بلکہ اگر تاریخی کتابوں میں عقائد و احکام سے متعلق کوئی چیز آئے گی تو اسے جانچنے کے لئے لازماً وہی اصول استعمال کرنے پڑیں گے جو عقائد و احکام کے استنباط کے لئے مقرر ہیں۔

واقعہ یہ ہے بعض راویوں کے بارے میں علماء نے جو یہ کہا ہے کہ ”ان کی روایتیں احکام کے معاملے میں مردود اور سیر تواریخ میں مقبول ہیں“ اس سے مراد سیر تواریخ کے وہ واقعات ہیں جن سے عقائد و احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کون سا غزوہ کون سے سن میں ہوا؟ اس میں کتنے افراد شریک تھے؟ اس کی قیادت کس نے کی؟ اس میں کس کو فتح اور کس کو شکست ہوئی؟ ظاہر ہے کہ یہ اور اس جیسے دوسرے واقعات ایسے ہیں کہ ان سے عقائد و احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ان معاملات میں ضعیف راویوں کی روایات کو بھی گوارا کر لیا گیا ہے! لیکن مشاجرات صحابہؓ اور صحابہؓ کی عدالت کے وہ مسائل جو خالص عقائد سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی بنیاد پر اسلام میں کئی کئی فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں ان راویوں کی روایات ہرگز قبول نہیں کی جاسکتیں، مذکورہ بالا مسائل کا فیصلہ قرآن و سنت اور اجماع کے مضبوط دلائل ہی سے ہو سکتا ہے۔

لے گوارا کرنے کا مفہوم یہاں بھی یہ نہیں ہے کہ ان روایتوں کا مطالعہ کرتے وقت نقد و نظر کے تمام اصولوں پر بالکل ہی تالا ڈال دیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف ان راویوں کے ضعف کی بنیاد پر ان روایتوں کو رد نہیں کر دیں گے۔ چنانچہ اگر کچھ دوسرے دلائل ان کے خلاف مل جائیں تو ان روایات کو بھی تسلیم کرنے پر اصرار نہیں کیا جائے گا۔

اس کی صاف اور سادہ سی مثال یہ ہے کہ آپ روزانہ اخبار میں بے شمار خبریں پڑھتے ہیں اور ان کے رپورٹروں کی تحقیق کو ضروری نہیں سمجھتے، لیکن جن خبروں سے کسی معروف شخصیت پر کوئی سنگین الزام لگتا ہو یا ان سے کوئی شرعی مسئلہ متاثر ہوتا ہو انہیں تسلیم کرنے سے پہلے ہر معقول آدمی اس خبر کی تحقیق کرتا ہے، اور اگر معلوم ہو کہ رپورٹر ناقابل اعتماد تھے تو اس خبر کی تصدیق نہیں کرتا۔ آج فلاں جگہ بس الٹ گئی۔ فلاں شہر میں زلزلہ آیا، فلاں مقام پر فلاں سیاسی جماعت کا اجلاس منعقد ہوا۔ فلاں فلاں لیڈر نے ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اگر خبریں کسی ذمہ دار اخبار میں شائع ہوئی ہوں تو آپ انہیں تسلیم کر لیتے ہیں۔ خواہ آپ کو یہ یقین ہو کہ اس خبر کا رپورٹر کوئی دہریہ ہے، لیکن اگر یہی دہریہ رپورٹر یہ خبر دے کہ فلاں مشہور عالم دین نے چوری کر لی ہے یا فلاں مشہور سیاسی لیڈر نے کسی غیر ملکی سفارت خانے سے جاسوسی کی رقم حاصل کی ہے، تو آپ محض اخبار کی خبر پر اعتماد کرنے کے بجائے لازماً اس خبر کی پوری تحقیق کرتے ہیں اور جب تک مضبوط دلائل سے خبر درست ثابت نہ ہو جائے، آپ اس عالم دین کو چور یا سیاسی لیڈر کو ضمیر فروش قرار نہیں دے سکتے۔

اگر کوئی شخص رپورٹروں کو ناقابل اعتماد اور جھوٹا ثابت کر کے ایسی خبروں کی تردید کرے تو کیا اس سے یہ کہا جاسکے گا کہ یا تو اخبار کا مہر و حصہ، جو انہی رپورٹروں نے مرتب کیا ہے، رد کردو، یا ان خبروں کو بھی بے چون چرادرست مانو۔ اگر یہ کہنا درست نہیں ہے، اور کوئی معقول انسان اس اعتراض کو درست نہیں کر سکتا تو بیچاری تاریخ اسلام ہی اتنی لاوارث کیوں ہے کہ اس کی تحقیق و تنقید کا ہر دروازہ بند ہو گیا ہے، اور اب کوئی شخص اس مقصد کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں بھی نہیں کھول سکتا؟

یہی وہ بات ہے جسے اہل السنۃ والجماعت کے علماء شروع سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ان ضعیف تاریخی روایات کے ذریعے صحابہ کرام پر کسی گناہ کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا، مثال کے طور پر علامہ احمد بن حجر المہشمیؒ اپنی مشہور کتاب الصواعق المحرقة میں لکھتے ہیں :

والواجب ایضا علی کل من سمع شیئا من ذالک ان یتثبت فیہ
ولا ینسبہ الی احد منهم بمجرد رویۃ فی کتاب او سماعہ من
شخص بل لا بد ان ینحث عنہ حتی یصح عنده نسبة الی

احدہم فحینئذ الواجب ان یلتئم لهم احسن التاویلات لئلا
 ”اور جو شخص (صحابہ کرامؓ کی لغزشوں سے متعلق) کچھ نئے تو اس پر واجب
 ہے کہ اس معاملے میں تحقیق سے کام لے اور صرف کسی کتاب میں دیکھ
 لینے یا کسی شخص سے سن لینے کی بناء پر اس غلطی کو ان میں سے کسی کی
 طرف منسوب نہ کرے، بلکہ یہ ناگزیر ہے کہ اس کی پوری تحقیق کرے،
 یہاں تک کہ اس کی نسبت ان کی طرف صحیح ثابت ہو جائے، اس مرحلے پر
 یہ واجب ہے کہ ان کے لئے تاویلات تلاش کرے۔“

اور اپنی ایک دوسری کتاب تطییر الجمان میں رقم طراز ہیں :

لا یجوز لاحد ان یدکر شیئا مما وقع بینہم یستدل بہ علی
 بعض نقص من وقع له ذلک والظعن فی ولایتہ الصحیحۃ
 اولیغری العوام علی سبہم وثلبہم ونحو ذلک من المفساد ولم
 یقع ذلک الا للمبتدعہ وبعض جہلۃ النقلۃ النین ینقلون
 کلماراً وہ یتروکونہ علی ظاہرہ غیر طاعنین فی سندہ
 ولا مشیرین لتاویلہ وهذا شلیلۃ التحریم لما فیہ من الفساد
 العظیم وهو اغراء للعامۃ ومن فی حکمہم علی تنقیص
 اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم البین لم یقم البین
 الا ینقلہم الینا کتاب اللہ وما سمعوه و شاہدوہ من بیہ من
 سنتہ الغراء الواضحۃ البیضاء لئلا

صحابہ کرام کے درمیان جو واقعات ہوئے ہیں، کسی کے لئے جائز نہیں
 ہے کہ انہیں ذکر کر کے ان کے قصص پر استدلال کرے اور اسکے ذریعہ
 کسی صحابی کی ولایت صحیحہ پر مشرط ہو یا عوام کو انہیں برا بھلا کہنے پر

ابن تیمیہؒ: الصواعق المحرقة فی الرد علی اهل البدع والزندقة ص ۱۲۹ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۲۳ھ:

حوالے کے لئے ہم محترم جناب مولانا محمد یوسف صاحب خطیب جامع الہ حدیث مصطفیٰ آباد
 کے شکر گزار ہیں۔

تطییر الجمان واللسان بما مش الصواعق المحرقة: ص ۶۵

اکسائے۔ یہ کام صرف اہل بدعت کا ہے اور بعض ان جاہل ناقلوں کا جو ہر اس چیز کو نقل کر دیتے ہیں جو انہوں نے کہیں دیکھ لی ہو اور اس سے اس کا ظاہری مفہوم مراد لیتے ہیں، نہ اس روایت کی سند پر کوئی طعن کرتے ہیں، اور نہ اسکی تاویل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یہ بات سخت حرام و ناجائز ہے کیوں کہ اس سے فساد عظیم رونما ہو سکتا ہے، اور یہ عام لوگوں کو صحابہؓ کے خلاف اکسانے کے مترادف ہے، حالانکہ ہم تک دین کے پیچھے کا واسطہ ہی صحابہؓ ہیں جنہوں نے قرآن و سنت کو ہم تک نقل کیا ہے۔“

اور علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب ”العقیدۃ الواسیۃ“ میں اہل سنت کے امتیازی عقائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ان ہلہ الآذان المروریۃ فی مساویہم منها ما ہو کذب و منها ما قد زید فیہ و نقص و غیر وجہہ، والصحیح منہ ہم فیہ معنورون، اما مجتہدون مصیبون واما مجتہدون مخطون، وہم مع ذلک لایعتقدون ان کل واحد من الصحابة معصوم من کبائر الاثم و صغائرہ بل یحون علیہم الذنوب فی الجملة، ولہم من الفضائل و السوابق ما یوجب مغفرته ما یصدر منہم ان صدر

”اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ (جن روایات سے صحابہ کرامؓ کی برائیاں معلوم ہوتی ہیں ان میں سے کچھ تو جھوٹ ہی جھوٹ ہیں اور کچھ ایسی ہیں کہ اس میں کسی بیشی کر دی گئی ہے، اور ان کا اصل مفہوم بدل دیا گیا ہے، اور ان میں سے جو روایتیں صحیح ہیں، ان میں صحابہؓ معذور ہیں، یا تو مجتہد برحق ہیں، یا اجتہادی غلطی کے مرتکب، لیکن اس کے باوجود اہل سنت کا عقیدہ یہ بھی نہیں ہے کہ صحابہؓ کا ہر فرد چھوٹے بڑے تمام گناہوں سے معصوم تھا، بلکہ فی الجملہ ان سے گناہ صادر ہو سکتے ہیں، مگر ان کی فضیلتیں اتنی ہیں کہ اگر کوئی گناہ صادر ہوا بھی ہو تو یہ فضائل ان کی

مغفرت کا موجب ہیں۔^{۱۳۹}

اہل سنت کی لکھی ہوئی عقائد و کلام کی تمام کتابیں پڑھ جائیے، وہ اول سے آخر تک اس معاملے میں یک زبان نظر آئیں گی کہ صحابہ کرامؓ سے کسی گناہ کا صدور خالصتاً عقائد کا مسئلہ ہے اور اس کا اثبات ضعیف، مجروح، منقطع یا بلا سند تاریخی روایتوں سے نہیں ہو سکتا، خاص طور سے مشاجرات صحابہؓ کے معاملے میں اس اصول کی بڑی شدت کے ساتھ پابندی کی ضرورت ہے کیوں کہ بقول علامہ ابن تیمیہؒ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد سبائی پروپیگنڈہ کے اثر سے صحابہ کرامؓ پر بے بنیاد تہمت طرازیوں کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس پروپیگنڈے کے اثرات سے مشاجرات کے زمانے کی تاریخ بھی محفوظ نہیں رہ سکی، یہی وجہ ہے کہ تمام اہل سنت نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف اور حضرت معاویہؓ کی غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جن روایات کی بنیاد پر آج مولانا مودودی صاحبؒ حضرت معاویہؓ کو ”حقیقی غلطی“ اور سیاسی اغراض کیلئے قرآن

و سنت کی صریح خلاف ورزی کا مجرم قرار دے رہے ہیں، وہ روایات آج چودھویں صدی میں کوئی نئی دریافت نہیں ہو گئی ہیں، بلکہ یہ تہہ صدیوں سے مسلمانوں کی تواریخ میں نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں اس کے باوجود اہل سنت کے کسی ایک فرد نے بھی ان کی بناء پر حضرت معاویہؓ پر یہ الزام نہیں لگایا بلکہ عقائد کی جس کتاب کو اٹھا کر دیکھیے اس میں یہی لکھا ہوا ملے گا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ سے اجتہادی غلطی ہوئی تھی، نہ سوال یہ ہے کہ کیا عقائد کے

۱۳۹ الروضة الندیة شرح العقيدة الواسطیة لزیید بن عبدالعزیز ص ۳۳۹ مطابع الریاض ۱۳۷۷ھ

۱۴۰ دیکھئے شرح اللہ الاکبر: ص ۸۲؛ والبر اس علی شرح العقائد ص ۵۳۹؛ امرتسر: والصورا من الموحدة: ص ۱۲۹ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۲۳ھ و شرح العقيدة الواسطیة ص ۳۳۹ تا ۳۵۱ الریاض ۱۳۷۷ھ والعواصم من التواصم ص ۱۶۸ مکتبۃ السلفیة قاہرہ ۱۳۷۱ھ و مکتوبات مجدد الف ثانی: دفتر اول، بریلی ۱۳۸۶ھ؛ ولواع الانوار البیہ للسفاری ص ۳۸۶ ج ۲: دارالاصفہانی جدہ ۱۳۸۰ھ والسامرة بشرح الساریة ص ۱۳۲ دارالعلوم دیوبند ۱۳۷۷ھ و مرقاة المفاتیح: ص ۱۳۸ ج ۵ المینیہ مصر ۱۳۹۰ھ۔ یہ چند حوالے سرسری طور سے لکھ دیئے گئے ہیں ورنہ اہل سنت کا کوئی عالم ہماری نظر میں نہیں ہے جس نے حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو اجتہادی غلطی سے زیادہ کچھ کہا ہو۔ یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ جن لوگوں پر بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

یہ علماء و ائمہ سب کے سب تاریخی روایتوں سے بے خبر تھے؟ یا انہیں ان روایتوں کا علم تو تھا مگر اتنی فہم نہیں تھی کہ وہ اجتہادی غلطی اور حقیقی غلطی میں تمیز کر سکتے؟ یا انہیں روایات کا علم بھی تھا اور وہ ان کا مطلب بھی سمجھتے تھے، مگر عقائد کی کتابیں مرتب کرتے وقت انہوں نے خیانت سے کام لیا اور اصلی واقعات کو چھپا کر محض جذباتی جوش عقیدت پر عقائد کی تعمیر کھڑی کر دی؟ اگر کوئی شخص ان میں سے کوئی بات اہل سنت کے تمام علماء، تمام ائمہ اور تمام متکلمین کے بارے میں کہہ سکتا ہے تو صاف صاف کہے اور واضح الفاظ میں اعلان کرے کہ وہ اہل سنت کے عقائد کا پابند نہیں ہے، لیکن اگر ان حضرات کے بارے میں ان میں سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی تو ان کے اس طرز عمل کا اس کے سوا مطلب کیا ہے کہ انہوں نے ان مجروح تاریخی روایات کو در خواستنا ہی نہیں سمجھا اور ان کو اس لائق قرار نہیں دیا کہ ان کی بناء پر صحابہؓ میں سے کسی کو گناہ کا ملزم قرار دیا جائے۔ یہاں تک کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے خود اس قسم کی روایات اپنی تاریخ میں نقل کی ہیں، وہ جنگ صفین کے بیان کے بعد لکھتے ہیں :

وهذا هو مذهب اهل السنة والجماعة ان عليا هو المصيب
وان كان معاوية مجتهدا وهو ما حوران شاء الله

”یہی اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے کہ حضرت علیؓ حق پر تھے، مگر چہ
حضرت معاویہؓ بھی مجتہد ہونے کی وجہ سے انشاء اللہ ناجور ہیں۔“

ہم سمجھتے ہیں کہ ان روشن دلائل کی موجودگی میں کوئی انصاف پسند انسان مولانا مودودی صاحب کے اس موقف کو درست تسلیم نہیں کر سکتا کہ صحابہ کرامؓ پر نفسانیت پرستی

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ
نے حضرت معاویہؓ کے لئے ”ہاشمی“ یا ”امام جائز“ کا لفظ استعمال کیا ہے ان کی مراد بھی خود ان کی
تصریح کے مطابق صرف یہی ہے کہ وہ حضرت حسنؓ کی صلح سے قبل نفس الامر کے اعتبار سے برسر حق
نہ تھے، ورنہ چوں کہ ان کی یہ ”بعثت“ تاویل کے ساتھ تھی اس لئے وہ مجتہد غلطی تھے، ملاحظہ
فرمائیے: فتح القدر، ص ۳۶۱ ج ۵ و ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء ص ۷، ج ۱ و تطہیر الجمان بمائش
الصواعق، ص ۳۰

لے الہدایہ والنہایہ ص ۲۷۹ ج ۷

اور ان کتاب کبار کا الزام عائد کرنے والی روایات کو ان کے ضعیف اور مجروح ہونے کے باوجود قبول کر لیا جائے۔ اور اس سلسلے میں ہر قسم کی جرح و تنقید کو ممنوع قرار دے دیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ اگر اس معاملے میں مولانا مودودی صاحب کا یہ عجیب و غریب طرز عمل اختیار کر لیا جائے تو کسی صحابی کی آہدہ محفوظ نہیں رہ سکتی اور کل کوئی نیا محقق اسی قسم کی روایات کے بل پر خود حضرات صحیحینؓ پر بڑی آسانی سے دست درازی کر کے ان کے عمد خلافت ہی میں ملوکیت کے جراثیم دکھلا سکتا ہے۔ آج سے سالہا سال پہلے خود مولانا مودودی صاحب یہ لکھ چکے ہیں کہ اگر اس قسم کی روایات کو مان لیا جائے تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کئے ہوئے معاشرے کی کیا تصویر سامنے آتی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں :-

”اگر آپ اس تاریخ کو پاور کرتے ہیں تو پھر آپ کو محمد رسول اللہ مبلغ قرآن، داعی اسلام، مزی نفوس، کی شخصیت پر اور انکی تعلیم و تربیت کے تمام اثرات پر غلط فہمی دینا پڑے گا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس پاکیزہ ترین انسان کی ۲۳ سالہ تبلیغ و ہدایت سے جو جماعت تیار ہوئی تھی، اور اس کی قیادت میں جس جماعت نے بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکے سر کر کے اسلام کا جہنڈا دنیا میں بلند کیا تھا، اس کے اخلاق، اس کے خیالات، اس کے مقاصد، اس کے ارادے، اس کی خواہشات اور اس کے طور طریق عام دنیا پرستوں سے ذرہ برابر مختلف نہ تھے۔“

حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت کی صحیح حیثیت

آخر میں ہم اس سوال کا مختصر جواب دینا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت معاویہؓ پر عائد کردہ یہ الزامات غلط ہیں تو پھر ان کے عہد حکومت کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ ٹھیک اسی معیار اور مرتبہ کے خلیفہ تھے جو معیار اور مرتبہ خلفائے راشدین کو حاصل تھا یا نہیں؟ اگر تھے تو انہیں خلیفہ راشد کیوں قرار نہیں دیا گیا؟ اور اگر نہیں تھے تو ان میں اور خلفائے راشدین میں فرق کیا تھا؟

یہ سوال ایک معقول سوال ہے، ہمارے نزدیک اور صرف ہمارے نزدیک ہی نہیں، جسور اہل سنت کے نزدیک بلاشبہ انکی خلافت اور خلفائے راشدین کی خلافت دونوں ایک معیار کی نہیں تھیں، بلکہ دونوں میں فرق تھا، لیکن اس فرق کی جو تشریح مولانا مودودی صاحب نے فرمائی ہے، وہ نہ معقول ہے نہ مستند طریقے سے ثابت ہے اور نہ اہل سنت کے عقائد سے میل کھاتی ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے حالات کے اس تفسیر کی جو تشریح کی ہے، اس سے ذہن میں نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد ایک بیک حالات بالکل پلٹ گئے، خلافت راشدہ تمام مثالی خوبیوں کا مجموعہ تھی، مگر حضرت معاویہؓ کے خلافت سنبھالتے ہی اس میں ملوکیت کی تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں، تقویٰ کے فوراً بعد فسق حکمراں ہو گیا، اور جو معاشرہ خلافت راشدہ کے عہد میں تاریخ کا پاکیزہ ترین معاشرہ تھا، اسی معاشرہ میں حضرت معاویہؓ کے عہد میں نفسانیت کی تمام پستیاں جمع ہو گئیں۔ ۴۰ھ تک خلافت کی طرف سے علانیہ قانون شکنی کا تصور نہ ہو سکتا تھا، اور ۴۱ھ میں قانون شکنی ”بدعت“ اور ”تحریف دین“ کی حد تک پہنچ گئی۔ ۴۰ھ میں رشوت ستانی کا خیال کسی کو نہ آتا تھا، ۴۱ھ میں اسے شیر مادر سمجھ لیا گیا، ۴۰ھ تک کافروں کو بھی سب و شتم

نہ کیا جاتا تھا، اور یہاں جلیل القدر صحابہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ پہلے مالِ غنیمت میں خوردبرد کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور ایک ہی دو سال میں اب باقاعدہ اس خیانت کے لئے احکام جاری ہونے لگے، پہلے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنے اقدار کے سہارے لوگوں پر ظلم و ستم کر سکے، اور اب یہ ظلم و ستم خود مرکز کی پالیسی قرار پائی، پہلے عوام کی غیرت اور حکام کی خدا ترسی کا عالم یہ تھا کہ معمولی سے معمولی آدمی خلیفہ کا گریبان تھام سکتا تھا، اور اب ایک ہی سال کے فرق سے لوگوں کی بے غیرتی اور حاکم کے جبر و تشدد کا یہ حال ہو گیا کہ غمیروں پر قفل چڑھ گئے اور کوڑے حق گوئی کا انعام بن گئے۔ غرض یہ کہ ۴۰ھ کے ختم ہوتے ہی محضی مفادات پر مبنی سیاست کا وہ بازار گرم ہو گیا جو آج بیسویں صدی میں ہمیں نظر آتا ہے۔

یہ صورت حال نہ صرف یہ کہ حالات کی اس تدریج کے خلاف ہے جو عموماً تاریخ میں کاربہا ہوا کرتی ہے بلکہ اگر اس صورت حال کو تسلیم کر لیا جائے تو ثم الذین یلونہم ثم الذین یونہم کے ارشادِ نبویؐ کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔

لذا خلافت راشدہ اور حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں فرق تو بیشک تھا، لیکن وہ تقویٰ اور فسق کا فرق نہ تھا، بلکہ اس فرق کی بہترین تشریح وہ ہے جو مشہور صحابی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائی ہے :

حضرت عدی بن حاتمؓ حضرت علیؓ کے سرگرم حامیوں میں سے تھے، متقین وغیرہ کی جنگوں میں انہوں نے کھل کر حضرت علیؓ کا ساتھ دیا اور حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بھی وہ اپنے اس موقف پر مضبوطی سے قائم رہے، ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے ان سے پوچھا کہ مارے عہد حکومت کے بارے میں تمہارا خیال ہے، وہ کیسا ہے؟ حضرت عدیؓ نے فرمایا کہ اگرچہ کہیں تو تمہارا خوف ہے اور جھوٹ کہیں تو اللہ کا۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا میں تمہیں تم دیتا ہوں، سچ سچ بیان کرو۔

اس پر حضرت عدیؓ نے ارشاد فرمایا :

عدل زمانکم هذا جور زمان قدمضیٰ وجور زمانکم هذا عدل
زمان مایاتی شہ

”تمہارے زمانے کا انصاف پہلے زمانے کا ظلم تھا اور تمہارے زمانے کا ظلم آئندہ زمانے کا انصاف ہو گا۔“

حضرت عدیؓ کے اس جامع جملے کا مطلب ہی یہ ہے کہ حضرات خلفائے راشدین احتیاط تقویٰ اور احساس ذمہ داری کے جس معیار بلند پر فائز تھے بعد میں وہ معیار باقی نہیں رہا۔ خلفائے راشدینؓ عزیمت پر عامل تھے اور حضرت معاویہؓ نے رخصوں میں توسع سے کام لیا۔ وہ حضرات اپنی عمومی زندگی میں تقویٰ اور احتیاط پر عمل کرتے تھے اور حضرت معاویہؓ مباحات کی حد تک خلاف احتیاط باتوں کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔ مثلاً خلفائے راشدینؓ عزیمت اور احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو ولی عہد نہیں بنایا، باوجودیکہ ان صاحبزادوں میں خلافت کی شرائط پائی جاتی تھیں، اس کے برخلاف حضرت معاویہؓ رضی اللہ عنہ نے رخصت پر عمل کرتے ہوئے بیٹے کو ولی عہد بنا دیا۔ خلفائے راشدینؓ نے عزیمت اور احتیاط کے تحت اپنا طرز معیشت نہایت فقیرانہ بنایا ہوا تھا مگر حضرت معاویہؓ نے رخصت و اباحت پر عمل کیا۔ اور ان کے مقابلے میں نسبتاً فراخی عیش اختیار فرمائی۔ اہل خلفائے راشدین کے احساس ذمہ داری کا عالم یہ تھا کہ وہ عوام کے ایک ایک فرد کی خبر گیری اس گھر جا کر کیا کرتے تھے اور حضرت معاویہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ایسی کوئی بات مروی نہیں ہے، خلفائے راشدینؓ کی اصابت رائے اور صحت اجتہاد کا عالم یہ تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اتباع کے ساتھ ان کے اتباع کا حکم فرمایا، لیکن حضرت معاویہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں جمہور امت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان سے متعدد اجتہادی غلطیاں سرزد ہوئیں۔

اسی قسم کی چیزیں تھیں جن کے بارے میں حضرت عدیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ :

تمہارے زمانے کا انصاف پہلے زمانے کا ظلم تھا۔

۱۔ مگر یہ فراخی عیش بھی آج کل کے حکمرانوں کی سی عیش کوشی نہ تھی، یونس بن میسرہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت معاویہؓ کو دمشق کے بازاروں میں اس حالت میں چلتے دیکھا ہے کہ انہوں نے بیچ نہ ہوئی قبض پستی ہوئی تھی۔ (الہدایہ والنسایہ، ص ۱۳۳ ج ۸)

عقائد کے علاوہ ائمہ نے بھی خلفائے راشدینؓ اور حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں یہی فرق بیان فرمایا ہے۔ علامہ عبدالعزیز قرظاری رحمۃ اللہ علیہ جو علم عقائد کے مشہور محقق عالم ہیں، تحریر فرماتے ہیں :

قلت لاهل الخیر مراتب بعضها فوق بعض وکل مرتبة منها یکون محل قدح بالنسبة الی الی التي فوقها... ولذا اقبل حسنات الابرار سیئات المقربین وفسر بعض الکبراء قوله علیه السلام انی لا استغفر الله فی الیوم اکثر من سبعین مرة بانه کان دائم الترقی وکلما کان یترقی الی مرتبة استغفر عن المرتبة التي قبلها واذن تقرر ذلك فنقول کان الخلفاء الراشدون لم یتوسعوا فی المباحات وکان سیرتهم سیرة النبی صلی الله علیه وسلم فی الصبر علی ضیق العیش والجهد... واما معاویة فهو ان لم یرتکب منکرا لکنه توسع فی المباحات ولم یکن فی درجة الخلفاء الراشدین فی اداء حقوق الخلافة لکن عدم المساواة بهم لا یوجب قدحاً فیہ

”اہل خیر کے مختلف مراتب ہوتے ہیں جن میں سے بعض دوسرے بعض سے بلند ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر مرتبہ اپنے سے بلند مرتبے کے اعتبار سے قابل اعتراض ہوتا ہے... اسی لئے مقولہ مشہور ہے کہ ”نیک لوگوں کے حسنات مقرب لوگوں کی برائیاں ہوتی ہیں“ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو یہ ارشاد مروی ہے کہ ”میں دن میں ستر سے زیادہ دفعہ اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں“ اس کی تشریح بعض اکابر نے اس طرح فرمائی ہے کہ آپ کے درجات میں ہر آن ترقی ہوتی رہتی تھی، اور آپ جب بھی ترقی کا کوئی اگلا درجہ حاصل کرتے تو پچھلے درجے سے استغفار فرماتے تھے، جب یہ بات طے ہو گئی تو ہم یہ کہتے ہیں کہ خلفاء راشدینؓ نے مباحات میں توسع سے کام نہیں لیا تھا، اور تنگی عیش پر صبر اور جدوجہد کے معاملے میں ان کی سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھی... رہے حضرت معاویہؓ سوانہوں نے اگرچہ کسی منکر (کھلے گناہ) کا ارتکاب تو

نہیں کیا لیکن انہوں نے مباحثات میں توسع اختیار کیا، اور حقوق خلافت کی ادائیگی میں وہ خلفاء راشدین کے درجے میں نہیں تھے، لیکن ان کی برابری نہ کر سکتا ان کے لئے کسی قدر کاموجب نہیں ہے۔^{۱۰}

غرض یہ کہ اگر اکابر صحابہ کرام کو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں کچھ خرابیاں نظر آتی تھیں تو وہ خلفائے راشدین کی نسبت سے تھیں، ظاہر ہے کہ جو حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کا انداز حکومت دیکھ چکے تھے انہیں حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں خامیاں نظر آئیں تو کچھ بعید نہیں ہے، لیکن اس سے اس بات کا کوئی جواز نہیں نکلتا کہ ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد کوئی شخص بعض صحابہ کرام کے اس تاثر کو بنیاد بنا کر حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں آج کی گندی سیاست کے تمام مظاہرے تلاش کرنے شروع کر دے اور تحقیق کے بغیر ان پر جھوٹ، خیانت، رشوت، اخلاقی پستی، ظلم و جور، بے حمیت اور سیاسی بازی کرمی کے وہ تمام الزامات عائد کر ڈالے جو آج سیاست دانوں میں نظر آتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کی نسبت سے ان کے عہد حکومت میں فرق ضرور تھا۔ لیکن یہ فرق فسق و معصیت اور ظلم و جور کی حد تک نہیں پہنچا تھا، ان کی حکومت، حکومت عادلہ ہی تھی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

ماریت احثنا بعد عثمان "اقضی بحق من صاحب هذا الباب

بعنی معاویہ

"میں نے عثمان کے بعد کوئی شخص اس صاحب مکان یعنی معاویہ سے زیادہ حق کا فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا"

امام ابوبکر اثرم نے اپنی سند سے ابو ہریرہ المکنب کا قول نقل کیا ہے کہ ہم مشور محدث امام اعظم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عدل و انصاف کا ذکر چل نکلا تو امام اعظم نے فرمایا کہ (تم عمر بن عبدالعزیز کے انصاف پر حیران ہو) "اگر معاویہ کا

۱۰ البزاس علی شرح العقائد ص ۵۱۰ مطبع روز بازار امرتسر ۱۳۱۸ھ

۱۱ البدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸

عہد حکومت پالیتے تو تمہارا کیا حال ہوتا؟“ لوگوں نے پوچھا کیا ان کے علم کے اعتبار سے؟“ امام اعمشؒ نے جواب دیا“ نہیں، خدا کی قسم ان کے عدل و انصاف کے اعتبار سے۔“ اور حضرت قتادہؓ، حضرت مجاہدؓ اور حضرت ابواسحاقؓ سب جیسے جلیل القدر تابعین اپنے زمانے کے لوگوں سے خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ“ اگر تم حضرت معاویہؓ کا عہد پالیتے تو یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ یہ سہمی (ہدایت یافتہ) ہیں“ اور کیوں نہ ہو؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی کہ :

اللہم اجعلہ ہادیًا مہدیاً واہدبہ

”اے اللہ ان کو ہادی اور ہدایت یافتہ بنا اور ان کے ذریعے لوگوں کو ہدایت دے“ تہ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”میرے بعد خلافت تمیں سال تک رہے گی اور اس کے بعد کاٹ کھانے والی ملوکیت آجائے گی۔“ یہ تیس سال حضرت حسنؓ کے عہد خلافت پر ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد حضرت معاویہؓ کا عہد حکومت شروع ہوتا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں بعض علماء نے اس حدیث کی سند پر تنقید کر کے اسے غیر صحیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ ”ہذا حدیث لا یصحح“ (یہ حدیث صحیح نہیں ہے)۔

اور بعض دوسرے علماء نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث مجمل ہے اور اس میں تیس سال کے بعد ایک عمومی حکم بیان فرمایا گیا ہے، ہر ہر فرد کی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا عہد حکومت اس سے بائفاق مستثنیٰ ہے، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دوسری حدیث میں اس کی تفصیل آئی ہے اور اس سے حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت کی صحیح حیثیت واضح ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا :

۱۔ منہاج السنۃ ص ۱۸۵ ج ۳ بلاق مصر ۱۳۲۲ھ

۲۔ ایضاً

۳۔ تجویب مسند احمد (الفتح الربانی) ص ۳۵۶ ج ۲۲

۴۔ العواصم من القواصم، ص ۲۰۱

اول هذا الامر نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة ثم يكون
ملكاً ورحمة ثم يكون امارة ورحمة ثم ينكادعون عليها تكادام
الحمير

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ”رجالہ ثقات“ لے (اس کے تمام راوی ثقہ ہیں) اس حدیث میں واضح کر دیا گیا ہے کہ خلافت راشدہ ختم ہونے کے بعد جو حکومت آئے گی وہ بھی ”ملوکیت اور رحمت“ ہوگی۔ علامہ ابن حجر ہیتمی اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

”بلاشبہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں بہت سے ایسے امور واقع ہوئے جو خلفائے راشدین کے عہد میں مانوس نہیں تھے اور ان ہی امور پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ان کی خلافت کو ”ملک عاص“ (کائنات والی ملوکیت) سے تعبیر کیا گیا، اگرچہ حضرت معاویہؓ اپنے اجتہاد کی وجہ سے باجوڑ رہی ہیں، اس لئے کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مجتہد اگر حق پر ہو تو اسے دواجرت ملے ہیں اور اگر غلطی پر ہو تو اسے ایک اجر ملتا ہے اور حضرت معاویہؓ بلاشبہ مجتہد تھے لہذا اگر ان سے اجتہاد میں غلطی ہوئی تب بھی انہیں ثواب ملا، اور یہ بات ان کے حق میں قابل اعتراض نہیں ہے، لیکن ان کی حکومت کو جو ان اجتہادی غلطیوں پر مشتمل تھی ”عاص“ ہی کہا گیا۔۔۔ (پھر مجسم طبرانی کی مذکورہ روایت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں)۔۔۔ خلافت کے بعد جس ملوکیت کا ذکر ”طبرانی کی“ حدیث میں کیا گیا ہے، اس سے مراد حضرت معاویہؓ کی حکومت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ”رحمت“ قرار دیا ہے۔ لہذا ان کی حکومت میں ایک اعتبار سے ملک عضو کی شان ہے اور ایک اعتبار سے رحمت کی، لیکن خارجی واقعات کے اعتبار سے یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں رحمت کی شان زیادہ ظاہر ہے اور ان کے بعد والے لوگوں میں ملک عضو کی۔۔۔“

۱۔ تطہیر الجنان علی ہامش الصواعق المحرقة ص ۳۱

۲۔ تطہیر الجنان علی ہامش الصواعق المحرقة ص ۳۱

اپنی ایک اور کتاب میں علامہ ابن حجر ہیتمیؒ رقم طراز ہیں :

حضرت سفینہؓ سے جو مروی ہے کہ حضرت معاویہؓ پہلے بادشاہ ہیں، اس سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت صحیح نہ تھی۔ اس لئے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ ان کی خلافت صحیح تھی لیکن اس پر ملوکیت کی مشابہت غالب آگئی تھی، اس لئے کہ وہ بہت سے معاملات میں خلفائے راشدینؓ کے طریقوں سے نکل گئی تھی۔ لہذا خلافت کی بات اس لئے صحیح ہے کہ حضرت حسنؓ کی دست برداری اور اہل حل و عقد کے اتفاق کے بعد حضرت معاویہؓ کی خلافت حق اور صحیح تھی اور ملوکیت کی بات اس لئے درست ہے کہ ان کے عہد حکومت میں کچھ ایسے امور واقع ہوئے جن کا فشاء غلط اجتہاد تھا جس کی بنیاد پر مجتہد گناہ گار تو نہیں ہوتا لیکن اس کا نتیجہ ان لوگوں سے بہر حال ٹھٹھ جاتا ہے جن کے اجتہادات صحیح اور واقعہ کے مطابق ہوں اور یہ حضرات خلفائے راشدینؓ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم تھے۔ لہذا جو شخص حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت پر ملوکیت کے لفظ کا اطلاق کرتا ہے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کی حکومت میں مذکورہ اجتہادات واقع ہوئے اور جو شخص اسے خلافت قرار دیتا ہے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حضرت حسنؓ کی دست برداری اور اہل حل و عقد کے اتفاق کے بعد وہ خلیفہ برحق اور واجب الاطاعت تھے اور اطاعت کے لحاظ سے لوگوں پر ان کے وہی حقوق تھے جو ان سے پہلے خلفائے راشدینؓ کو حاصل تھے۔ لیکن یہ بات ان کے بعد آنے والے لوگوں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی اس لئے کہ وہ اجتہاد کے اہل نہیں تھے بلکہ ان میں سے بعض تو کھلے عاصی اور فاسق تھے اور انہیں کسی بھی اعتبار سے خلفاء میں شمار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ ملوک کی فہرست ہی میں آتے ہیں۔^{۱۱}

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد حکومت میں فرق تو پیشک تھا، حضرت معاویہؓ کی حکومت اس معیار کی نہیں تھی جو

خلفائے راشدین کو حاصل تھا، لیکن جمہور امت کے نزدیک یہ فرق اتنا بڑا نہیں تھا کہ ایک طرف تقویٰ ہو اور دوسری طرف فسق و فجور یا ایک طرف عدل ہو اور دوسری طرف ظلم و جور، بلکہ یہ فرق عزیمت و رخصت کا، تقویٰ اور مباحات کا، احتیاط اور توسع کا اور اصابت رائے اور تصور اجتہاد کا فرق تھا۔ جن لوگوں نے اس فرق کا لحاظ کیا، انہوں نے ان کی حکومت کو ”ملوکیت“ کا نام دے دیا اور جن لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہ فرق فسق و فجور کی حد تک نہیں پہنچا تھا، انہوں نے اسے ”خلافت“ ہی قرار دیا۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے بالکل صحیح فرمایا کہ :

فلم یکن من ملوک المسلمین ملک خیر من معاویة ولا کان الناس فی زمان ملک من الملوک خیر امنہم فی زمن معاویة الا نسیب ایاہ الی ایام من بعدہ واما اذا نسبت الی ایام ابی بکر و عمرؓ ظہر التفاضل

”مسلمان بادشاہوں میں سے کوئی حضرت معاویہؓ سے بہتر نہیں ہو اور اگر ان کے زمانے کا مقابلہ بعد کے زمانوں سے کیا جائے تو عوام کسی بادشاہ کے زمانے میں اتنے بہتر نہیں رہے جتنے حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ہاں اگر ان کے زمانے کا مقابلہ ابو بکرؓ و عمرؓ سے کیا جائے تو فضیلت کا فرق ظاہر ہو جائیگا۔“

یہ فرق جو عقائد و کلام کے ان بزرگوں نے بیان فرمایا ہے، تاریخی تدریج کے مطابق بھی ہے، اہل سنت کے عقائد کو بھی اس سے ٹھیس نہیں لگتی تاریخ سے ثابت بھی ہے اور صحابہ کرامؓ کے شایان شان بھی۔ اس کے برخلاف مولانا مودودی صاحب نے جو فرق بیان فرمایا ہے وہ کسی بھی اعتبار سے قابل قبول نہیں ہے۔

خلافت راشدہ اور ملوکیت کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور کیا کسی ایسی حکومت عادلہ کا وجود ممکن ہے جو خلافت راشدہ تو نہ ہو لیکن اسے شریعت اسلام کے دائرہ سے باہر بھی نہ کہنا جاسکے؟ اس موضوع پر شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب ”منصب امامت“ میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، اس بحث سے مختلف حکومتوں کے مدارج بھی

معلوم ہو جاتے ہیں، ان کا شرعی حکم بھی واضح ہو جاتا ہے اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکومت کی صحیح حیثیت کیا تھی؟ اور اس میں اور خلافت راشدہ میں کیا فرق تھا؟ یہ بحث ہم حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے الفاظ میں بعینہ نقل کرتے ہیں۔

جس وقت ایسا شخص ”یعنی خلیفہ راشد“ منصب خلافت کو پہنچتا ہے تو ابواب سیاست میں محض خدا کے بندوں کی اصلاح اور نیابت رسول اللہ کے حقوق کی ادائیگی میں مشغول رہتا ہے اپنے نفع کے حصول کی آرزو اس کے دل میں نہیں گذرتی اور نہ کسی کے ضرر کا غبار اس کے دامن تک پہنچتا ہے، اور اطاعت ربانی میں ہوائے نفس کی مشارکت کو شرمک جانتا ہے اور کسی مقصد کا حصول سوائے رضائے حق کے اپنے دل کی خالص منزل کیلئے محض کثافت خیال کرتا ہے۔ اسے بندگان خدا کی تربیت کے سوا نہ کچھ ظاہر میں مطلوب ہے اور نہ باطن میں مرغوب ہے۔ جو بات تو انہیں سیاست ایمانی سے انحراف کا باعث اور آئین سیاست سلطانی کی طرف میلان کا سبب ہوگی اس سے ہرگز وقوع پذیر نہ ہوگی۔۔۔۔۔ لیکن امام حکمی بہت سے متصفیات نفسانیہ سے بالکل پاک نہیں رہ سکتا اور نہ ہی علائق ماسوی اللہ سے بری ہو سکتا ہے، اسی بناء پر مال و منال اور جاہ و جلال کے حصول اور اخوان و اقربان پر فوقیت، امصار و بلدان پر تسلط کی آرزو اور دوستوں اور قرابت داروں کی پاسداری، مخالفین و اعداء کی بدخواہی اور لذات جسمانیہ اور مرغوبات نفسانیہ کے حصول کا خیال اس کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے، بلکہ امور مذکورہ کو طلب کرتا اور سیاست کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے اور طریق حکومت کو حکمت عملی کے ذریعہ اپنی دلی آرزو تک پہنچاتا ہے، پس یہی سیاست سلطانی ہے۔۔۔۔۔ اور یہی مذکورہ لذات جسمانیہ کا حصول جس وقت سیاست ایمانی سے مخلوط ہو جاتا ہے، اسی وقت خلافت راشدہ مخفی اور سیاست سلطانی بر ملا ہو جاتی ہے اور لذات نفسانیہ کی طلب بحسب اختلاف اشخاص متفاوت ہوتی ہے، یہ ہوا و ہوس بعض اشخاص پر اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ انہیں دین و ایمان

کے دائرہ سے خارج کر دیتی ہے۔ اور بعض پر اس قدر کہ فسق و فجور کی حد تک پہنچا دیتی ہے اور بعض کو یہاں تک نقصان دیتی ہے کہ بوالہوسان آرام طلب کی لڑی میں منسلک کر دیتی ہے۔

اس ہوا و ہوس کا اختلاط بھی سیاست ایمانی کے ساتھ چار مراتب پر خیال کرنا چاہیے۔

اول۔ باوجود ظواہر شریعت کی پاسداری کے طالب لذات نفسانی ہوتا ہے، یعنی ظاہر شریعت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور نہ ہی فسق و فجور اور جوہر تعدی کی راہ لیتا ہے، لیکن اپنے نفس کی راحت رسانی میں اس قدر کوشاں رہتا ہے کہ ظاہراً شریعت اسے مباحات سے شمار کرے، ہم اسے سلطنت عادلہ کہتے ہیں۔

دوسرا۔ نفسانی لذات کی طلب اور جسمانی راحت کی خواہش اس قدر غلبہ کرتی ہے کہ کبھی کبھی لذات کے حصول میں دائرہ شرع سے باہر ہو جاتا ہے اور ظالمان سے باہک اور فاسقان سفاک کی راہ تک جا پہنچتا ہے اور پھر اس پر پشیمان نہیں ہوتا اور نہ اس سے توبہ کرتا ہے۔ اسے سلطنت جاہلہ کہا جائے گا۔

تیسرا۔ نفس کی پیروی اس قدر غالب آجاتی ہے کہ زمانہ بھر کا فاسق و عیاش ہو جاتا ہے، جبر و تکبر کی داد دیتا، ظلم و تعدی کی بنیاد ڈالتا اور عیش کے فکر میں ہمت صرف کرتا اور مراتب تفرج کو کمال تک پہنچاتا اور فسق و فجور تعدی و جوہر کے طریقوں کو ملت و سنت کے شواہد کے مقابلہ میں فراہم کرتا ہے اور اسے اپنے ہنر و کمال سے سمجھتا ہے، ہم اسے سلطنت ضالہ کہتے ہیں۔

چہارم۔ اپنے ساختہ و پرداختہ قوانین کو شرع متین پر ترجیح دے اور سنت و ملت کے طریقہ کی اہانت کرے، اور رد و قدح اور اعتراض و استہزاء کے ساتھ اس سے پیش آئے، اور اپنے آئین کے محاسن و منافع شمار کرتا رہے اور شریعت کو عوام فریب باتوں کی مانند محض ہرزہ گردی اور بیہودہ

سراکی میں سے سمجھے اور ملک العلام کے احکام اور سنت سید الانام علیہ
السلوٰۃ والسلام کو مزخرفات احمق فریب و ناداں پسند سے قرار دے اور
الجادوزندقہ کی بنیاد رکھے اسے ہم سلطنت کفر کہیں گے۔“
اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ”سلطنت عادلہ“ کی بھی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں
ایک ”سلطنت کاملہ“ اور دوسرے ”سلطنت ناقصہ“ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو سلطان عادل
اللہ کے خوف سے ظاہر شریعت کی پاس داری کرے وہ سلطان کامل ہے، اور جو مخلوق کے
خوف سے کرے وہ سلطان ناقص ہے، اس کے بعد شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں :

”سلطان کامل حکمی خلیفہ راشد ہے، یعنی اگرچہ خلافت راشدہ تک نہیں
پہنچی، لیکن خلافت راشدہ کے عہدہ آثار بعض نواہر شریعت کی خدمت
صدق و اخلاص سے اس سے صادر ہوں، پس اگر کسی وقت سلطان کامل
تحت سلطنت مستحکم ہو اور اس وقت امام حق کا بھی وجود ہو جو خلافت کی
لیاقت رکھتا ہے تو مناسب یہ ہے کہ امام حق منصب امامت پر قناعت
کرے اور اپنی کوشش ہدایت و ارشاد کی طرف مبذول کرے اور سلطان
کے ساتھ امور سیاست میں دست و گریبان نہ ہو اور رعایا اور لشکر کربنگ
و جدال کے پکا کرنے میں بے سرو سامان نہ کرے، اگرچہ خلافت راشدہ
کا منصب اعلیٰ اس کے ہاتھ سے جا رہا ہے، لیکن عباد اللہ کی خیر خواہی کے مد
نظر اس امر کو گوارا کر لے اور راضی بقضا ہو رہے اور تمام مسلمانوں پر
اس کو تصدق کر دے، جیسا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے سلطان شام
”امیر معاویہؓ“ سے یہی طریقہ اختیار کیا اور مخالفت کا دروازہ نہ کھولا، اسی
مصلحت کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف کی اور
فرمایا :

ان ابنی هذا سید لعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتنین عظیمتین
من المسلمین

۱۔ منصب امامت مترجمہ حکیم محمد حسین علوی ص ۹۷ تا ص ۹۹ گیلانی پریس لاہور ۱۹۳۹ء

(میرا یہ پٹا سید ہے ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں اس کے باعث اللہ تعالیٰ صلح کرا دے)۔

اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ سلطان کامل پر امت کا اجماع کرنا خدا اور رسولؐ کے فشاء کے مطابق ہے اور اس کی اطاعت درگاہ خداوندی میں مقبول ہے۔

تکلتہ دوم

سلطان کامل سلاطین اور خلفائے راشدین کے درمیان ایک برزخ کی طرح ہے، اگر لوگ دیگر سلاطین کو دیکھیں تو اس سلطان کامل کو خلیفہ راشد تصور کریں، اور اگر خلفائے راشدین کا حال معلوم کریں تو اسے سلطان کامل سمجھیں، چنانچہ سلطان شام (حضرت معاویہؓ) نے فرمایا۔

لست فیکم مثل ابی بکر و عمر ولیکن سترون امراء من بعدی
”میں تم میں ابو بکر و عمر جیسا حکمران تو نہیں ہوں لیکن میرے بعد عنقریب امیر دیکھو گے۔“

بناء بریں اس کی سلطنت کا زمانہ نبوت اور خلافت راشدہ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ پس اس وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے زمانہ کی ابتداء سے اس سلطنت کاملہ کا زمانہ گذر جانے تک ترقی اسلام کا زمانہ ہے۔“

ہمارے نزدیک خلافت اور ملوکیت کے باہمی فرق، ان کے مختلف مدارج، اور حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت کی اس سے بہتر تشریح و توجیہ نہیں ہو سکتی۔

ایک ضروری بات

حضرت معاویہؓ کے بارے میں کوئی گفتگو کرتے وقت دو باتیں ضرور یاد رکھنی چاہئیں، ایک تو یہ کہ ان کے خلاف ان کے زمانے ہی میں پروپیگنڈہ بہت زیادہ کیا گیا، خود حضرت معاویہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کو بڑھا پاپا بہت جلد آگیا، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ :

کیف لا ولا ازالاری رجلا من العرب قائما علی راسی یلقح
لی کلا ما یلزمنی جوابہ؛ فان اصبت لم احمد؛ وان اخطات
سارت بها البرود

”کیوں نہ ہو؟ ہر وقت عرب کا کوئی شخص میرے سر پر کھڑا رہتا ہے جو ایسی باتیں گھڑتا ہے جن کا جواب دینا لازم ہو جاتا ہے، اگر میں کوئی صحیح کام کروں تو کوئی تعریف نہیں کرے گا، اور اگر مجھ سے غلطی ہو جائے تو اسے اونٹنیاں، (ساری دنیا) میں لے اڑتی ہیں“

لہذا ان کے بارے میں تحقیق روایات کی ضرورت اوروں سے زیادہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں جو پروپیگنڈہ کیا گیا ہے اسے بلا تحقیق درست مان لیا جائے تو صرف حضرت معاویہؓ ہی کی ذات مجروح نہیں ہوتی، بلکہ دوسرے صحابہؓ پر طعن و تشنیع کا بھی دروازہ کھل جاتا ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ جو لوگ حضرت معاویہؓ پر الزام عائد کرنے میں جری ہو جاتے ہیں ان کی زبان دوسرے صحابہ کے خلاف اور زیادہ دراز ہو جاتی ہے۔ حضرت ربیع بن نافع نے کتنی سچی بات کہی تھی کہ :

معاویۃ ستر لاصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فاذا کشف
الرجل الستر اجتر علی ما وراءہ

”معاویہؓ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پردہ ہیں، جب کوئی شخص

اس پردے کو کھول دے گا تو اس کے پیچھے کے لوگوں پر اس کی جراتیں بڑھ جائیں گی۔“

اور اسی لئے جب حضرت عبداللہ بن مبارکؓ سے پوچھا گیا کہ حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ؟ تو حضرت ابن مبارکؓ نے فرمایا :

تراب فی آلف معاویۃ افضل من عمر بن عبدالعزیزؓ

”معاویہؓ کی ناک کی مٹی بھی عمر بن عبدالعزیزؓ سے بہتر ہے۔“
اور اسی لئے حضرت ابراہیم بن میسرہؓ کہتے ہیں کہ ”میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے کسی شخص کو مارا ہو“ البتہ ایک ایسے شخص کو کوڑوں سے مارا جس نے حضرت معاویہؓ کو برا بھلا کہا تھا“۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

حضرت معاویہ ^{رضی}

اور

خلافت و ملوکیت

حضرت معاویہ کے بارے میں احقر کے سابقہ مقالہ پر ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور میں ایک مفصل تنقید شائع ہوئی تھی جو تیرہ ماہ تک جاری رہی، اس کے جواب میں احقر کا جو مضمون ماہ نامہ البلاغ ذی الحجہ ۹۱ھ کے شمارے میں شائع ہوا وہ اس حصے میں پیش خدمت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد تقی عثمانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

★

اللہم فاطر السموت والارض انت تحکم بین عبادک فیما
کانوا فیہ یختلفون

حضرت معاویہؓ

اور

خلافت و ملوکیت

پچھلے سال ہم نے جناب مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کی کتاب ”خلافت و ملوکیت“ کے ایک حصے پر تبصرہ شائع کیا تھا۔ جو آٹھ قسطوں میں مکمل ہوا۔ ہم نے اپنے مقالے کے شروع ہی میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان موضوعات پر بحث و مناظرہ کو ہم پسند نہیں کرتے۔ لیکن چونکہ ہماری شامت اعمال سے یہ بحث ہمارے ملک میں چھڑ گئی، افراط و تفریط کے نظریوں نے ذہنوں کو بری طرح الجھا دیا، اور اس سلسلے میں ہم پر بھی سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوئی، اس لئے ہم نے چاہا کہ خالص علمی انداز میں جمہور اہلسنت کا معتدل موقف دلائل کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ جو حضرات مسئلے کی علمی حقیقت سمجھنا چاہیں، وہ ذہنی طور پر مطمئن ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ ہمارے اس مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی، ملک و بیرون ملک سے ہمارے پاس خطوط اور پیغامات کا آنا بندھا رہا، بیسیوں غیر جانبدار حضرات نے بتایا کہ اس مقالے نے ان کے دلوں کو مطمئن کیا اور شکوک و شبہات کے بت سے کانٹے نکال دیئے۔ اس بات پر ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔

”دار“ کے ساتھ ”بیداد“ بھی مصنف کا ہمیشہ سے مقدر رہی ہے، چنانچہ جن حضرات کو یہ مقالہ کسی وجہ سے پسند نہ آیا، انہوں نے بھی اسے اپنی نرم گرم ہر طرح کی تنقید سے

نوازا۔ بات تنقید سے آگے سب دوشنام تک بھی پہنچی، اور انتہا یہ کہ بعض جو شیلے حضرات نے ہمیں ”سوشلسٹ“ تک قرار دیا۔ اور نہ جانے کیسے کیسے القاب دیئے گئے۔ اس مقالے سے ہمارا مقصد صرف جمہور اہل سنت کے موقف کا مدلل اظہار تھا، اس موضوع پر بحث و مناظرہ کی فضا پیدا کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ ہمارے پاس مقالے کی تائید اور تردید میں خطوط اور مضامین کا ایک انبار لگ گیا تھا، لیکن ہم نے اپنی عدم فرصتی کے باوجود ہر ایک کو انفرادی جواب دینا گوارا کیا، اور ان میں سے کوئی ایک خط بھی شائع نہیں کیا، تاکہ یہ مسئلہ صرف اپنی علمی حدود میں رہے اور اس نازک دور میں محاذ جنگ نہ بن سکے۔ لیکن ابھی ہمارے مقالے کی صرف دو قسطیں ہی شائع ہوئی تھیں کہ مولانا سید ابوبلا علی موہودی صاحب کے ماہانہ رسالہ ترجمان القرآن میں جناب ملک غلام علی صاحب نے اس پر قسط وار مفصل تبصرہ شروع کر دیا، جو مسلسل تیرہ مہینے جاری رہنے کے بعد چند ماہ پہلے ختم ہوا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، ہمارا مقصد صرف اپنے موقف کا مدلل اظہار تھا، اس لئے ہمارا ارادہ اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کا نہیں تھا، ہماری دوسری زیادہ اہم مصروفیات بھی اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں، لیکن احباب کا شدید اصرار ہے کہ ملک صاحب کے مضمون پر تبصرہ ضرور کیا جائے، اور ملک صاحب کے پورے مضمون کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس پر تبصرہ کرنے کے لئے زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا، اس لئے بادل ناخواستہ اس موضوع پر دوبارہ قلم اٹھا رہا ہوں، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ اس موضوع پر ابلاغ کی آخری تحریر ہوگی، اگر کوئی صاحب اس سے مطمئن ہوں تو اسے قبول فرمائیں، اور اگر مطمئن نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ نظریات کے معاملے میں جبر نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن شروع میں یہ درد مندانہ التجا میں پھر کروں گا کہ اس نازک معاملے میں ذاتی جذبات اور جماعتی تعصبات کو درمیان سے ہٹا کر پوری تحقیقی غیر جانبداری سے کام لیا جائے، اور جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے اسے خالص انصاف و تقسیم کے ماحول میں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ پڑھا جائے۔ خدا شاہد ہے کہ ان گزارشات سے کسی کی تنقیص و توہین مقصود نہیں، نہ اس کے پیچھے بات کی بیخ بھرنے کا جذبہ کار فرما ہے، جو حضرات ابلاغ کو پابندی سے پڑھتے

رہے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ ہم نے اپنی کسی غلطی کے اعتراف میں کبھی تامل نہیں کیا بلکہ جہاں اپنی بات سچی کرنے میں دین کا کوئی فائدہ محسوس کیا ہے وہاں اپنا جائز حق بھی چھوڑ دیا۔ ہمارے پہلے مقالے کے پیچھے جذبہ صرف یہ کار فرما تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دین کی پوری عمارت کی بنیاد ہیں، اس بنیاد کی ایک اینٹ بھی اگر اپنی جگہ سے ہلائی جائے تو پورا قصر ایمان متزلزل ہو سکتا ہے، لہذا ان حضرات کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس تحریر کا فضاء بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مجموعی تاثرات

میں جناب ملک غلام علی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اتنی تفصیل اور بسط کے ساتھ میرے مقالے پر تبصرہ فرمایا، کسی مسلمان کی کوئی بات اگر غلط محسوس ہو تو جذبہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اسے اس پر متنبہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرنی ہیں :

(۱) تنقید کا مسئلہ اصول یہ ہے کہ جس شخص پر تنقید کی جارہی ہو، پہلے اسے اپنی بات پوری کرنے کا موقع دینا چاہئے، اس لئے کہ کسی کی بات کو انصاف کے ساتھ صحیح یا غلط اسی وقت کہا جاسکتا ہے جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا ہو، اسی اصول کے مطابق میں نے ملک صاحب کے مضمون پر اس وقت تک قلم نہیں اٹھایا جب تک ان کی تیرہ قسطیں پوری نہیں ہو گئیں، لیکن ملک صاحب نے تنقید کے اس اصول کا مطلق خیال نہیں فرمایا، ابھی میرے مضمون کی آٹھ قسطوں میں سے صرف دو ہی قسطیں منظر عام پر آئی تھیں کہ انہوں نے جواب دہی شروع کر دی، اس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنی ابتدائی اقتضا میں مجھ پر بہت سے وہ اعتراضات کئے ہیں جن کا مفصل جواب میرے آئندہ مضامین میں آگیا ہے، اور اس کے بعد انہوں نے اس جواب سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، نیز اگر وہ میرے مکمل مضامین پڑھ کر تنقید لکھتے تو شاید اس قسم کے الزامات عائد کرنے کی نوبت نہ آتی، کہ میرا میلان کسی بھی درجہ میں تاہمیت کی طرف ہے یا خود ان کے الفاظ میں انکار حدیث کی طرح میں ”انکار تاریخ اسلام“ کے کسی نئے مسلک کے بناء ڈال رہا ہوں۔

اس طرز عمل کا ایک نقصان خود ملک صاحب نے ذاتی طور پر یہ اٹھایا ہے کہ جو مقالہ میں نے ڈیزہ مینے میں لکھ دیا تھا، اس پر تنقید کے لئے موصوف کو پورے تیرہ مینے صرف کرنے پڑے، اور تیرہ مینے بھی وہ جن میں ملک کے اندر اسلام اور سوشلزم کا معرکہ اپنے شباب پر پہنچا ہوا تھا۔

(۲) علمی تنقید میں بہتر تو یہ ہوتا ہے کہ مخالف کی بات خود اسی کے الفاظ میں پوری کی پوری نقل کی جائے، لیکن اگر اختصار کے پیش نظر اس کی تلخیص ضروری ہو تو کم از کم خلاصہ نکالنے میں یہ رعایت ضرور ہونی چاہئے کہ اس کے استدلال کا کوئی اہم جز رہنے نہ پائے، ملک صاحب نے ہر جگہ میری بات کا خلاصہ نکالا ہے۔ مگر یہ خلاصہ بہت سے مقامات پر غیر محتاط اور بعض جگہ صراحتاً غلط ہے۔

(۳) جن حضرات کو میرے مقالے کے مندرجات سے اتفاق نہ ہو سکا انہوں نے بھی اس بات کا اظہار بہر حال کیا ہے کہ میری تنقید ایک خالص علمی انداز کی تنقید تھی جس میں طغی و تعریض اور ذاتی چھیننے اڑانے سے کھل کر ہیز کیا گیا تھا، خود ملک صاحب نے بھی دبی زبان سے اس کا اعتراف فرمایا ہے، لیکن افسوس ہے کہ خود انہوں نے تنقید کا جو انداز اختیار فرمایا وہ کسی طرح بھی ایک علمی بحث کے شایان شان نہیں تھا، میں نے عرض کیا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، انہام و تقسیم کے ماحول میں کہہ رہا ہوں، لیکن انہوں نے براہ راست مناظرہ کے اس اسٹیج سے گفتگو شروع کر دی جہاں مخالف پر طعن و تشنیع کرنے اور اس پر فقرے کسے اور چھیننے اڑانے کے بغیر کوئی بات نہیں ہوتی اور جہاں صرف اس کو ہی نہیں، اس کے اکابر کو اور جن مدارس میں اس نے تعلیم پائی ہے ان کو بھی مطعون کرنا زور بیان کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔

جہاں تک راقم الحروف کی ذات کا تعلق ہے، ملک صاحب اس پر جو طعن و تشنیع بھی فرمائیں مجھے ذاتی طور پر اس لئے کوئی اعتراض نہیں ہے کہ میں ”کم علم“ سے لے کر ”بے عمل“ تک ہر خطاب کو اپنے حق میں درست سمجھتا ہوں، لیکن ہم سب کو یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ اس انداز گفتگو کے ساتھ اس اسلام کی کوئی اچھی نمائندگی نہیں کر سکیں گے جو فرعون کے سامنے بھی نرم بات کہنے کی تلقین کرتا ہے۔

اگر ملک صاحب برائے نامیں تو ایک خیر خواہانہ گزارش اور ہے، اور وہ یہ کہ اول تو

علمی تنقیدوں میں طعن و تشنیع کا اندازنی نغمہ مناسب نہیں۔ دوسرے اگر کسی زمانے میں اس کو مستحسن سمجھا جاتا ہو تو اب یہ طریقہ سنجیدہ علمی حلقوں میں متروک ہو چکا ہے۔ اس دور میں طعن و تشنیع کے بارے میں عموماً تاثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے علمی دلائل کے خلا کو پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تیسرا اگر کسی کو طنز و تعریض کا ایسا ہی ذوق ہو تو پھر انشاء کی یہ صنف تھوڑا سا ریاض چاہتی ہے، اس کی نزاکتوں پر قابو پانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے، اور اس محنت کے بغیر انسان کو طنز اور جھنجھلاہٹ کا فرق سمجھ میں نہیں آتا۔ اس فن کا سب سے پہلا سبق یہ ہے طنز جھنجھلا کر دانت پینے کا نہیں، بلکہ تبسم زیر لب کے ساتھ چنگلی لینے کا نام ہے، اور جب یہ سبق ذہن نشین نہ ہو تو یہ گولی خود اپنے ہی اوپر چل جاتی ہے۔

بہر کیف! جہاں تک ملک صاحب کی تعریضات کا تعلق ہے، ان کے جواب میں تو صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ۔

تو دانی کہ مارا سر جنگ نیست
و گر نہ مجال سخن تنگ نیست

اور۔

آپ ہی اپنی اداؤں پر ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی
البتہ ان کے صرف ان دلائل پر مختصر تبصرہ ان صفحات میں پیش کر رہا ہوں، جو علمی
نوہیت کے ہیں اور جو واقعات ذہنوں میں غلط پیدا کر سکتے ہیں۔

بدعت کا الزام

”قانون کی بالاتری کا خاتمہ“ کے عنوان سے مولانا مووودی صاحب نے لکھا ہے:
”ان بادشاہوں کی سیاست دین کے تابع نہ تھی، اس کے تقاضے وہ
ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورا کرتے تھے اور اس معاملے میں حلال و حرام
کی تیز ردا نہ رکھتے تھے، مختلف خلفائے بنی امیہ کے عہد میں قانون کی
پابندی کا کیا حال رہا۔ اسے ہم آگے کی سطور میں بیان کرتے ہیں۔“

حضرت معاویہؓ کے عہد میں

یہ پالیسی حضرت معاویہؓ ہی کے عہد سے شروع ہو گئی تھی، امام زہریؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے نہ مسلمان کافر کا، حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانہ حکومت میں مسلمانوں کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اگر اس بدعت کو ختم کیا۔“

(خلافت و ملوکیت ص : ۱۷۳)

میں نے اس عبارت پر دو اعتراض کئے تھے :

(۱) مولانا مودودی صاحب نے خط کشیدہ جیلے میں امام زہریؒ کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو بدعت قرار دیا ہے، حالانکہ الہدایہ والتمایہ میں (جس کے حوالہ سے مولانا نے امام زہریؒ کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے) امام زہریؒ کا اصل عربی جملہ یہ ہے کہ :

راجع السنة الاولى ل

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پہلی سنت کو لوٹا دیا

”پہلی سنت کو لوٹا دینے“ اور ”بدعت کو ختم کرنے“ میں جو زمین آسمان کا فرق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

میرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے ”سنت اولیٰ“ کے لفظ کو ”بدعت“ سے کیوں بدلا؟ اگر مولانا خود حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو ”بدعت“ سمجھتے ہیں تو وہ اپنی طرف سے اسے بدعت فرمائیں، لیکن امام زہریؒ کی طرف وہ بات کیوں منسوب کی گئی جو انہوں نے ہرگز نہیں کی؟

ملک غلام علی صاحب نے میرے اس اعتراض کا اپنے طویل مقالے میں کوئی جواب

نہیں دیا۔

(۲) میرا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ خود مولانا مودودی صاحب نے جو حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو ”بدعت“ قرار دیا ہے، وہ درست نہیں، اس لئے کہ یہ حضرت معاویہؓ کا فقہی اجتہاد تھا، عہدۃ القاری اور فتح الباری کے حوالے سے میں نے کہا تھا کہ اس معاملہ میں صحابہ کے عہد سے اختلاف چلا آتا ہے، حضرت معاویہؓ کے علاوہ حضرت معاذ بن جبلؓ اور تابعین میں سے مسروقؓ، حسن بصریؓ، محمد بن حنفیہؓ اور محمد بن علی بن حسینؓ کا بھی یہی مسلک ہے کہ مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا جائے گا، اور یہ مسلک بے بنیاد بھی نہیں ہے، بلکہ حافظ ابن حجر نے اس مسلک کی بنیاد ایک مرفوع حدیث کو قرار دیا ہے۔

جو شخص بھی میرے مقالے میں یہ بحث پڑھے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کا یہ مسلک دلائل کے لحاظ سے زیادہ قوی اور راجح ہے، بلکہ میری گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ یہ ایک فقہی اجتہاد ہے جس سے دلائل کے ساتھ اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن اسے ”بدعت“ اور ”قانون کی بالاتری کا خاتمہ“ نہیں کہا جاسکتا، اور نہ اس پر اس قیاس کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سیاسی اغراض کے لئے حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھی۔

لیکن ملک غلام علی صاحب نے میرے اس اعتراض کے جواب میں جو طویل بحث فرمائی ہے اسکا حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ وغیرہ کے دلائل کمزور اور انکے مقابلے میں جمہور فقہاء کے دلائل مضبوط ہیں۔ حالانکہ اگر مولانا مودودی صاحب کا مقصد صرف یہی ہوتا کہ حضرت معاویہؓ کا یہ اجتہاد کمزور، مروج یا جمہور کے مسلک کے مطابق غلط ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا، اس صورت میں جتنے دلائل ملک صاحب نے حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذؓ کے مسلک کے خلاف پیش کئے ہیں، ہم ان پر دوچار کا اور اضافہ کر سکتے تھے، اس لئے کہ مسلک کے لحاظ سے ہم جمہور فقہاء ہی کے مسلک کے قائل ہیں اور وہی مسلک ہمارے نزدیک دلائل کے لحاظ سے مضبوط ہے، لیکن بحث تو یہاں ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ اپنے فقہی مسلک کی بناء پر ”بدعت“ کے مرتکب کس طرح ہو گئے؟ ہم نے حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذؓ کے حق میں جو دلائل پیش کئے تھے، اس سے انکے مذہب کی تائید کرنا یا اسے مضبوط قرار دینا مقصد نہیں تھا، بلکہ یہ دکھانا تھا کہ یہ حضرات مجتہد ہیں اور انکے قول کی ایک شرعی دلیل بھی ہے، وہ دلیل اگرچہ کمزور ہے

اور اسی لئے انکا مسلک مختار نہیں لیکن اس کی بناء پر انہیں بدعت کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جہاں تک ان کے مسلک کے دلائل کے لحاظ سے کمزور ہونے کا تعلق ہے، یہ مسئلہ ہمارے اور مولانا مودودی صاحب کے درمیان مختلف فیہ نہیں تھا اسلئے ہم نے اس سے تعرض نہیں کیا۔

صورت واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے درمیان بہت سے فقہی مسائل میں اختلاف رہا ہے، جن میں ہر فریق اپنے پاس کچھ دلائل رکھتا تھا، ایک مجتہد کو یہ تو اختیار حاصل ہے کہ انکے اقوال میں جس کے دلائل کو زیادہ مضبوط پائے، اسے اختیار کرے اور جس کے دلائل پر دل مطمئن نہ ہو اسے قبول نہ کرے، اور اسے اجتہادی غلطی قرار دے، لیکن ان جیسے مسائل میں کسی صحابی کے مسلک کو ”بدعت“ نہیں کہا جاسکتا اور نہ چودہ سو سال میں آج تک کسی صحابی کے فقہی مسلک کو، خواہ وہ بقا ہر کتنا ہی کمزور کیوں نہ معلوم ہو، بدعت قرار دیا گیا ہے، مثلاً ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کا یہ مسلک مشہور و معروف ہے کہ وہ ایک دن کی روزی سے زیادہ رقم اپنے پاس رکھنا حرام سمجھتے تھے، ظاہر ہے ان کا یہ مسلک قرآن و سنت کے واضح دلائل کے خلاف ہے، اسی وجہ سے صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی اس معاملہ میں ان کا ہم نوا نہیں تھا، سب کے نزدیک ان سے اس مسئلے میں اجتہادی غلطی ہوئی تھی، اور جمہور امت نے ہمیشہ دلائل کے ذریعہ اس مسلک کی تردید کی ہے، لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کا یہ فعل ”بدعت“ تھا، یا اس سے قانون اسلامی مجروح ہوتا تھا۔ ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں :

”سوال یہ ہے کہ اگر ایک طرف قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ

موجود ہوں، سنت نبویہ اور سنت خلفاء راشدین اربعہ موجود ہوں اور

دوسری طرف کسی صحابی یا تابعی کا قول یا فعل ہو جو صریحاً ان سب سے

متعارض ہو تو کیا اسے بھی دوسری سنت یا اجتہاد کا نام دیا جاسکتا ہے؟“

ملک صاحب کا منشاء غالباً یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس صحابی یا تابعی کے قول کو ”اجتہاد“ نہیں بلکہ ”بدعت“ کہا جائے گا، لیکن انہوں نے اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل بیان نہیں فرمائی، میرا جواب یہ ہے کہ اگر وہ صحابی یا تابعی مجتہد ہے، اور اپنے قول کی بنیاد کسی بھی شرعی دلیل پر رکھتا ہے (خواہ وہ شرعی دلیل ہمیں کمزور نظر آتی ہو) تو بلاشبہ

اسے "اجتہاد" ہی کہا جائے گا، اسے بدعت یا تحریف نہیں کہہ سکتے، ایسی صورت میں عمل تو بلاشبہ قرآن و حدیث اور خلفائے راشدین کی سنت ہی پر کیا جائے گا، صحابی کے منفرہ مسلک کو کمزور، مرجوح، یہاں تک کہ اجتہادی غلطی بھی کہا جاسکتا ہے، لیکن اسے "بدعت" قرار دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

صحابہ کرام کا معاملہ تو بہت بلند ہے، بعد کے فقہاء مجتہدین سے ایسے بے شمار اقوال مروی ہیں جو بظاہر قرآن و سنت کے خلاف نظر آتے ہیں، لیکن چونکہ ان کی کوئی نہ کوئی شرعی بنیاد کمزور یا مضبوط موجود ہے، اس لئے ایسے اقوال کو اجتہادی غلطی تو کہا گیا ہے لیکن "بدعت" کسی نے نہیں کہا۔ مثلاً امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا جان بوجھ کر چھوڑ دے تب بھی ذبیحہ حلال ہوتا ہے، لہٰذا حالانکہ قرآن کہہ کر می کر صریح آیت موجود ہے کہ :

ولا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ

اور اس (ذبیحہ) میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

جمہور فقہاء نے امام شافعیؒ کے اس مسلک کی تردید کی ہے، اسے کمزور کہا ہے اور اس پر عمل نہیں کیا، لیکن کیا کوئی ایک عالم بھی ایسا بتایا جاسکتا ہے جس نے اس مسلک کی وجہ سے امام شافعیؒ پر بدعت کا الزام عائد کیا ہو؟ وجہ یہی ہے کہ امام شافعیؒ مجتہد ہیں اور اپنے قول کی ایک شرعی بنیاد رکھتے ہیں، یہ بنیاد جمہور کے نزدیک کمزور سہی، لیکن ان کو "بدعت" اور "تحریف دین" کے الزام سے بری کرنے کے لئے کافی ہے۔ ورنہ اگر ملک صاحب کے اصول کے مطابق "بدعت" کے خطاب میں اتنی غیامی سے کام لیا جائے تو امت کا شاید کوئی مجتہد بھی اس نشتر کی زد سے نہیں بچ سکے گا کیونکہ ہر ایک کے یہاں ایک دو اقوال ضرور ایسے ملتے ہیں جو بظاہر قرآن و سنت کے خلاف نظر آتے ہیں اور جمہور امت نے اسی لئے انکو قبول نہیں کیا بلکہ رد کر دیا ہے مگر ان کے عمل کو بدعت کسی نے نہیں کہا۔

ہاں شرط یہ ہے کہ ایسے قول کا قائل اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو اور اسکے بارے میں یہ گمان نہ کیا جاسکتا ہو کہ وہ خواہشات نفسانی کی اتباع میں تحریف دین کا مرتکب ہوگا، امام شافعیؒ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ان الراى المذموم ما بنى على الجهل واتباع الهوى من غير ان يرجع اليه وما كان منه ذريعة اليه وان كان فى اصله محموداً وذلك راجع الى اصل شرعى فالاول داخل تحت حد البدعة وتتنزل عليه ادلة الذم والثانى خارج عنه ولا يكون بدعة ابداً

قابل مذمت رائے وہ ہے جو جمالت اور خواہشات کی پیروی پر مبنی ہو اور اس میں کسی اصل شرعی کی طرف رجوع نہ کیا گیا ہو اور رائے کی دوسری قسم وہ ہے جو اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے محمود ہو لیکن رائے مذموم کا ذریعہ بن سکتی ہے اور اسکی بنیاد کسی شرعی اصل پر ہوتی ہے ان میں سے پہلی قسم تودعت کی تعریف میں داخل ہے اور اسپر مذمت کے دلائل کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن دوسری قسم کی رائے اس سے خارج ہے اور وہ کبھی بدعت نہیں ہو سکتی۔

اور خود مولانا مودودی صاحب کی زبانی سنئے کہ وہ "اجتہاد" کی کیا تعریف فرماتے ہیں؟

"اجتہاد کی اصطلاح کا اطلاق میرے نزدیک صرف اس رائے پر ہو سکتا ہے جس کے لئے شریعت میں کوئی گنجائش پائی جاتی ہو اور "اجتہادی لفظی" ہم صرف اس رائے کو کہہ سکتے ہیں جس کے حق میں کوئی نہ کوئی شرعی استدلال تو ہو مگر وہ صحیح نہ ہو یا عجز کمزور ہو۔ (خلافت و ملوکیت، ص ۳۳۳)

اب ملک صاحب غور فرمائیں کہ توریت مسلم کے مسئلے میں انکی ساری بحث کا خلاصہ یہی تو نکلتا ہے کہ حضرت معاویہ اور حضرت معاویہ بن جبلی نے جس حدیث سے استدلال کیا

لے الشاطیٰ الاعظام، ص ۱۳۱ ج ۱، مطبعہ المنار مصر، ۱۳۳۲ھ

کے یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ملک صاحب نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں ایک راوی مجہول ہے، اول تو خود ابو داؤد ہی میں اس کے متصل روایت بغیر مجہول راوی کے آئی ہے دوسرے ملک صاحب کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ یہ سند کی تحقیق و تفتیش ہم لوگوں کے لئے تو دلیل ہے، لیکن جن صحابہ نے کوئی ارشاد براہ راست آپ سے سنا ہو ان کے لئے یہ بات حدیث کو رد کرنے کی وجہ کیسے ہو سکتی ہے کہ بعد کے راویوں میں کوئی شخص مجہول آیا ہے۔

ہے وہ استدلال ”بمجرد کمزور“ ہے یا زیادہ سے زیادہ ”صحیح نہیں“ لیکن اس سے خود مولانا سروروی صاحب کے بیان کے مطابق زیادہ سے زیادہ اجتہادی فطرتی ہی تو ثابت ہوتی ہے، بدعت ”کیسے ثابت ہوگئی؟“
ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں:

”اس سنت رسول اور سنت خلفائے راشدین کے بالمقابل امیر معاویہؓ کا ایک فیصلہ اور طریقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دوسری سنت ہے، یا یہ ایک فقیہ یا ایک مجتہد کا قیاس و اجتہاد ہے، یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے آجکل ڈاکٹر فضل الرحمن اور پرویز صاحب جیسے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہر امیر یا مرکز ملت جو کچھ طے کرے وہی سنت ہے۔“

جناب غلام علی صاحب ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں کہ وہ کیا بات فرما رہے ہیں؟ کیا میرے کسی ایک لفظ سے بھی یہ اشارہ کہیں نکلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا فعل ”امیر“ یا ”مرکز ملت“ ہونے کی حیثیت سے سنت ہے؟ بات تو یہ کہی جا رہی ہے کہ حضرت معاویہؓ صحابی اور فقیہ مجتہد ہیں، انہیں فقہی مسائل میں اجتہاد کا حق حاصل ہے، لہذا انکے اجتہادات کو بدعت یا تحریف دین نہیں کہا جاسکتا اور وہ ”امیر“ نہ ہوتے تب بھی انہیں یہ حق حاصل تھا، اور جب امیر بن گئے تب بھی ان اہلیت اجتہاد ختم نہیں ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی فقیہ مجتہد ”امیر“ بنجائے تو اسے محض ”امیر“ ہونے کے جرم میں اجتہاد سے محروم تو نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی صورت میں اسکے فقہی اجتہادات مرکز ملت کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مجتہد کی حیثیت سے جائز ہونگے۔

پھر ہمیں سخت حیرت ہے کہ ملک صاحب کو حضرت معاویہؓ اور پرویز صاحب کے مرکز ملت کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عام امراء کی طرح کوئی امیر نہیں بلکہ ایک صحابی، کاتب وحی اور صاحب فضائل و مناقب بزرگ ہیں، ان کے قیاس و اجتہاد اور بعد کے امراء کے قیاس و اجتہاد میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے، علامہ ابن قیمؒ سے زیادہ بدعات اور ”رائے مذموم“ کا دشمن اور کون ہوگا، لیکن سنئے کہ صحابہؓ کے قیاسات اور آراء کے بارے میں وہ کیا فرماتے ہیں:

”رأى افقه الامة وابر الامة قلوبا و اعمقها علما و اقلهم تكلفا و اصحهم قصودا و اكملهم فطرة و اتمهم ادراكا و اصفاهم انھانا الذين شاهدوا التنزيل و عرفوا التأويل و فهموا مقاصد الرسول فنسبة آرائهم و علومهم و قصودهم الى ما جاء به الرسول صلى الله عليه وسلم كنسبتهم الى صحبته و الفرق بينهم و بين من بعدهم فى ذلك كالفرق بينهم و بينهم فى الفضل فنسبة رأى من بعدهم الى رأىهم كنسبة قدرهم الى قدرهم“^۱

”ان حضرات کی رائے جو تمام امت میں سب سے زیادہ فقیر سب سے زیادہ نیک دل سب سے بڑھ کر عمیق علم رکھنے والے سب سے کم تکلفات کرنے والے سب سے بہتر نیتوں کے حامل اور سب سے زیادہ کامل الفطرت تھے جن کا ادراک سب سے زیادہ مکمل اور جن کے ذہن سب سے زیادہ جلا یا تھے“ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے نزول قرآن کا مشاہدہ کیا۔ اس کے معانی کو سمجھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد کو پہچانا، لہذا ان حضرات کی رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہے جیسی خود آنحضرت کی صحبت سے حاصل ہے، اور اس معاملے (رائے و اجتہاد) میں انکے اور انکے بعد والوں کے درمیان وہی فرق ہے جو فضیلت کے اعتبار سے انکے درمیان پایا جاتا ہے، لہذا بعد والوں کی رائے ان حضرات کی رائے کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہے جو ان جیسے لوگوں کی ان جیسے لوگوں کے ساتھ موجود ہے۔“

خلاصہ یہ کہ زیر بحث مسئلہ میں صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی رائے دلائل کے لحاظ سے مضبوط ہے یا کمزور، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان میں اجتہاد کی اہلیت ہے یا نہیں، اگر ان میں اجتہاد کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور وہ کسی فقہی مسئلے میں کوئی رائے دیتے ہیں تو خواہ وہ ہمیں کتنی ہی کمزور معلوم ہو

۱ ابن القیم: اعلام المؤمنین ص ۶۶ ج ۱، ادارة البعثة المیریہ

اس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن اسے بدعت قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اسکی ایک وجہ ہے کہ اس قسم کے شاذ مذاہب میں ہم تک صرف ان حضرات کے اقوال پہنچے ہیں انکے دلائل تفصیل کیساتھ نہیں پہنچ سکے ورنہ اگر انکے مکمل دلائل ہم تک پہنچتے تو شاید انکے مذاہب ہمیں اتنے بدیہی البطلان بھی معلوم نہ ہوتے۔

اب سنئے کہ حضرت معاویہؓ رضی اللہ عنہ کا علم و فقہ میں کیا مقام ہے؟ یہ روایت تو بہت سے محدثین اور مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی کہ:

اللہم عنہ معاویۃ الكتاب

اے اللہ معاویہؓ کو کتاب (قرآن) کا علم عطا فرما

نیز جامع ترمذی کی روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت معاویہؓ کے لئے دعا بھی فرمائی کہ:

اللہم اجعلہ ہادیاً مہیناً و اہدبہ

یا اللہ انکو رہنما اور ہدایت یافتہ بنا اور انکے ذریعہ لوگوں کو ہدایت دے

اور حافظ شمس الدین ذہبی نے سند کے ساتھ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو سواری پر اپنے پیچھے بٹھایا، پھر آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے جسم کا کون سا حصہ مجھ سے متصل ہے؟ حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ ”پیٹ“ آپ نے فرمایا:

اللہم املاہ علماً

”یا اللہ اسکو علم سے بھر دے“

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا قبول ہوئی۔ صحیح بخاری کی یہ روایت میں اپنے پہلے مقالے میں نقل کر چکا ہوں کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں فرمایا

اہ فقیہ

بلاشبہ وہ فقیہ ہیں

۱۔ البدایہ والنہایہ، ص ۱۳۲ ج ۸ مطبوعہ العادۃ مصر

۲۔ مشکوٰۃ المصابیح، ص ۱۵۷ ج ۱ مطبوعہ کراچی:

۳۔ الذہبی، تاریخ الاسلام، ص ۳۶ ج ۲

علامہ ابن القیمؒ نے اعلام المؤمنین میں اور حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں ان صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی شمار کرائے ہیں جو فقہ واجتہاد میں معروف تھے، انہوں نے صحابہ کرامؓ کے تین طبقے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جن سے بہت سے فتاویٰ مروی ہیں، دوسرے وہ جن سے ان سے کم فتاویٰ منقول ہوئے ہیں اور تیسرے وہ صحابہ جن سے بہت کم فتاویٰ ہم تک پہنچے ہیں، پھر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متوسط طبقے میں شمار کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ توریث مسلم من الکافر کے مسئلے میں فقہاء امت نے جہاں بھی صحابہؓ تابعین اور دوسرے فقہاء کے مذاہب شمار کرائے ہیں، وہاں حضرت معاویہؓ، حضرت معاذؓ بن جبل کے اس قول کو بھی بطور ایک فقہی مسلک کے ذکر کیا ہے اور چودہ سو سال کے عرصے میں کوئی ایک فقہہ ہماری نظر سے نہیں گذرا جس نے اس قول کو ”بدعت“ قرار دیا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص بھی حقیقت پسندی کے ساتھ ٹھنڈے دل سے ان حقائق پر غور کرے گا اس کے واسطے بات سمجھنے کے لئے یہ بحث کافی ہوگی، اور وہ یقیناً اس موقف کی تائید کرے گا کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو انکے اس فقہی مسلک کی بناء پر بدعت کا مرتکب قرار نہیں دیا جاسکتا۔

آخر میں ملک غلام علی صاحب کے دیجئے ہوئے ایک اور مغالطے کی نشاندہی ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

”مغنی ج ۷ ص ۲۶۶ پر ابن قدامہؒ پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد الخنیفہ، علی بن حسین، سعید بن المسیب، مسروق، عبد اللہ بن معقل، شیبی، ابراہیم نخعی، یحییٰ بن یعمر اور اسحاق کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلم کو کافر کا وارث قرار دیا ہے اسکے بعد فرماتے ہیں ولیس بموثق بہ عنہم (اور اسکی نسبت انکی جانب قائل اعتماد نہیں ہے۔) تقریباً یہی وہ نام ہیں جنہیں البلاغ میں بار بار دہرایا گیا ہے۔“

(ترجمان جون ۶۹ ص ۳۹)

اس عبارت سے ملک غلام علی صاحب کا منشاء یہ ہے کہ میں نے حضرت معاویہؓ کے

اس فقہی مسلک کے بارے میں جو کہا تھا کہ بہت سے حضرات تابعین نے بھی اس مسلک کو اختیار کیا ہے، اس کی تردید کی جائے، لیکن اس مقصد کے لئے انہوں نے المغنی کی عبارت کو جس طرح نقل کیا ہے، اور اسکے مجموعی مفہوم کے ساتھ جو زیادتی فرمائی ہے اسکا اندازہ پوری عبارت کو سیاق و سباق کے ساتھ دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے، علامہ ابن قدامہؒ کا پورا فقرہ یہ ہے:

روی عن عمر و معاذ و معاویة انہم ورتوا المسلم من الکافر ولم یورثوا الکافر من المسلم و حکى ذلك عن محمد بن الحنفية و علی بن الحسین و سعید بن المسیب و مسروق و عبد اللہ ابن معقل و الشعبی و النخعی و یحییٰ بن یعمر و اسحاق و لیس بموثوق به عنہم فان احمد قال: لیس بین الناس اختلافاً فی ان المسلم لا یرث الکافر۔

حضرت عمرؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت معاویہؓ سے یہ قول مروی ہے کہ انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث نہیں بنایا، یہی محمد بن حنفیہؒ، علی بن حسینؒ، سعید بن مسیبؒ، مسروقؒ، عبد اللہ بن معقلؒ، شعبیؒ، نخعیؒ، یحییٰ بن یعمرؒ اور اسحاقؒ سے بھی منقول ہے، لیکن ان حضرات کی طرف اس قول کی نسبت کا اہل اعتماد نہیں، اس لئے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا۔

اب یہ بوالہجہ ملاحظہ فرمائیے کہ علامہ ابن قدامہؒ نے شروع میں اس مسلک کی نسبت صرف محمد بن حنفیہؒ وغیرہ ہی کی طرف نقل نہیں کی ہے، بلکہ حضرت عمرؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف بھی نقل کی ہے، اور پھر آخر میں ان تمام ہی حضرات کے بارے میں فرمایا ہے، ”ان حضرات کی طرف اس قول کی نسبت کا اہل اعتماد ہے“۔ لیکن ملک غلام

ابن قدامہؒ: المغنی ص ۲۹۳ ج ۶ دار النور مصر ۱۳۶ھ

ابن قدامہؒ نے دلیل میں امام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ ”لوگوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے“ اس سے صاف واضح ہے کہ اس قول کی نسبت نہ حضرت معاویہؓ وغیرہ کی طرف درست ہے نہ محمد بن حنفیہؒ وغیرہ کی طرف۔

علی صاحب حضرت عمرؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت معاویہؓ کا نام حذف کر کے صرف محمد بن حنفیہ وغیرہ کے اسماء گرامی ذکر کرتے ہیں، اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ ابن قدامہ نے صرف ان حضرات کی طرف اس مسلک کی نسبت کو مشکوک بتایا ہے حالانکہ اگر ابن قدامہ کی بات ماننی ہے تو پوری مائے اور حضرت معاویہؓ کے بارے میں بھی یہ کہنے کہ انکی طرف بھی اس قول کی نسبت صحیح نہیں، لہذا مولانا موہودوی صاحب نے انکے خلاف جو بحث چھیڑی ہے وہ جزمول ہی سے غلط ہے، لیکن یہ آخر انصاف و دیانت کی کونسی قسم ہے کہ ابن قدامہ کی بات کو محمد بن حنفیہ کے بارے میں تو آپ واجب التسليم قرار دیتے ہیں، اور وہ اسی فقرے میں حضرت معاویہؓ کے بارے میں جو کہہ رہے ہیں کہ انکی طرف اس قول کی نسبت لائق اعتماد نہیں، تو اسے نقل تک نہیں کرتے، تاکہ یہ کہا جاسکے کہ حضرت معاویہؓ اپنے اس مسلک میں تہا ہیں، انکا کوئی ہم نوا نہیں، اور پھر مولانا موہودوی صاحب نے انہیں جو ”بدعت“ کا مرتکب بتایا ہے، اسکی تصدیق و تائید کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس طرز عمل پر سوائے اظہار افسوس کے اور کیا کیا جائے؟

نصف ویت کا معاملہ : دوسرے نمبر پر میں نے مولانا موہودوی صاحب کی اس عبارت پر تنقید کی تھی:

”حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ ویت کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا، سنت یہ تھی کہ معاہدہ کی ویت مسلمان کے برابر ہوگی۔ مگر حضرت معاویہؓ نے اسکو نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی۔ (خلافت طوکیٹ ص ۱۷۳ و ۱۷۴)

میں نے اس عبارت پر چار اعتراض کئے تھے :

(۱) خط کشیدہ جملہ مولانا موہودوی صاحب نے خود اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے، اصل کتاب میں یہ جملہ بالکل موجود نہیں ہے، نہ حافظ ابن کثیر نے یہ جملہ کہا، نہ امام زہری نے۔ ملک غلام علی صاحب نے میرا یہ اعتراض میری عبارت کے ذیل میں نقل کیا ہے، لیکن نہ تو اسکا کوئی جواب دیا ہے نہ مولانا موہودوی کی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔ عربی داں حضرات خود بھی البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹ ج ۸ کھول کر دیکھ سکتے ہیں۔

(۲) دوسرا اعتراض میں نے یہ کیا تھا کہ خط کشیدہ حصے کو چھوڑ کر باقی مقولہ کی نسبت حافظ ابن کثیر کی طرف کرنے میں بھی مولانا مودودی صاحب کو مغالطہ ہوا ہے یہ مقولہ حافظ ابن کثیر کا نہیں امام زہریؒ ہی کا ہے، میں نے لکھا تھا کہ: لہ

وبہ قال الزہری کے الفاظ اس پر شاہد ہیں

ایک دلچسپ غلطی :- میرے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ملک صاحب نے بڑی ہی دلچسپ بات لکھی ہے، فرماتے ہیں:

”مدیر البلاغ نے ابن کثیر کے قول کے ساتھ سابق فقرے کے آخری الفاظ ”وبہ قال الزہری کو غلط طریق پر ملا کر ابن کثیر کے قول کو امام زہری کا قول بنا دیا ہے حالانکہ قال اور بہ قال (یا قال بہ) کے معانی کا فرق تو انہیں معلوم ہونا چاہئے تھا اور اس بات سے بھی بے خبر نہ ہونا چاہئے تھا کہ بہ قال کے الفاظ کو بالعموم آخر میں لایا جاتا ہے اور اس کا اشارہ قول ماسبق کی جانب ہوتا ہے“ (ترجمان القرآن جون ۱۹۶۹ء صفحہ ۳۰)

اگر ملک غلام علی صاحب کے ذریعے ہماری عربی زبان کی معلومات میں کوئی اضافہ ہو جاتا تو ہم ان کے ممنون ہی ہوتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ”مدیر البلاغ“ کو ملک صاحب سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہو سکی، اس کے بجائے اس نے ”عربی مدارس کے ماحول“ میں تعلیم پائی ہے جہاں کا ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو جانتا ہے کہ ”بہ قال“ کی ایک قسم اور بھی ہے جو ہمیشہ روایت کے شروع میں آتی ہے، یہ محدثین کا جانا بوجھا طریقہ ہے کہ جب وہ ایک سند سے کسی کا ایک مقولہ ذکر کرتے ہیں اور پھر آگے اسی سند سے اسی شخص کا دوسرا مقولہ نقل کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مقولہ میں سند کا اعادہ کرنے کے بجائے شروع میں وہ بہ قال کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ کی ضمیر سند کی طرف راجح ہوتی ہے، یعنی وبہذا السنغال جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ”مذکورہ سند سے ہی اسکا یہ قول ہم تک پہنچا ہے۔“

لے ملک صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کہ ”اس سے نفس مسئلہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا“ ہمارے نزدیک یہ بات صاف ہوئی اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر سنن بیہقیؒ کی جو روایت ہم نے آگے نقل کی ہے، اس کا کماحقہ اثر ظاہر نہیں ہوتا۔

یہاں بھی ”بد قال الزہری“ کا جملہ اسی معنی میں آیا ہے، شروع میں حافظ ابن کثیرؒ نے تواریخ مسلم من الکافر کے سلسلے میں امام زہریؒ کا قول نقل کیا ہے، اس کے بعد چونکہ ”نصف سنت“ کے بارے میں امام زہریؒ کا مقولہ بھی اسی سند سے مروی تھا، اس لئے اس کے شروع میں ”بد قال الزہری“ کہہ دیا ہے، ملاحظہ فرمائیے: البدایہ والنہایہ کی پوری عبارت اس طرح ہے۔

وقال ابو الیمان عن شعيب عن الزهري: مضت السنة ان لا يرث الكافر المسلم ولا المسلم الكافر و اول من ورث المسلم من الكافر معاوية وقضى بذلك بنو امية بعده حتى كان عمر بن عبدالعزيز فر اجمع السنة واعاد هشام ما قضى به معاوية بنو امية من بعده وبه قال الزهري ومضت السنة ان دية المعاهد كدية المسلم وكان معاوية اول من قصرها الى النصف الخ

ابو الیمان شعیب سے اور وہ زہری سے روایات کرتے ہیں کہ سنت یہ چلی آتی تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو گا، نہ مسلمان کافر کا، یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز آئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا، پھر ہشام نے اس فیصلے کو لوٹا دیا جو حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے بنو امیہ نے کیا تھا، اور مذکور سند ہی سے امام زہریؒ کہتے ہیں کہ سنت یہ چلی آتی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی، معاویہؓ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اسے کم کر کے نصف کر دیا الخ.....

اب اگر ملک صاحب کے ارشادات مطابق و بد قال الزہری کے الفاظ کو اگلے فقرے کے بجائے سابق فقرے سے متعلق سمجھا جائے تو عبارت کا ترجمہ یہ ہو جائے گا کہ۔۔۔ ”پہلے وہ شخص جنہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا معاویہؓ ہیں، اسی پر ان کے بعد بنو امیہ فیصلے کرتے رہے یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز آئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا، پھر ہشام نے اس فیصلے کو لوٹا دیا، جو حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے بنو امیہ نے کیا تھا، اور یہی امام زہریؒ کا قول ہے۔“

اب یہ طرفہ تماشہ ملاحظہ فرمائیے کہ ایک طرف تو ملک صاحب اس بات پر مصر ہیں کہ

امام زہریؒ کے نزدیک حضرت معاویہؓ کا یہ فیصلہ سنت نہیں، بلکہ بدعت تھا، دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ بد قال الزہری کا تعلق توریت مسلم کے مقولہ سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ امام زہریؒ نے حضرت معاویہؓ ہی کے فیصلے کو صحیح قرار دیا ہے، اور جس چیز کو وہ "بدعت" سمجھتے ہیں اسی کو اپنا مذہب بھی بتایا ہے۔ کیا جناب ملک صاحب اس پر راضی ہیں؟ "مدیر البلاغ" کا جرم یہ ہے کہ اس نے اس مشکلہ خیز صورت حال کو دیکھ کر اتنا لکھ دیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب سے اس عبارت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے، یہ مقولہ حافظ ابن کثیرؒ کا نہیں، بلکہ امام زہریؒ ہی کا ہے و بد قال الزہری کے الفاظ اس پر شاہد ہیں، اور پھر غلط فہمی سے بچانے کے لئے بد قال الزہری کا ترجمہ بھی ان الفاظ کے ساتھ کر دیا تھا کہ "مذکورہ سند ہی سے امام زہریؒ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے۔" ہم سمجھتے تھے کہ اہل علم کے لئے اتنا اشارہ کافی ہو گا، لیکن ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ملک صاحب کے لئے اتنا اشارہ غلط فہمی کا سبب بن جائے گا، اور وہ جواب میں ہمیں "بد قال" کے مفہوم سے باخبر کرنے کی سعادت عطا فرمائیں گے۔

ہر کیف! جس شخص کو حدیث اور تاریخ کی عربی کتابوں سے ادنیٰ مہارت بھی رہی ہو وہ اس تشریح کے بعد اس حقیقت میں شبہ نہیں کر سکتا کہ حدیث کے بارے میں یہ مقولہ حافظ ابن کثیرؒ کا اپنا نہیں، بلکہ امام زہریؒ کا ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے صرف اسے نقل کیا ہے۔ (۳) اس کے بعد ہم نے عرض کیا تھا کہ امام زہریؒ کا یہ قول یہاں اختصار اور اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے، اس کی پوری تفصیل بیہقیؒ نے اپنی سنن کبریٰ میں روایت کی ہے، اور اس میں یہ تصریح ہے کہ حضرت معاویہؓ آدمی حدیث منقول کے ورثاء کو دیتے تھے، اور باقی نصف بیت المال میں داخل کر دیتے تھے، لہذا آدمی حدیث کو اپنے ذاتی استعمال میں لانے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ بالکل صاف اور سیدھی سی بات تھی کہ حافظ ابن کثیرؒ نے امام زہریؒ کا مقولہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔ بیہقیؒ نے تفصیل کے ساتھ، لہذا اعتبار بیہقیؒ کی روایت کا ہو

۱۔ السنن الکبریٰ للبیہقیؒ ص ۱۰۲ ج ۸، دائرة المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۳۵۳ھ پوری عبارت کے لئے ملاحظہ ہو یہی کتاب ص ۲

گا، اور اس کی موجودگی میں یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ حضرت معاویہؓ نے آدمی دیت اپنے استعمال میں لانی شروع کر دی تھی، مولانا مودودی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے :-

”تمام بزرگان دین کے معاملہ میں عموماً اور صحابہ کرامؓ کے معاملہ میں خصوصاً میرا طرز عمل یہ ہے کہ جہاں تک کسی معقول تاویل سے یا کسی معتبر روایت کی مدد سے ان کے کسی قول یا عمل کی صحیح تعبیر ممکن ہو، اسی کو اختیار کیا جائے اور اس کو غلط قرار دینے کی جسارت اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اس کے سوا چارہ نہ رہے۔“

(خلافت و ملوکیت ص ۳۰۸)

اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ سنن بیہقی کی اس ”معتبر روایت“ کو دیکھ کر مولانا کی طرف سے مسرت کا اظہار ہو گا کہ ”اس کی مدد سے“ حضرت معاویہؓ کے فعل کی صحیح تعبیر مل گئی، لیکن افسوس ہے کہ ملک غلام علی صاحب کو اب بھی اس بات پر اصرار ہے کہ حضرت معاویہؓ آدمی دیت ذاتی استعمال ہی کے واسطے لیتے تھے، اور بیہقی کی روایت میں جو بیت المال کا لفظ آیا ہے اس سے مراد بھی حضرت معاویہؓ کی ذات ہی ہے۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں؛

”واقعہ یہ ہے کہ مورخین نے دوسرے مقامات پر بھی امیر معاویہؓ اور دوسرے بنو امیہ کے عائد کردہ غنائم و محاصل کے لئے دونوں طرح کے الفاظ استعمال کئے ہیں، ایک ہی واقعہ میں کہیں لنفسہ کا لفظ ہے اور کہیں لبیت المال کا لفظ، اب اگر بیت المال کی پوزیشن فی الواقع امیر معاویہؓ اور آپ کے جانشینوں کے زمانے میں وہی ہوتی جو عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں تھی، تب تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہر جگہ لنفسہ سے مراد لبیت المال المسلمین ہے، لیکن بیت المال اگر ذاتی اور سیاسی مقاصد و اغراض کے لئے بلا تامل اور بے دریغ استعمال ہونے لگے، فرمانروا کے صرف خاص اور قوم کے بیت المال میں عملاً کوئی فرق نہ رہے اور مسلمانوں کا امیر بیت المال کے آمد و خرچ اور حساب و کتاب کے معاملے میں مسلمانوں کے سامنے جوابدہ نہ رہے تو پھر صورتحال الٹ جاتی ہے، اس صورت میں اخذ

بیت المال بھی اخذ لنفسہ بن کر رہ جاتا ہے۔“
 ہماری پہلی گزارش تو یہ ہے کہ اگر ملک صاحب کے اس ارشاد گرامی کے مطابق
 حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں ”اخذ لبیت المال“ بھی ”اخذ لنفسہ“ بن کر رہ گیا
 ہے تو ملک صاحب کو چاہئے کہ تاریخ میں جن جن مقامات پر حضرت معاویہؓ کا بیت المال کے
 لئے کچھ لیٹا نہ کر رہا ہے، ان سب کو حضرت معاویہؓ کے ”جرائم“ کی فہرست میں شامل فرمائیں،
 اور جب کوئی پوچھے کہ یہ فعل جرم کیسے ہوا تو یہی بیخ جواب دہرا دیں کہ حضرت معاویہؓ کے
 حق میں اخذ لبیت المال کا جملہ اخذ لنفسہ کے معنی دیتا ہے۔

پھر کیا جناب غلام علی صاحب کوئی دلیل ایسی پیش کر سکتے ہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ
 حضرت معاویہؓ نے بیت المال کی رقوم اپنے ذاتی استعمال میں لانی شروع کر دی تھیں؟ اور
 عملاً ان کے ذاتی صرف اور بیت المال میں کوئی فرق نہیں رہا تھا؟ عجیب بات ہے کہ دعویٰ تو
 وہ کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بیت المال ذاتی اغراض کے لئے بے دریغ
 استعمال ہونے لگا تھا، مگر خود اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل پیش کرنے کے بجائے اس دعوے
 کی نفی پر دلیل ہم سے طلب فرماتے ہیں کہ:

”کیا کوئی شخص یہ بتا سکتا ہے کہ ان کے عہد خلافت میں خلیفہ کے لئے
 ایک مشاہدہ متعین کروا گیا ہو اور بیت المال کے مصارف ان کے ذاتی
 مصارف سے بالکل الگ رکھے گئے ہوں۔“

حالانکہ بیت المال کی پوزیشن میں تبدیلی کا دعویٰ خود انہوں نے کیا ہے اور دنیا بھر کے
 مسلمہ اصول استدلال کی رو سے دلیل اس کے ذمہ ہے جو تبدیلی کا دعویٰ ہے، جو شخص تبدیلی
 کا انکار کرتا ہے اس کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تبدیلی کی کوئی دلیل نہیں۔ اس لحاظ سے
 ان کے دعوے کی تردید کے لئے دلیل پیش کرنا ہماری ذمہ داری نہیں تھی، مگر تیرے ہم یہ دلیل
 پیش کرتے ہیں، اس مقالے کی تحریر کے دوران حضرت معاویہؓ سے متعلق حدیث اور
 تاریخ کی بیسیوں کتابیں ہماری نگاہ سے گزری ہیں، ہمیں تو کہیں اس کا ادنیٰ ثبوت بھی نہیں
 مل سکا کہ وہ بیت المال کو ذاتی مصارف میں خرچ کرنے لگے تھے، اس کے بجائے ایک ایسی
 روایت ملی جو شاید ملک صاحب کی بصیرت میں اضافہ کر سکے، حافظ شمس الدین ذہبی رحمۃ
 اللہ علیہ سند حسن کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

عن معاویة وصعد المنبر يوم الجمعة فقال عند خطبته ايها الناس ان المال مالنا والفقير فينا من شئنا اعطينا ومن شئنا منعنا فلم يجبه احد فلما كانت الجمعة الثانية قال مثل ذلك فلم يجبه احد فلما كانت الجمعة الثالثة قال مثل مقابلة فقام اليه رجل فقال كلا! انما المال مالنا والفقير فينا من حال بيننا وبينه حكمناه الى الله باسيافنا فنزل معاوية فارسل اليه الرجل فادخل عليه فقال القوم هلك ففتح معاوية الابواب ودخل الناس فوجدوا الرجل معه على السرير فقال ان هذا احياني احياء الله سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ستكون ائمة من بعدي يقولون فلا يرد عليهم قولهم يتقوا حمون في النار تقا حم القرنة واني تكلمت فلم يرد علي احد فخشيت ان اكون منهم فتكلمت الثانية فلم يرد علي احد فقلت في نفسي اني من القوم ثم تكلمت الجمعة الثالثة فقام هذا فرد علي فاحياني احياء الله فرجوت ان يخرجني الله منهم فاعطاه وجاهه

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ جمعہ کے دن منبر پر چڑھے اور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ”ساری دولت ہماری دولت ہے اور سارا مال قیمت ہمارا مال ہے ہم جس کو چاہیں گے دیں گے اور جس کو چاہیں گے روک دیں گے۔“ اس پر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا جب دوسرا جمعہ آیا تو انہوں نے پھر یہی بات دہرائی مگر کوئی نہ بولا پھر جب تیسرا جمعہ آیا تو حضرت معاویہؓ نے پھر یہی بات کہی تو ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا: ”ہرگز نہیں! مال تو سارا ہمارا ہے مال قیمت بھی ہم سب کا ہے جو شخص ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہوگا ہم اپنی تلواریں ذریعہ اس کا فیصلہ اللہ کے پاس لے جائیں گے۔“ یہ سکر حضرت معاویہؓ منبر سے اترے اس شخص کو بلوا بھیجا جب اسے حضرت معاویہؓ کے پاس داخل کیا گیا تو لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص مارا گیا لیکن حضرت معاویہؓ نے دروازے کھول دیئے لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ شخص انکے

ساتھ چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے، اس پر حضرت معاویہؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص کو زندہ رکھے، اس نے مجھے زندہ کر دیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”میرے بعد کچھ امراء ایسے آئیں گے جو (غلط) باتیں کہیں گے، مگر ان کا جواب نہیں دیا جائے گا، ایسے لوگ آگ میں بندروں کی طرح داخل ہوں گے۔“ میں نے (اپنا امتحان کرنے کے لئے) ایک بات کہی تھی، کسی نے اس کی تردید نہ کی، تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میں ان امراء میں داخل نہ ہو جاؤں، تو میں نے دوبارہ وہی بات کہی، پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں انہی لوگوں میں سے ہوں، پھر میں نے تیسرے جمعہ میں وہی بات کہی تو یہ شخص کھڑا ہو گیا، اور اس نے میری تردید کی، اور اللہ سے زندہ رکھے، اس نے مجھے زندہ کر دیا اب مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسے امراء کے زمرہ سے نکال دیگا۔ پھر حضرت معاویہؓ نے اس شخص کو انعام دیا۔“

حافظ ذہبیؒ یہ روایت نقل کر کے فرماتے ہیں:

ہذا حدیث حسنہ

(سند کے لحاظ سے) یہ حدیث حسن ہے

اور سنئے! محمد بن عوف طائیؒ اپنی سند سے عطیہ بن قیسؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت معاویہؓ کو خطبہ میں فرماتے ہوئے سنا کہ: ”تمہارے بیت المال میں وظائف ادا کرنے کے بعد بھی کچھ رقم بچ گئی ہے اب میں وہ بھی تمہارے درمیان تقسیم کر رہا ہوں، اگر آئندہ سال بھی رقم بچ گئی تو وہ بھی تقسیم کر دیں گے ورنہ مجھ پر کوئی الزام نہ ہوگا“ فاندلیس بمالی وانما هو مال اللہ النبی افاض علیکم“ اس لئے کہ وہ میرا مال نہیں بلکہ اللہ کا مال ہے جو اللہ نے تم کو بطور نعمت عطا کیا ہے“

کیا اب بھی ملک صاحب یہ فرمائیں گے کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بیت المال

۱۔ الذہبیؒ تاریخ الاسلام ص ۳۲۱ و ۳۲۲ ج ۲ مکتبۃ القدسی ۱۳۶۸ھ

۲۔ ابن تیمیہؒ مشاہیر السنہ ص ۱۸۵ ج ۳ بولاق ۱۳۲۲ھ

ذاتی اغراض کے لئے بے دریغ استعمال ہونے لگا تھا؟

(۴) چوتھا اعتراض میں نے یہ کیا تھا کہ مسئلہ عمد صحابہؓ ہی سے مختلف فیہ چلا آتا ہے کہ ذمی کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی یا اس سے آدھی یا تہائی، میں نے عرض کیا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں مختلف احادیث مروی ہیں، کسی میں پوری دیت ادا کرنے کا حکم ہے، کسی میں آدھی کا، اسی لئے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی آدھی دیت لینے کا حکم مروی ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عمل بھی اسی پر رہا، اور امام مالکؒ کا بھی یہی مذہب ہے، امام ابوحنیفہؒ پوری دیت والی روایت کو ترجیح دیتے ہیں، اور مسلمان اور ذمی کی دیت میں کوئی فرق نہیں کرتے، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دونوں مذاہب کی درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے متعارض احادیث میں تطبیق دی اور یہ مسلک اختیار کیا کہ آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دلوائی اور آدھی بیت المال کو۔ میں نے صرف یہ صاف لکھا تھا کہ یہ حضرت معاویہؓ کا فقہی اجتہاد ہے جس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اسے بدعت نہیں کہا جاسکتا۔

ملک صاحب نے اس کے جواب میں پھر حضرت معاویہؓ کے دلائل پر گفتگو کر کے انہیں کمزور کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کے مقابلے میں اپنے دلائل پیش کئے ہیں، اگرچہ ان کے بیان کئے ہوئے دلائل پر بھی کلام کیا جاسکتا ہے، لیکن ہمارے خیال میں یہ پوری بحث بالکل غیر متعلق ہے، اس لئے کہ بحث سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے دلائل مضبوط ہیں یا کمزور، ہم خود بھی مسلک کے لحاظ سے حضرت معاویہؓ کے مسلک کے قائل نہیں ہیں، گفتگو تو یہ ہے کہ ایک قیصر مجتہد کے کسی فقہی مسلک کو دلائل کے لحاظ سے کمزور قرار دینے کے بعد بھی اسے بدعت نہیں کہا جاسکتا اور ہم سمجھتے ہیں کہ ”توریت مسلم“ کے مسئلے میں ہم اس پر کافی بحث کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مال غنیمت میں خیانت : مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

”مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی

رو سے پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم ہونے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہو، لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لئے الگ نکال دیا جائے، پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔“

مولانا مودودی صاحب نے اس واقعہ کے لئے پانچ کتابوں کے حوالے دیئے تھے، جن میں سے ایک البدایہ والنہایہ ص ۲۹ جلد ۸ کا حوالہ بھی تھا، میں نے اس حوالے کی مکمل عبارت نقل کر کے ثابت کیا تھا کہ اس میں صاف یہ الفاظ موجود ہیں کہ بجمع کلمہ من ہذہ الغنیمۃ لبیت المال (اس مال غنیمت کا سارا سونا چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا جائے۔) ایسی صورت میں مولانا مودودی صاحب کے لئے جائز نہیں تھا کہ وہ اس کتاب کے حوالے سے یہ تحریر فرمائیں کہ ”حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا“ ان کے لئے الگ نکال لیا جائے (محترم ملک غلام علی صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”مولانا مودودی نے اس بات کی سہ میں پانچ کتابوں کے حوالے دیئے تھے جن میں سے پانچواں اور سب سے آخری حوالہ البدایہ والنہایہ کا تھا۔ اب جناب محمد تقی صاحب نے کیا یہ ہے کہ باقی کتابوں کو چھوڑ کر صرف البدایہ کا حوالہ نقل کر دیا ہے۔“

ملک صاحب نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے فرمائی ہے کہ جیسے میں نے البدایہ کا حوالہ نقل کر کے کسی جرم عظیم کا ارتکاب کیا ہے، سوال یہ ہے کہ جب مولانا مودودی صاحب نے البدایہ کا حوالہ بقید صفحات خود اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے، اور ساتھ ہی ضمیمہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

”صحاب علم خود اصل کتابوں سے مقابلہ کر کے دیکھ سکتے ہیں“ (خلافت و

ملوکیت ص ۲۹۹)

تو کیا یہاں ”البدایہ“ کی طرف رجوع کرنا محض اس وجہ سے گناہ ہو گیا ہے کہ اس سے مولانا مودودی صاحب کی ایک غلطی واضح ہوتی ہے؟ یہ درست ہے کہ باقی چار حوالوں میں بیت المال کا لفظ نہیں ہے، لیکن میں ایک مثال

پیش کرتا ہوں (جسے محض بات سمجھنے کے لئے پیش کیا جا رہا ہے، اس لئے اس پر برامانے کی کوئی وجہ نہیں) ملک صاحب غور فرمائیں کہ اگر چار اخباروں میں یہ خبر شائع ہو کہ ”مولانا موودوی صاحب نے اپنے لئے ایک لاکھ روپیہ چندہ وصول کیا“ اور ایک پانچویں اخبار میں خبر کے الفاظ یہ ہوں کہ ”مولانا موودوی صاحب نے جماعت اسلامی کے لئے ایک لاکھ روپیہ چندہ وصول کیا“ پھر کوئی شخص ان پانچوں اخباروں کے حوالے سے مولانا پر یہ الزام عائد کرے کہ وہ اپنی ذات کے لئے چندہ وصول کرتے ہیں، تو کیا ملک صاحب اس الزام تراش شخص کو پانچواں اخبار محض اس لئے نہیں دکھائیں گے کہ اس کا حوالہ پانچویں نمبر پر سب سے آخر میں دیا گیا تھا؟

ظاہر ہے کہ اس شخص سے یہی کہا جائے گا کہ پانچویں اخبار میں صراحت کے ساتھ ”جماعت اسلامی“ کا لفظ موجود ہے اس لئے تمہارے لئے جائز نہیں تھا کہ اس اخبار کا حوالہ بھی دو، اور یہ بھی کہو کہ مولانا موودوی صاحب نے یہ چندہ اپنی ذات کے لئے وصول کیا ہے، اس کے علاوہ ہر معقول آدمی ان پانچوں اخبارات کو پڑھ کر یہ کہے گا کہ دراصل پہلے چار اخبارات میں خبر مجمل اور مختصر شائع ہوئی ہے، اور پانچویں اخبار نے اصل حقیقت واضح کر دی ہے، اس لئے اعتبار اسی کا ہو گا، پہلے اخبارات نے یا تو معاملہ کی تحقیق نہیں کی یا ان کے رپورٹروں نے مولانا سے عناد کی بناء پر اس چندے کو مولانا کی ذات کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہی بات میں نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں کہہ دی تو کون سا گناہ کیا؟ یہاں تو پانچ حوالوں کا معاملہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر دس کتابوں میں بھی حضرت معاویہؓ یا کسی اور صحابیؓ تاہمی یا کسی بھی شریف آدمی کی طرف ایک مجمل بات منسوب کی گئی ہو جس سے اس کی ذات پر کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہو اور کوئی گیارہویں کتاب اس کی تفصیل بیان کر کے حقیقت واضح کر دے تو عقل، دیانت اور انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ دس کی دس کتابوں کو اسی آخری کتاب کی تشریح پر محمول کیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ مولانا موودوی صاحب کی یہ غلطی دو اور دو چار کی طرح واضح ہے، اسے سمجھنے کے لئے کسی لمبے چوڑے فلسفے کی ضرورت نہیں، اور اگر کوئی شخص اتنی واضح غلطی کو بھی صحیح قرار دینے پر اصرار کرے تو اسے اعلان کر دینا چاہئے کہ وہ مولانا موودوی

صاحب کو معصوم اور غلطیوں سے پاک تصور کرتا ہے۔ ساری دنیا کی آنکھیں فریب کھا سکتی ہیں، لیکن ان کے قلم سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہو سکتی۔

ملک صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ان پانچوں مورخین میں سب سے آخر میں آئے ہیں، اس لئے ان کا قول پہلے مورخین کے مقابلے میں مرجوح ہے، لیکن اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے جتنی باتیں پہلی تواریخ کے خلاف یا ان سے زائد نقل کی ہیں، وہ ساری کی ساری رد کر دی جائیں، کیونکہ پہلی تواریخ میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے، پھر تو حافظ ابن کثیر نے فضول ہی ایک مستقل تاریخ لکھنے کی تکلیف گوارا کی، انہیں چاہئے تھا کہ پہلی تواریخ ہی پر اکتفاء فرمالیے، اور ایک حافظ ابن کثیر ہی پر کیا موقوف ہے اگر تاریخ کا بعد میں لکھا جانا اس کی تردید کی دلیل ہے تو اسلام میں جو تاریخ سب سے پہلے لکھی گئی تھی اس کے بعد کسی کو بھی اس موضوع پر قلم نہیں اٹھانا چاہئے تھا، اور اگر کسی نے اٹھایا تھا تو ساری امت کو چاہئے تھا کہ بعد کی تمام تواریخ کو نذر آتش کر دیتی کہ ان سے گراہیاں پھیلتی ہیں۔

مولانا مودودی صاحب کی اس صریح غلطی کی تاویل کرنے کے لئے جناب غلام علی صاحب نے دلچسپ ترین بات یہ لکھی ہے کہ ”اٹھویں صدی ہجری تک ابن کثیر سے پہلے جن لوگوں نے اس واقعہ کو نقل و روایت کیا ہے اور جنہوں نے ان پہلی تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے کیا ان کا یہ بیان کرنا یا یہ سمجھنا بالکل غلط ہو گا کہ امیر معاویہؓ نے یہ مال اپنی ذات کے لئے طلب کیا تھا؟“ ملک صاحب کا منشاء غالباً یہ ہے کہ اگر ایک تاریخی حقیقت کے مجمل رہنے کی وجہ سے ساتویں صدی تک کے انسان کسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہوں، اور اٹھویں صدی میں وہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آئی ہو تو بعد کے لوگوں پر بھی واجب ہے کہ وہ حقیقت کے اس انکشاف سے آنکھیں بند کر کے بدستور غلط فہمی ہی میں مبتلا رہیں، اور محض اس لئے اس حقیقت پر کان نہ دھریں کہ وہ ساتویں صدی کے لوگوں پر واضح نہیں ہو سکتی تھی۔

یوں ملک صاحب کے مزید اطمینان کے لئے ہم یہ وثوق کے ساتھ عرض کر سکتے ہیں کہ ساتویں صدی تک کے لوگوں نے بھی ان الفاظ کا یہی مطلب لیا ہو گا کہ حضرت معاویہؓ نے یہ مال اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ بیت المال کے لئے منگایا تھا، اس لئے کہ وہ لوگ زبان و بیان کے محاورات سے اتنے بے خبر نہیں تھے کہ الفاظ کے ظاہر ہی کو تھام کر بیٹھ جائیں اور اس

بات سے قطع نظر کر لیں کہ اگر ایک امیر سلطنت اپنے کسی ماتحت کو یہ حکم لکھ کر بھیجے کہ ”خراج کا روپیہ مجھے بھیج دو“ تو محاورہ ”مجھے“ سے مراد اپنی ذات نہیں ہوتی، بلکہ سرکاری خزانہ ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص اس ”مجھے“ کے لفظ کو پکڑ کر بیٹھ جائے تو اس کو خلفائے راشدین کے احکام میں بھی (معاذ اللہ) خیانت کی بو آسکتی ہے۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ سونا چاندی اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ بیت المال کے لئے منگایا تھا، اس سلسلے میں ملک صاحب نے جو تاویلات۔۔ ذکر فرمائی ہیں، انکا جواب بھی عرض کر دیا گیا، اور میں سمجھتا ہوں کہ خود ملک صاحب بھی جب کبھی تمنا کی میں اپنی ان تاویلات پر غور فرمائیں گے تو انہیں کوئی خوشی نہیں ہوگی۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ بیت المال ہی کے لئے سسی سارا سونا چاندی طلب کر لینا شرعاً کہاں جائز ہے؟ اس کا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ اگر سارا سونا چاندی پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ ہو تو یہ حکم شریعت کے مطابق ہو جاتا ہے، بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہوگی اس لئے حضرت معاویہؓ نے یہ حکم دے دیا کہ سارا سونا چاندی (جو حضرت معاویہؓ کے اندازے کے مطابق کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ تھا) بیت المال میں بھیج دیا جائے ملک صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

”یہ استدلال بھی مہمل ہے کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی کمی تھی جسے امیر معاویہؓ پورا کرنا چاہتے تھے، اس زمانے میں مبادلہ زر اور تبادلہ اشیاء کا نظام زیادہ پیچیدہ نہ تھا، اور سونے چاندی کے ذخائر بیت المال کے استحکام کے لئے محفوظ رکھنے کی خاص ضرورت نہ تھی۔“

اب یہ مقام تو ہمارے محترم نقاد ہی کو حاصل ہے کہ وہ چودہ سو سال پہلے کی حکومت کے بارے میں اس زمانے کے حکمران سے بھی زیادہ صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی ضرورت تھی یا نہیں تھی، ہمیں کشف والہام کا یہ کمال تو حاصل نہیں، لہذا ہمیں یہ جرأت بھی نہیں ہے کہ اپنے اندازے کے خلاف ہر امکان کو ”مہمل“ قرار دے دیں، لیکن جو تھوڑی سی عقل اللہ نے دی ہے، اس سے اتنا خیال ضرور ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو نظام زر (MONETARY SYSTEM) رائج تھا، وہ دودھاتی

معیار (BI-METALISM) پر مبنی تھا جس میں بیت المال کو سونے چاندی کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس نظام میں کسے بھی سونے چاندی ہی کے چلتے تھے اور آج کل کی طرح سونے چاندی کی کمی زائد نوٹ چھاپ کر پوری نہیں کی جاسکتی تھی، اس لئے بیت المال کے استحکام کے لئے سونے چاندی کی ضرورت آج سے زیادہ ہو تو ہو، کم کسی طرح نہیں تھی۔

اور اگر بالفرض اس وقت بیت المال کو سونے چاندی کی ضرورت آج کے مقابلے میں کم ہوتی تھی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ضرورت پڑتی ہی نہیں تھی؟ اور کیا اس دور میں کسی ایسے وقت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا جس میں بیت المال کے اندر سونا چاندی ضرورت کے مقابلے میں کم ہو گیا ہو؟

ملک غلام علی صاحب نے تاریخ طبریؒ کی ایک روایت پیش کر کے کہا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے صرف سونا چاندی ہی نہیں بلکہ دوسری نفیس اور عمدہ اشیاء (الروائع) بھی طلب کی تھیں، لیکن طبریؒ کی اس روایت میں کئی راوی مجہول الحال ہیں، اس کے مقابلے میں خود انہوں نے مستدرک حاکمؒ کی جو روایت نقل کی ہے وہ سند کے لحاظ سے مضبوط ہے، اور اس میں ”الروائع“ کا لفظ نہیں ہے، لہذا یہ لفظ حاشیہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے اپنے مضمون میں مولانا مودودی صاحب کی عبارت کو ان کے ماخذ کے مقابلے میں رکھ کر یہ دکھلایا تھا کہ دونوں میں کیا کیا تفاوت پایا جاتا ہے؟ اس کا مقصد صرف دونوں عبارتوں کا فرق بیان کرنا تھا۔ وہاں حضرت معاویہؓ کے فعل کے جواہر اور عدم جواز سے بحث نہیں تھی، یہ بحث میں نے آگے کی تھی، لیکن جناب ملک غلام علی صاحب نے میرے مضمون کی نکات میں تقدیم و تاخیر کر کے انہیں ”تاویلات“ کا لقب عطا فرمایا اور پھر ان تاویلات کی تردید میں کئی صفحات سپرد قلم کئے ہیں۔ جب خلطِ بحث اس حد تک پہنچ جائے تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب دینا تطویل بھی ہے اور وقت کا ضیاع بھی، ملک صاحب کے بنیادی نکات کا جواب میں نے اوپر دے دیا ہے، اس خلطِ بحث کے لئے میں قارئین کو صرف یہ دعوت دینے پر اکتفا کرتا ہوں کہ وہ میرے اور ان کے مضمون کو آمنے سامنے رکھ کر مطالعہ فرمائیں۔ انشاء اللہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

حضرت علیؓ پر سب و شتم

اس موضوع پر مولانا مودودی صاحب کی زیر بحث عبارت یہ تھی :

”ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور اسکے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبویؐ میں منبر رسولؐ پر عین روضہ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔“

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۷۳)

(۱) میں نے اس پر سب سے پہلا اعتراض یہ کیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی طرف یہ ”مکروہ بدعت“ غلط منسوب کی ہے کہ وہ خود خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔ ”اس کا ثبوت نہ مولانا مودودی کے دیئے ہوئے حوالوں میں موجود ہے، نہ تاریخ و حدیث کی کسی اور کتاب میں۔ ملک صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

”مجھے عثمانی صاحب کی شکایت اس حد تک تسلیم ہے کہ جن مقامات کے حوالے مولانا مودودی نے دیئے ہیں وہاں یہ بات صراحتاً مذکور نہیں کہ امیر معاویہؓ خود سب و شتم کرتے تھے۔“

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۹ء ص ۲۳ و ۲۵)

لیکن اس کے بعد انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت معاویہؓ بھی اس فعل کا ارتکاب کرتے تھے، اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انہوں نے البدایہ و النہایہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ :

لما حج معاویة اخذ بيد سعد بن ابی وقاص وادخله دار الندوة
فاجلسه معه علی سريره ثم ذكر علی بن ابی طالب فوقع فيه
فقال ادخلتني دارك واجلستني علی سريرك ثم وقعت فی
علی نشتمه الخ

(خود ملک صاحب کے الفاظ میں اس روایت کا ترجمہ یہ ہے)

”جب معاویہؓ نے حج کیا تو انہوں نے سعد بن ابی وقاصؓ کو ہاتھ سے پکڑا
اور دار الندوہ میں لے جا کر اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا، پھر علی بن ابی طالبؓ کا
ذکر کرتے ہوئے ان کی عیب جوئی کی، حضرت سعدؓ نے جواب دیا ”آپ
نے مجھے اپنے گھر میں داخل کیا، اپنے تخت پر بٹھایا، پھر آپ نے علیؓ کے
حق میں بدگویی اور سب و شتم شروع کر دی۔“

ملک صاحب کے بقول اس روایت کے ”شواہد و متابعات“ مسلم اور ترمذی میں بھی
موجود ہیں، مسلم کی ایک حدیث یہ ہے:

عن عامر بن سعد بن ابی وقاص عن ابیہ قال امر معاویة بن ابی
سفیان سعداً فقال ما منعک ان تصیب ابا تراب فقال اما ما
ذکرت ثلاثاً قال هن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلن اسبہ

(ملک صاحب کے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے):

”عامر بن سعد بن ابی وقاصؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت
معاویہ بن ابی سفیانؓ نے حضرت سعدؓ کو حکم دیا، پھر کہا کہ آپ کو کس چیز
نے روکا ہے کہ آپ ابو تراب (حضرت علیؓ) پر سب و شتم کریں؟ انہوں
نے جواب دیا کہ جب میں ان تین ارشادات کو یاد کرتا ہوں جو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے متعلق فرمائے تھے تو ہرگز ان پر
سب و شتم نہیں کر سکتا۔“

یہاں سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس روایت کے اس ترجمہ کو
درست مان لیا جائے جو جناب غلام علی صاحب نے کیا ہے، اور اس سے بعینہ وہ تاثر لیا جائے
جو وہ لے رہے ہیں، تب بھی اس کی روشنی میں مولانا مودودی صاحب کے اس قول کی دلیل

کیسے مل گئی کہ ”حضرت معاویہؓ خطبوں میں برسر منبر حضرت علی پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔“ ہر معقولیت پسند انسان یہ فرق محسوس کر سکتا ہے کہ نجی مجلسوں میں کسی شخص پر اعتراضات کرنا اور بات ہے اور ”جمعہ کے خطبوں میں برسر منبر سب و شتم کی بوچھاڑ“ بالکل دوسری چیز، دعویٰ تو یہ کیا جا رہا ہے کہ حضرت معاویہؓ جمعہ کے خطبوں میں سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، اور دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ ایک نجی مجلس میں ایک صحابی کے سامنے انہوں نے حضرت علیؓ پر کچھ اعتراضات کئے، اس پر ملک صاحب لکھتے ہیں:

”ممکن ہے کہ عثمانی صاحب یہاں نکتہ اٹھائیں کہ اس میں منبر کا ذکر نہیں ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ ایسا فعل جس کا دوسروں کو امر کیا جائے اور جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں باز پرس کی جائے کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس کا ارتکاب علانیہ نہ ہو۔ پھر بالفرض اگر یہ فعل منبر پر کھڑے ہو کر نہیں، بلکہ سر پر بیٹھ کر کیا جائے تو کیا قباحت میں کوئی کمی واقع ہو جاتی ہے؟ بلکہ ایک طرح سے پرائیوٹ مجلس میں سب و شتم اپنے ساتھ اختیاب کو بھی جمع کر لیتا ہے۔“

اس سوال کا جواب تو صرف ملک صاحب ہی کے پاس ہو گا کہ صرف پرائیوٹ مجلس ہی کی گفتگو ”اختیاب“ کے ذیل میں کیوں آتی ہے؟ منبر پر سب و شتم کرنا اختیاب کیوں نہیں؟ یہ بات فی الحال موضوع سے خارج ہے، بہر کیف! ان کے کہنے کا خلاصہ یہ ہوا کہ پرائیوٹ مجلس میں کسی کو برا بھلا کہنا منبر پر سب و شتم کرنے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ اس میں بقول ان کے اختیاب بھی شامل ہو جاتا ہے، لیکن شاید ملک صاحب یہ لکھتے وقت یہ بھول گئے کہ اس مسئلے میں مولانا مودودی صاحب کیا ارشاد فرما چکے ہیں، انہوں نے مذکورہ عبارت ہی میں لکھا ہے کہ:

”کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔“

خط کشیدہ الفاظ انہوں نے اس جرم کی شاعت کو بڑھانے کے لئے ہی لکھے ہیں، اگر ملک صاحب کے قول کے مطابق خطبے میں گالی دینا پرائیوٹ مجلس میں برا کہنے سے اہوں ہے

تو براہ کرم وہ اس کی تشریح بھی فرمادیں کہ اس ”خاص طور پر“ کا کیا مطلب ہوا؟
واقف یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت کا مفہوم ملک صاحب نے صحیح طور سے بیان نہیں
فرمایا، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں نقطہ نظر کا جو شدید اختلاف تھا وہ کسی سے پوشیدہ
نہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ کو بغاوت کا مرتکب سمجھتے تھے اور اس کا اظہار بھی فرماتے
تھے، دوسری طرف حضرت معاویہؓ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علیؓ کا تین عثمانؓ سے قصاص لینے
میں مدامت برت رہے ہیں، اس لئے بر غلط ہیں۔ نقطہ نظر کے اس شدید اختلاف کا اظہار
دونوں کی نجی مجلسوں میں ہوتا رہتا تھا۔ حضرت معاویہؓ اپنے ذاتی خصائل و اوصاف اور
فضائل و مناقب میں چونکہ حضرت علیؓ کے ہم پلہ نہیں تھے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ ان نجی
مجلسوں میں ان کے منہ سے کوئی ایک آدھ لفظ غیر محتاط بھی نکل جاتا ہو، لیکن اس رائی پر یہ
پرست آخر عدل و انصاف کی کونسی منطق سے کھڑا کیا جاسکتا ہے کہ وہ ”مدانیہ خطبوں میں برسر
منبر حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔“

اصل میں مذکورہ روایت کے اردو لفظ ”سب“ استعمال ہوا ہے عربی زبان میں اسکا
مفہوم سب و شتم ہے اردو میں لفظ سب و شتم جس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے عربی زبان میں
اسکا استعمال اس مفہوم میں نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص کسی کی غلط روش پر اعتراض کرے، اس کی کسی غلطی پر نوکے، اسے خطا
کار ٹھہرائے، یا تھوڑا بہت برا بھلا کہہ دے تو اردو میں اس کے لئے لفظ ”سب و شتم“
استعمال نہیں ہوتا، نہ اس پر ”گالی“ کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن عربی زبان میں معمولی
سے اعتراض یا تملیظ کو بھی لفظ ”سب“ سے تعبیر کر دیتے ہیں، اور کلام عرب میں اس کی
بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔

صحیح مسلم ہی کی ایک حدیث میں ہے کہ تبوک کے سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنے رفقاء کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ کل جب تم تبوک کے چشمے پر پہنچو تو تم میں سے کوئی
شخص اس کے پانی کو میرے پیچھے سے پہلے نہ چھوئے، اتفاق سے دو صاحبان قافلے سے آگے
نکل کر چشمے پر پہلے پہنچ گئے، اور انہوں نے پانی پی لیا، راوی کہتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو

فستہما النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ان دونوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”سب“ فرمایا۔
 کیا کوئی شخص یہاں روایت کا یہ ترجمہ کر سکتا ہے کہ (معاذ اللہ) آپ نے انہیں
 گالیاں دیں؟ یا ان پر ”سب و شتم کی بوچھاڑ“ کر دی؟ ظاہر ہے کہ نہیں! یہاں ”سب“ کا لفظ
 غلطی پر ٹوکنے، خطا کار ٹھہرانے یا غلطی پر سخت ست کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ادھر
 میں نے اپنے پہلے مقالے میں صحیح بخاری کی ایک روایت پیش کر کے ثابت کیا تھا کہ ایک
 صاحب نے حضرت علیؓ کے لئے محض ”ابو تراب“ کا لفظ استعمال کرنے کو ”سب“ سے تعبیر
 فرمایا تھا۔

ان حالات میں بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت سعدؓ
 کے ساتھ اپنی نجی مجلس میں بھی حضرت علیؓ پر جو ”سب“ کیا، یا کرنے کی ہدایت کی تو وہ اردو
 والا ”سب و شتم“ نہیں تھا جسے مولانا مودودی صاحب نے بڑی آسانی کے ساتھ ”گالیاں
 دینے“ سے تعبیر فرمادیا ہے، بلکہ صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث کی طرح یہاں بھی ”سب“ سے
 مراد حضرت علیؓ پر اعتراض کرنا اور ان کی (مزعومہ) غلطی سے اپنی برأت کا اظہار ہے، اس
 سے زائد کچھ نہیں، ورنہ یہ بات آخر کیوں عقل میں آسکتی ہے کہ ایک طرف حضرت معاویہؓ
 حضرت علیؓ کو اپنے سے افضل قرار دیتے ہیں (واللہ انی لا علم انہ خیر منی و افضل) ضرار
 صدائی سے کہتے ہیں کہ ”میرے سامنے علیؓ کے اوصاف بیان کرو“ اور جب وہ حضرت علیؓ کی
 غیر معمولی تعریفیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ”اللہ ابوالحسن (علیؓ) پر رحم کرے، خدا کی قسم وہ
 ایسے ہی تھے“ (رحم اللہ ابا الحسن کان واللہ کنلک) اور جب حضرت علیؓ کی وفات کی خبر
 پہنچتی ہے تو اس پر شدید رنج و غم کا اظہار فرماتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ”ابن ابی طالب کی
 موت سے فقہ اور علم رخصت ہو گئے“ (ذهب الفقہ والعلم بموت ابن ابی طالب) اور دوسری
 طرف انہیں گالیاں دینے، اور ان پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرنے کو جزو ایمان بھی سمجھتے ہیں؟

۱۔ صحیح مسلم ص ۲۳۶ ج ۱۲ ص ۱۲۷ الطابع کراچی کتاب انشائیل باب معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ الہدایہ والنہایہ ص ۱۳۹ ج ۸

۳۔ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۳ و ۳۴ ج ۳۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ القاہرہ ۱۹۳۹ء

۴۔ الہدایہ والنہایہ ص ۱۳۰ ج ۸

اگر حضرت سعدؓ کی مذکورہ روایت کو ان تمام روایات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے اور ساتھ میں حضرت معاویہؓ کے مقام صحابیت، ان کے علم و فضل، ان کی شرافت و نجابت اور ان کے حلم و تدبیر کو سامنے رکھا جائے تو کسی بھی صاحب انصاف کو اس بات میں شک نہیں رہ سکتا کہ یہاں ”سب“ کا ترجمہ ”مگالی“ سے کرنا ایسی ہی زیادتی ہے جیسے صحیح مسلمؒ کی مذکورہ حدیث کا یہ ترجمہ کرنا کہ :-

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) انہیں گالیاں دیں۔“

میں نے اپنے مقالے میں نقل کیا تھا کہ حضرت معاویہؓ کے پاس جب حضرت علیؓ کی وفات کی خبر پہنچی تو وہ رونے لگے، اور اپنی اہلیہ سے حضرت علیؓ کی تعریف کی، اس واقعے پر جو تبصرہ ملک غلام علی صاحب نے فرمایا ہے اس کا جواب دینا تو میرے بس سے باہر ہے، البتہ اسے محض عبرت کے لئے قارئین کے سامنے نقل کرنا چاہتا ہوں، فرماتے ہیں:

مجھے اس رونے پر کسی شاعر کا یہ شعر بے اختیار یاد آ گیا۔

آئے تربت پر مری، روئے، کیا یاد مجھے
خاک اڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے
واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے رونے سے تو دراصل یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ضمیر خود جانتا تھا کہ خلیفہ وقت سے (جو انہوں نے کس خطائے عظیمہ کا ارتکاب کیا تھا) اور انکا دل خوب جانتا تھا کہ بغاوت کے جرم سے قطع نظر علیؓ جیسے شخص کے مقابلہ میں خود ان کا دعوائے خلافت کس قدر بے جا تھا۔

یہاں تک ہماری گزارشات کا خلاصہ دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر جو یہ بے دلیل الزام عائد کیا ہے کہ وہ ”خطبوں میں برسر منبر حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے“ اسکا ثبوت نہ صرف یہ کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں نہیں ہے، بلکہ جو روایت ملک صاحب نے پیش کی ہے، اس سے بھی یہ الزام ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ مولانا مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ جمعہ کے خطبوں میں برسر منبر اس حرکت

کا ارتکاب کیا جاتا تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ سب علیؓ کو جزو دین بنا لیا گیا تھا، اسی لئے اس کو انہوں نے ”بدعت“ کے عنوان سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ ملک صاحب نے جو روایت پیش کی ہے، اس کے پیش نظریہ ایک نجی مجلس کا واقعہ تھا۔

دوسرے یہ کہ اس نجی مجلس میں بھی جو ”سب“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا ترجمہ ”گالی“ سے کرنا درست نہیں، اس کا حاصل حضرت علیؓ کے طرز عمل پر اعتراض کرنا، ان کے موقف کو غلط ٹھہرانا، اور اس موقف سے اپنی براءت کا اظہار ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ صحیح مسلم کی حدیث مذکورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لفظ ”سب“ منسوب کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ حضرت معاویہؓ کے گورنروں کا ہے، مولانا مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے ”تمام گورنر“ بلا استثناء خطبوں میں سب علیؓ کیا کرتے تھے، اس دعوے کی دلیل میں مولانا مودودی نے صرف دو روایتوں کا حوالہ دیا تھا، ایک سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت سعید بن جبیرؓ کو باقاعدہ سب علیؓ کی تاکید فرمائی تھی، اور دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ مروان بن حکم اپنے خطبوں میں حضرت علیؓ پر سب کیا کرتا تھا۔

ان میں سے پہلی روایت کے بارے میں میں نے تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ اس کے تمام راوی از اول تا آخر شیعہ ہی شیعہ ہیں، اور ان میں سے بعض کو علماء رجال نے ”کذاب“ تک کہا ہے، اس لئے یہ روایت لائق اعتماد نہیں۔

ملک صاحب نے اس کے جواب میں ”رواة تاریخ“ کے عنوان سے لمبی چوڑی بحث کی ہے، لیکن اس میں سب وہی باتیں دہرائی ہیں جو مولانا مودودی صاحب نے ”خلافت و ملوکیت“ کے ضمیمے میں لکھی ہیں۔ میرے مقالے کی ساتویں قسط ملک صاحب کی اس بحث کے بعد شائع ہوئی تھی، میں اس میں ان تمام دلائل پر مفصل گفتگو کر کے ان کا جواب دے چکا ہوں، ملک صاحب نے میری اس بحث کا کوئی جواب اب تک نہیں دیا اس لئے مجھے یہاں اس بحث کے اعادہ کی ضرورت نہیں، جو حضرات چاہیں اس بحث کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

دہی دوسری روایت سوا اس کے بارے میں میں نے صحیح بخاری کی ایک حدیث سے ثابت کیا تھا کہ مروان بن حکم کا ”سب“ کیا تھا؟ ایک شخص نے حضرت سلؓ سے آکر شکایت

کی کہ مدینہ کا گورنر حضرت علیؓ پر ”سب“ کرتا ہے، حضرت سہلؓ نے پوچھا ”کیا کتا ہے؟“ اس نے جواب دیا

”حضرت علیؓ کو ابو تراب کتا ہے“ حضرت سہلؓ نے جواب میں اسے بتایا کہ یہ لقب تو حضرت علیؓ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت میں دیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مروان کے سب و دشمن کی حقیقت بس اتنی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو محبت میں اس نام سے پکارتے تھے، مروان زیادہ سے زیادہ اسے اسکے حقیقی معنی میں استعمال کرتا ہو گا۔ اسکے جواب میں ملک صاحب لکھتے ہیں :

”امام بخاریؒ نے حدیث کا صرف وہ حصہ روایت کیا ہے جس سے حضرت

علیؓ کی منقبت ثابت ہوتی ہے۔“

غالباً ملک صاحب کا نشاء یہ ہے کہ یہاں مروان کی کچھ اور گالیاں بھی مذکور ہوں گی جنہیں امام بخاریؒ چھوڑ گئے۔ میری گزارش یہ ہے کہ روایت کا جو حصہ امام بخاریؒ چھوڑ گئے ہیں، اگر جناب غلام علی صاحب کسی معتبر روایت سے وہ حصہ نقل کر کے دکھا دیتے اور اس میں واقعتاً حضرت علیؓ کو گالیاں دی گئی ہوتیں، تب تو ان کا یہ کہنا بجا ہو سکتا تھا، لیکن وہ باقی ماندہ حصہ پیش بھی نہیں کرتے تو محض ان کے قیاس بلکہ واہمہ کی بنیاد پر یہ کیسے کہہ دیا جائے کہ اس روایت کا کچھ حصہ امام بخاریؒ چھوڑ گئے ہیں، اس طرح تو ہر باطل سے باطل مسلک کی دلیل یہ لائی جاسکتی ہے کہ بخاری کی فلاں حدیث امام بخاریؒ نے مخفی نقل کی ہے، اس کا باقی ماندہ حصہ سے فلاں بات ثابت ہوتی ہے۔ ملک صاحب علمی و تحقیقی مباحث میں کم از کم ایسی باتوں سے تو پرہیز فرمائیں۔ آگے تحریر فرماتے ہیں :

عثمانی صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ مروان ابو تراب سے بس ”مٹی کا

باپ“ مراد لیتا تھا، عربی میں ”ابو“ کا لفظ بطور مضاف صرف باپ کے معنی

میں نہیں آتا، ”والے“ کے معنی میں بھی آتا ہے۔۔۔ مروان ظنّاً اس لفظ کو

خاک آلود کے معنی میں استعمال کرتا تھا۔“

میری گزارش یہ ہے کہ ”ابو تراب“ کا لفظی ترجمہ ”آپ“ مٹی کا باپ“ کر لیجئے یا

”مٹی والا“ بھر حال یہ پیار بھر لقب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو دیا تھا، کوئی شخص کسی بُری نیت سے یہ لفظ حضرت علیؓ کے لئے استعمال کرے تو یہ اس کی احمقانہ تعریض

ہے، نیت کے لحاظ سے اس کا یہ فعل لائق ملامت ضرور ہے لیکن اس لفظ کو انصاف کے کسی بھی قاعدے سے ”سب و شتم کی پوچھاڑ“ یا ”گالی“ نہیں کہا جاسکتا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت علیؓ کے ایک فوجی افسر حضرت جاریہ بن قدامہؓ نے ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ کو ”ابو سنور“ (بلی والا یا بلی کا باپ) کے نام سے یاد کیا تھا، اگر لفظ ”ابو تراب“ کو سب و شتم کی پوچھاڑ کہا جاسکتا ہے تو معلوم نہیں جناب غلام علی صاحب ”ابو سنور“ کو کیا فرمائیں گے؟

یہ تو وہ دور و روایتیں تھیں جن کا حوالہ مولانا مودودی صاحب نے دیا ہے۔ ملک غلام علی صاحب نے اپنے مقالے میں تین روایتیں اور پیش کی ہیں، پہلے مسند احمد سے حضرت ام سلمہؓ کی ایک روایت پیش کی ہے کہ انہوں نے بعض اصحاب سے فرمایا ”کیا تمہارے یہاں منبروں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب ہوتا ہے؟“ لوگوں نے پوچھا ”وہ کیسے؟“ حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا ”الیس یسب علی و من احبہ؟“ (کیا علیؓ اور ان سے محبت کرنے والوں پر سب نہیں ہوتا؟)

دوسرے ابو داؤدؓ اور مسند احمد سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے سامنے کسی شخص نے حضرت علیؓ پر لگاکار ”سب“ شروع کیا تو حضرت سعید بن زیدؓ نے حضرت مغیرہؓ کو تنبیہ فرمائی کہ تمہارے سامنے یہ ”سب“ ہو رہا ہے اور تم اس پر کوئی نکیر نہیں کرتے؟“

تیسرے ابن جریر طبریؓ کی ایک روایت پیش کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح کرتے وقت منہلہ اور شرائط سے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ ”ان کے سنتے ہوئے حضرت علیؓ پر سب نہ کیا جائے۔“

لہٰذا یہاں پر انے ایڈیشن میں ایک حاشیہ تھا جس سے رجوع کا اعلان ’’بلاغ‘‘

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ میں کر دیا گیا تھا، مگر وہ کچھ عرصہ چھپتا رہا، اب اسے یہاں سے

نکال دیا گیا ہے۔ محمد تقی عثمانی ۶/۱۳۲۲ھ

یہ ہیں وہ تین روایتیں جن کی بنیاد پر انہوں نے سب علیؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ ”یہ بات جس طرح تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے وہ اسے قطعیت اور تواتر کا درجہ دے رہی ہے۔“

مذکورہ بالا روایات کا تحقیقی جواب دینے سے قبل میں یہاں کچھ اور روایات پیش کرتا ہوں، ملک صاحب براہ کرم ان کا بغور مطالعہ فرمائیں۔

(الف) ابن حبیبؒ (متوفی ۲۳۵ھ) مشہور مورخ ہیں وہ نقل کرتے ہیں :

فلما قدم الكوفة على رضى الله عنه جعل اصحابه يتناولون عثمان فقال بنو الارقم لا نقيم ببلد يشتم فيه عثمان فخرجوا الى الجزيرة فنزلوا الرها وشهدوا مع معاوية الصفيين له
جب حضرت علیؓ کوفہ میں آئے تو ان کے ساتھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بدگوئی کرنے لگے، بنو الارقم نے کہا کہ ہم اس شہر میں نہیں رہ سکتے۔ جس میں حضرت عثمان پرست و شتم کیا جاتا ہو، چنانچہ وہ جزیرہ کی طرف چلے گئے اور رہا کے مقام پر ٹھہرے اور حضرت معاویہؓ کے ساتھ جنگ سفین میں شریک ہوئے۔

(ب) ابن جریر طبریؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے بھیجے ہوئے ایک وفد سے خطاب کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے فرمایا

معاوية النذل يجعل الله عز وجل له سابقة في الدين ولا سلف صدق في الاسلام طليق بن طليق حزب من هذاهم الا حزب لم يزل الله عز وجل و لرسوله صلى الله عليه وسلم و للمسلمين عدوا هو و ابوه حتى دخلوا في الاسلام كارهين

”معاویہ وہ ہیں جن کے لئے اللہ نے نہ دین میں کوئی فضیلت رکھی ہے نہ اسلام میں ان کا کوئی اچھا کارنامہ ہے، خود بھی طلیق ہیں، اور ان کے باپ بھی طلیق، ان احزاب میں سے ہیں (جو مدینہ پر چڑھ کر آئے تھے) اللہ اور

۱ ابن حبیبؒ الجبر ص ۲۹۵، دائرة المعارف ۱۳۶ھ

۲ ابن حبیبؒ الجبر ص ۳۲۹، دائرة المعارف ۱۳۶ھ

اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ دشمن رہے، وہ بھی اور ان کے باپ بھی یہاں تک کہ اسلام میں بادل ناخواستہ داخل ہوئے۔

اسی روایت میں آگے ہے کہ وفد کے لوگوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ ”کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مظلوماً قتل ہوئے۔“ تو آپ نے فرمایا کہ ”لا اقول انه قتل مظلوماً ولا انه قتل ظالماً“ (نہ میں یہ کہتا ہوں کہ وہ ظالم بن کر قتل ہوئے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ مظلوم بن کر قتل ہوئے)۔ اس پر وفد یہ کہہ کر چلا آیا کہ ”جو حضرت عثمانؓ کے قتل کو مظلوماً نہیں سمجھتا، ہم اس سے بری ہیں۔“ سنہ (ج) ابن جریر ہی نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے صفین میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

”فان معاویة وعمر وبن العاص وابن ابی معیط وحبيب بن مسلمة وابن ابی سرح والضحاك بن قيس ليسوا باصحاب دين ولا قرآن انا اعرف بهم منكم قد صحبتهم اطفالا و صحبتهم رجالا فكانوا شر اطفالا و شر رجالا“

”معاویہ، عمر بن عاص، ابن معیط، حبیب بن مسلمہ، ابن سرح اور ضحاک بن قیس دین اور قرآن سے تعلق رکھنے والے نہیں ہیں، میں انہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں، میں ان کے ساتھ اس وقت بھی رہا ہوں، جب یہ بچے تھے اور اس وقت بھی رہا ہوں جب یہ مرد تھے، یہ بچے تھے تو بد ترین بچے اور مرد تھے تو بد ترین مرد۔“

(د) حجر بن عدیؓ حضرت علیؓ کے معروف ساتھیوں میں سے تھے، ان کے اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :

”انهم كانوا اينالون من عثمان و يطلقون فيه مقالة الجورو ينتقدون على الامراء الخ“
یہ لوگ حضرت عثمان کی بدگوئی کرتے اور انکے بارے میں ظالمانہ

باتیں کہتے تھے ل

(۵) بعض مؤرخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے عین صلح کی گفتگو کے دوران بھی حضرت معاویہؓ کیلئے سخت توہین آمیز الفاظ استعمال کئے اور انکے ایمان تک کو مشکوک بتایا، البدایہ والنہایہ ص ۲۵۸ ج ۷ میں مؤرخین کے یہ اقوال نقل کے لئے حافظ ابن کثیر نے انکی تردید کی ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم تو ان جیسی بیشتر روایتوں کو ان کی سند کے ضعف اور راویوں کے ناقابل اعتماد ہونے کی بناء پر صحیح نہیں سمجھتے اور ان میں سے بعض کو قطعی جھوٹ اور افترا سمجھتے ہیں، لیکن مولانا مودودی صاحب اور ملک غلام علی صاحب جو تاریخی روایات کو بے چون و چرا مان لینے کے قائل ہیں، براہ کرم ”اسماء الرجال کے دفتر“ کھولے بغیر یہ بتائیں کہ اگر ان روایات کی بناء پر کوئی شخص یہ عبارت لکھے کہ:

”ایک کمروہ بدعت حضرت علیؓ کے زمانے میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود

اور ان کے حکم سے ان کے ماتحتی خطبوں میں بربر منبر حضرت عثمانؓ اور

حضرت معاویہؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، اور ان کے محبت رکھنے

والے دوست اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔“

اور پھر کوئی شخص مذکورہ چار روایات کو نقل کر کے اس جملے کی تائید میں یہ لکھ دے کہ یہ بات جس طرح تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے وہ اسے قطعیت اور ثبوت کا درجہ دے رہی ہے۔ تو مولانا مودودی صاحب اور محترم ملک غلام علی صاحب کے پاس اس کا کیا جواب ہو گا؟ کیا وہ ان واقعات کو ”قانون کی بالاتری کا خاتمہ“ قرار دے کر طوکت کا آغاز معاذ اللہ حضرت علیؓ سے کر سکیں گے؟

ملک صاحب سے اس تمہیدی سوال کے بعد میں اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان نقطہ نظر کا شدید اختلاف تھا جو بالآخر باہمی جنگ پر منتج ہوا۔ لیکن ان کا یہ باہمی اختلاف کبھی شرافت کی حدود سے متجاوز نہیں ہوا، جو روایتیں اس کے بظاہر خلاف نظر آتی ہیں، خواہ ان میں حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ پر سب و شتم کرنا مذکور ہو یا حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کا

حضرت علیؓ پر ان میں سے اکثر توفیقہ پرداز قسم کے سبائیوں کی گھڑی ہوئی ہیں اور ہر دو ایک روایتیں صحیح سند کے ساتھ آئی ہیں ان میں لفظ سب سے مراد بلاشبہ ایک دوسرے کے موقف کو غلط قرار دینے اور اس سے اپنی برأت کا اظہار ہے۔

جن روایتوں سے خود حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ پر سب کرنا یا اس کا حکم دینا معلوم ہوتا ہے ان کی حقیقت تو ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں رہیں یہ تین روایتیں تو ان سے خود حضرت معاویہؓ کا سب کرنا تو ظاہر ہے کہ ثابت نہیں ہوتا۔ ان کے بعض ساتھیوں کا سب کرنا معلوم ہوتا ہے، لیکن جس ماحول میں ”ابو تراب“ کہنے کو بھی ”سب“ سے تعبیر کر دیا جاتا ہو وہاں ہر شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس سے مراد ”کالی دنیا“ نہیں بلکہ تغلیط و تعریض ہے یہ ممکن ہے کہ تغلیط و تعریض میں بعض لوگ کسی وقت حدود سے کسی تہر متجاوز بھی ہو گئے ہوں، لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ حضرت معاویہؓ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر جمعہ کے خطبوں میں حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔

حیرت ہے کہ مولانا مودودی اور غلام علی صاحب ایک طرف تو صرف لفظ ”ابو تراب“ کو ”سب و شتم کی بوچھاڑ“ کہنے پر مضطرب ہو سہے، دوسری طرف وہ خود حضرت معاویہؓ کو بغاوت کا مجرم قرار دیتے ہیں، ان کی طرف انسانی شرافت کے پیکر خلاف حرکات منسوب کرتے ہیں، انہیں مال نعمت میں خیانت کا مرتکب بتاتے ہیں، انہیں ظالم و جاہر ثابت کرتے ہیں، ان کے باوجود یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ پر ”سب و شتم کی بوچھاڑ“ کی ہے۔ ملک صاحب نے اپنے مضمون میں ماضی قریب کے بعض مصنفین کی عبارتیں بھی پیش کی ہیں کہ انہوں نے وہی باتیں لکھی ہیں جو مولانا مودودی صاحب نے لکھی ہیں۔ لیکن اول تو ان کے اور مولانا مودودی صاحب کے انداز بیان میں عموماً خاصا فرق ہے، دوسرے ظاہر ہے کہ یہ بات کسی غلطی کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتی کہ وہ ماضی قریب کے بعض دوسرے مصنفین سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ اس لئے اس پر گفتگو لا حاصل ہے۔

۱۔ اس ضمن میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی زبانی حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کا جو واقعہ ملک صاحب نے حکایات الاولیاء سے نقل کیا ہے، اس میں حضرت شاہ شہیدؒ نے شیخہ حضرات کو ازای جواب دیا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت شاہ شہید کا نظریہ یہی تھا۔

استلحاق زیاد

اس مسئلے میں مولانا مووودی صاحب کی زیر بحث عبارت یہ ہے :

”زیاد بن سہمہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جس میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ زیاد طائف کی ایک لونڈی سہمہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں حضرت معاویہؓ کے والد جناب ابوسفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا اور اس سے وہ حاملہ ہوئی۔ حضرت ابوسفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد انہی کے نطفہ سے ہے۔ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں وہ آپؐ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں ان کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی اور مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زنا کاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد انہیں کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح اور ناجائز فعل تھا کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ ”بچہ“ اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کے لئے کنگر پتھر ہیں۔“ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس سے پردہ فرمایا۔“

میں نے ابن خلدون وغیرہ کے حوالے سے یہ ثابت کیا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں سہمہ کے ساتھ حضرت ابوسفیان کے جس تعلق کو مولانا مووودی صاحب نے زنا کا عنوان دیا ہے وہ درحقیقت جاہلی نوعیت کا ایک نکاح تھا اور اس نوعیت کا نکاح اگرچہ اسلام کے بعد منسوخ ہو گیا، لیکن اس قسم کے نکاح سے جو اولاد جاہلیت میں پیدا ہوئی اسے ثابت النسب کہا گیا،

وہ اولاد حرام نہیں ہوئی۔ زیاد کا معاملہ بھی یہی تھا کہ حضرت ابوسفیانؓ نے اسلام سے پہلے خفیہ طور پر یہ اقرار کر لیا تھا کہ زیاد انہی کا بیٹا ہے، اس لئے اس کا نسب ثابت ہو چکا تھا، حضرت معاویہؓ نے دس گواہوں کے گواہی دینے پر (جن میں بیعت رضوان کے شریک صحابہؓ بھی شامل تھے) اس واقعہ کا صرف اعلان کیا اور زیاد کو اپنا سوتیلا بھائی تسلیم کر لیا۔

جناب ملک غلام علی صاحب نے اس تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”ظاہر ہے کہ نسب و انتساب کی یہ صورتیں جو جاہلیت میں رائج تھیں وہ اس وقت تک مستحق اور مسلم شمار نہیں ہو سکتی تھیں جب تک سوسائٹی میں ان کا اعلان عام نہ ہو جائے اور مردِ ضلیٰ اولاد کی طرح بچے کو اپنے کنبے میں داخل نہ کر لے۔“

ملک صاحب نے اپنے مضمون میں اسی بات پر زور دیا ہے کہ اگر زیاد زنا کے بجائے جاہلی نکاح سے پیدا ہوا تھا تو انتساب کا اعلان عام ضروری تھا، اور خفیہ طور پر استلحاق کا اقرار ثبوت نسب کے لئے کافی نہیں تھا لیکن اول تو غلام علی صاحب نے اس بات کی کوئی دلیل نہیں دی کہ جاہلیت کے اس انتساب میں اعلان عام ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا تھا، جاہلیت کے نکاحوں کی جو تفصیل حضرت عائشہ صدیقہؓ سے صحیح بخاری میں مروی ہے، اس میں اس شرط کا کوئی بھی ذکر نہیں ہے، بلکہ جاہلی نکاح کے جو اور طریقے اسلام سے پہلے رائج تھے، ان پر نظر کی جائے تو صراحتاً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے انتساب کے لئے اعلان عام ہرگز ضروری نہیں تھا، بلکہ اگر معاملہ بالکل خفیہ رہے تب بھی انتساب ہو جاتا تھا، علامہ داؤدیؒ تحریر فرماتے ہیں:

بقی علیہا انتحاء لم تذکرھا، الاول نکاح الخدن وهو فی قولہ
نعالی ولا متخذات اخدان کأنوا یقولون ما استتر فلا یاس بہو
ما ظہر فہو لوم لہ

جاہلی نکاح کی کچھ قسمیں ایسی بھی ہیں جو حضرت عائشہؓ نے بیان نہیں فرمائیں، ان میں سے پہلی قسم خفیہ آشنائی کا نکاح ہے، اور اس کا ذکر قرآن

کریم کے ارشاد ولا متخذات اخدان میں موجود ہے، جاہلیت کے لوگ کہا کرتے تھے کہ ایسا تعلق اگر خفیہ طور پر ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں، اور علی الاعلان ہو تو وہ قابل ملامت بات ہے۔“

اس سے صاف واضح ہے کہ جاہلی نکاح میں خفیہ تعلق یا خفیہ امتساب قابل ملامت نہیں تھا، لہذا ملک غلام علی صاحب کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ”نسب و امتساب کی یہ صورتیں اس وقت تک مسلم نہیں ہو سکتی تھیں جب تک سوسائٹی میں ان کا اعلان عام نہ ہو جائے۔“ پھر اگر خفیہ استحقاق جاہلیت میں قابل قبول نہیں تھا تب بھی حضرت ابوسفیانؓ نے کم از کم دس آدمیوں کی موجودگی میں نسب کا اقرار کیا تھا۔ مؤرخ مدائنی نے ان دس گواہوں کے نام شمار کرائے ہیں۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے انہیں نقل کیا ہے۔ لہ اس لئے قانونی طور پر اس اقرار کو خفیہ نہیں کہا جاسکتا، ابن خلدون نے اس کے لئے ”خفیہ“ کا جو لفظ استعمال کیا ہے، اس کا مطلب اس سے زائد نہیں کہ عام لوگوں میں یہ اقرار مشہور و معروف نہیں ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ زیاد کا استحقاق اگر ایسا ہی بے بنیاد اور شریعت کے مسئلہ قاعدوں کی صریح خلاف ورزی پر مبنی ہوتا جیسا کہ مولانا مودودی صاحب یا بعض دوسرے حضرات نے سمجھا ہے تو پھر ساتھ ہی یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ امت اسلامیہ اپنے خیر القرون میں حق کے محافظوں سے یکسر خالی ہو گئی تھی، ورنہ کیا یہ بات محفل میں آسکتی ہے کہ اتنی بڑی دھاندلی کا ارتکاب ایک ایسے دور میں کیا جائے جس میں چپہ چپہ پر نزول وحی کا مشاہدہ کرنے والے صحابہ موجود ہوں، بیعت رضوان کے شریک صحابہؓ خود اس صریح دھاندلی کے حق میں گواہی دیں، اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اس دھاندلی کے حق میں خود مہر تصدیق ثبت کریں؟

ملک غلام علی صاحب نے لکھا ہے:

”ام المومنین نے سوچا ہو گا کہ بے چاروں کی حاجت روائی ہو۔ اس لئے

ابن ابی سفیان لکھ دیا۔“

تصور تو فرمائیے کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ مطلب یہ ہے کہ ام المومنینؓ نے محض چند ”بیچاروں کی حاجت روائی“ کی خاطر قرآن و سنت سے اس صریح بغاوت کو گوارا کر لیا۔ خدارا غور فرمائیں کہ کیا معاذ اللہ ایک ولدا لڑنا کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا برادر نسبتی قرار دینے کی بے غیرتی ان سے کسی بھی قیمت پر سرزد ہو سکتی تھی؟ حیرت ہے کہ جناب ملک غلام علی صاحب کو یہ گوارا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایسا گمان کیا جائے، لیکن مولانا مودودی صاحب کی غلطی تسلیم کرنا کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں ثابت کیا تھا کہ جن معترضین نے اس وقت استلحاق زیاد پر نکتہ چینی کی تھی ان کی وجہ اعتراض بالکل دو سری تھی، ان کا کہنا یہ تھا کہ ابوسفیانؓ کبھی سیتہ کے قریب تک نہیں گئے، لیکن جب معاملہ دس گواہوں سے ثابت ہو گیا تو انہوں نے اپنے اعتراض سے رجوع کر لیا اور اپنے رویہ پر ندامت کا اظہار کر کے حضرت معاویہؓ سے معافی بھی مانگی۔ ملک صاحب اسکے جواب میں صرف اتنا لکھتے ہیں:

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فیصلہ خواہ صحیح تھا یا غلط بہر حال اسے مملکت میں نافذ کر دیا گیا جیسا کہ دیت اور توریت کے فیصلے نافذ کئے گئے تھے۔“

سوال یہ ہے کہ اگر یہ فیصلہ غلط طور پر نافذ کیا گیا تھا تو معترضین نے اپنے سابقہ رویہ پر شرمندگی کا اظہار کیوں کیا؟ حاکم کے کسی فیصلے کو زبردستی نافذ کرنا اور بات ہوتی ہے اور اسے صحیح تسلیم کر لینا بالکل دو سری چیز، یہاں معترضین نے صرف یہی نہیں کہ اس فیصلے کے نفاذ میں مزاحمت نہیں کی، بلکہ صراحتاً اقرار کیا کہ ان کا سابقہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی تھا اور اب وہ اس پر ندامت محسوس کرتے ہیں۔

ملک صاحب کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ بعد میں تاریخ اور انساب کی کتابیں زیادہ کو ”زیاد بن ابیہ“ اور ”زیاد بن عبید“ ہی لکھتی چلی آئی ہیں۔ علم انساب کے سب سے مشہور عالم اور مورخ علامہ بلاذریؒ دو سری صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی معروف کتاب ”انساب الاشراف“ میں زیاد کا ترجمہ ”زیاد بن ابی سفیان“ ہی کے عنوان سے کیا ہے۔

ملک غلام علی صاحب نے اس قضیہ سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کی ہے جو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت سعدؓ اور حضرت عبد بن زمعہؓ کے درمیان پیش آیا تھا، لیکن یہ استدلال اس لئے درست نہیں کہ اس واقعہ میں باندی کے بچے کے دعویٰ اور دو تھے، ایک باندی کے آقا کی طرف سے اس کے بھائی (حضرت عبد بن زمعہؓ) اور دوسرے عقبہ کی طرف سے اس کے بھائی (حضرت سعدؓ)۔ گویا ایک طرف خود صاحب فراش بچے کا مدعی تھا اور دوسری طرف غیر صاحب فراش، اس صورت کا حکم کھلا ہوا تھا کہ بچہ اس کو لے گا جو فراش کا مالک ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ صاحب فراش کو دیا اور حضرت سعدؓ کا دعویٰ مسترد کر دیا۔

اس کے برخلاف زیاد کے معاملہ میں ابوسفیانؓ کے سوا کسی اور کا اقرار یا دعویٰ نسب ثابت نہیں، اس لئے اس کی نوعیت بالکل بدل جاتی ہے، اگر صورت واقعہ یہ ہوتی کہ ایک طرف عبید (جس کے فراش پر زیاد پیدا ہوا تھا) زیاد کو اپنی طرف منسوب کرنے کا دعویٰ کرتا، اور دوسری طرف ابوسفیانؓ اسے اپنی طرف منسوب کرنا چاہتے تو بلاشبہ یہ معاملہ حضرت سعدؓ کے قضیہ کے مشابہ ہو جاتا، اور اس صورت میں شرعاً زیاد کا نسب عبید سے ثابت ہوتا نہ کہ ابوسفیانؓ سے، لیکن جب خود عبید اس معاملے میں خاموش ہے اور زیاد کے انتساب کا دعویٰ نہیں کرتا تو اب دعویٰ صرف ابوسفیانؓ کا ہے، اور چونکہ یہ دعویٰ اسلام سے قبل ہو چکا تھا، اس لئے وہ قابل قبول ہے، اور اسے حضرت سعد کے دعویٰ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

ملک صاحب نے اس موضوع پر جو بحث کی ہے وہ بہت منتشر اور غیر مرتب ہے لیکن اس کے بنیادی نکات کا جواب میں نے اوپر دے دیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس بحث میں اصل فیصلہ کن باتیں وہیں ہیں جو اوپر آچکیں، اور اگر یہ نکات ذہن میں رہیں تو ملک صاحب کی علمی بحث کا جواب ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ماضی قریب کے فلاں فلاں مصنفین نے بھی حضرت معاویہؓ کے اس فعل پر اعتراض کیا ہے، تو اصل واقعہ سامنے آنے کے بعد یہ کوئی علمی دلیل نہیں رہتی۔ اصل حقیقت کی دیانتدارانہ تحقیق کے بعد ہمیں اس پر شرح صدر ہے کہ جس جس نے اس معاملہ میں حضرت معاویہؓ کو مطعون کیا ہے، اس نے غلطی کی ہے، خواہ مولانا مودودی ہوں یا مولانا ابوالکلام آزاد یا کوئی اور۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک غلط بات مولانا مودودی صاحب کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، قاضی زین العابدین میرٹھی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی لکھ دی ہو تو وہ صحیح کیونکر ہو سکتی ہے۔

غلام علی صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت تحفہ اثنا عشریہ سے نقل کی اور چیخ کے انداز میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ”مدیر البلاغ مولانا موودوی اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تحریر آنے سامنے رکھ کر ذرا مجھے بتائیں کہ مولانا موودوی نے وہ کیا خاص بات لکھی ہے اور ان کے بقول اس معاملے میں عام معترضین سے زیادہ سخت اور افسوسناک اور مکروہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔“ مولانا موودوی صاحب کی عبارت میں بحث کے شروع میں نقل کر چکا ہوں، قارئین اس کا مقابلہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مندرجہ ذیل جملوں سے کر لیں جو انہوں نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں لکھے ہیں:

”اس وقت معاویہؓ نے ابوسفیان کے اسی کلمے سے تمک کیا جو ان کی زبان سے عمرو بن عاص اور حضرت امیرؓ کے رو بہ نکلا تھا اور اس کو اپنا بھائی قرار دیا اور ۳۴ھ میں زیاد بن ابی سفیان اس کا لقب تحریر کیا۔ تمام مملکت میں اعلان کروایا کہ اس کو زیاد بن ابی سفیان کہا کریں۔“

یہ درست ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو درست نہیں سمجھتے، اور اس معاملے میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔ انہوں نے زیاد کے حق میں بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن کیا مذکورہ عبارت میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا ہے جسے حضرت معاویہؓ کے لئے اہانت آمیز کہا جاسکے؟ اس کے بعد مولانا موودوی صاحب کی عبارت پھر پڑھ لیجئے اور دیکھئے کہ اس میں بقول ملک صاحب کے کوئی ”خاص بات“ ہے یا نہیں؟۔۔۔

ابن غیلان کا واقعہ

مولانا موودوی صاحب نے لکھا ہے:

”حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور انکی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے انکار کروایا۔ ان کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بھرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا۔ ایک شخص نے دوران خطبہ میں اسکو کنکر مار دیا۔ اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کروا دیا اور اسکا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رو

سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کے پاس استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی ریت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا مگر میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں“

میں نے اس واقعہ کے اصل ماخذ (البدایہ والنہایہ) کے حوالہ سے ثابت کیا تھا کہ اس واقعہ میں جس شخص کا ہاتھ کاٹا گیا تھا خود اسکے رشتہ داروں نے ابن غیلان سے یہ تحریر لکھوائی تھی کہ حاکم نے اس کا شبہ میں ہاتھ کاٹا ہے چنانچہ حضرت معاویہؓ کے سامنے مقدمہ کی جو صورت خود استفسار کرنے والوں نے پیش کی اور جس کا اقرار خود عدلیہ حاکم نے بھی تحریری طور پر کیا وہ یہ تھی کہ ابن غیلان نے ایک شخص کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ شبہ میں ہاتھ کاٹ دینا بلاشبہ حاکم کی سنگین غلطی ہے۔ لیکن اس غلطی کی بناء پر کسی کے نزدیک بھی یہ حکم نہیں ہے کہ اس حاکم سے قصاص لینے کے لئے اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے بلکہ اس غلطی کی سزا میں اس پر تعزیر بھی جاری کی جاسکتی ہے اور اسے معزول بھی کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ واقعہ میں حضرت معاویہؓ نے اس شخص کی ریت بھی ادا کی اور حاکم کو معزول بھی کر دیا۔

میرے استدلال کے جواب میں ملک غلام علی صاحب نے جو بحث کی ہے وہ غلط بحث کا افسوس ناک نمونہ ہے۔ انہوں نے تین چار صفحات میں تو خلفائے راشدین کے عدل و انصاف کے متفرق واقعات ذکر کئے ہیں ظاہر ہے کہ حضرات خلفائے راشدین کے فیصلوں کے بلند معیار سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یہ دعویٰ بھی کبھی ہم نے نہیں کیا کہ حضرت معاویہؓ کے فیصلے خلفائے راشدین کے فیصلوں سے بہتر یا حزم و احتیاط اور اصابت رائے میں انکے برابر تھے۔ گفتگو تو یہ ہو رہی ہے کہ انکے فیصلے کو مولانا مودودی صاحب نے ”قانون کی بالاتری کا خاتمہ“ اور شریعت کے خلاف قرار دیا ہے وہ شرعی قانون کی رو سے غلط کیونکر کہا جاسکتا ہے؟

پھر ملک صاحب نے لکھا ہے کہ چونکہ واقعہ اس شخص کا ہاتھ شبہ میں نہیں بلکہ حاکم کو نکل مارنے پر کاٹا گیا تھا اور ”نکل مارنے پر ہاتھ کاٹ دینا کسی طرح بھی شبہ کی اصطلاح فقہی کی تعریف میں نہیں آسکتا“ اس لئے حضرت معاویہؓ کا یہ فیصلہ غلط تھا۔ ملک صاحب اگر ذرا ٹھنڈے دل اور انصاف سے غور فرمائیں تو ان پر بھی یہ بات

واضح ہو سکتی ہے کہ مذکورہ واقعہ میں حضرت معاویہؓ کے سامنے کنکر مارنے کا ذکر نہ استغاثہ کرنے والوں نے کیا نہ مدعا علیہ حاکم نے۔ ان کے سامنے تو دادرسی ہی اس بات کی طلب کی گئی کہ ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دیا گیا ہے۔ جب مدعی اور مدعا علیہ دونوں ایک صورت واقعہ پر متفق ہیں تو حضرت معاویہؓ کو یہ علم غیب آخر کہاں سے حاصل ہو سکتا تھا کہ مظلوم نے خود اصل واقعے کو چھپا کر مدعا علیہ کے جرم کو ہلکا کر دیا ہے۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کو اصل واقعے کی تحقیق کرنی چاہیے تھی۔ لیکن تحقیق اور تفتیش کا سوال وہاں پیش آتا ہے جہاں مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی اختلاف ہو، جہاں مقدمہ کے دونوں فریق کسی بات پر متفق ہو جائیں، وہاں اگر فیصلہ ان کی بیان کردہ منفقہ صورت پر کر دیا جائے تو حاکم کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا، فرض کیجئے کہ زید عمر پر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ حاکم جب عمر سے پوچھتا ہے تو وہ اقبال جرم کر لیتا ہے اگر اس صورت میں حاکم عمر پر قتل کی سزا عائد کر دے تو کیا وہ گناہ گار کہلائے گا؟

جناب غلام علی صاحب نے اس بحث میں دوسری تضاد بیانی یہ کی ہے کہ ایک طرف تو وہ مجھ سے یہ مطالبہ فرماتے ہیں کہ ”میں عثمانی صاحب کا بڑا منون ہوں گا اگر وہ البلاغ ہی میں یہ بات واضح فرمادیں کہ یہ عجیب و غریب اصول کتاب و سنت یا کسی فقہی کتاب کے کون سے مقام پر مذکور ہے کہ شبہ کا فائدہ جس طرح ملزم کو ملتا ہے، اسی طرح حاکم کو بھی ملتا ہے؟ گویا اس طرح وہ فقہی اصول کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف خود ہی تحریر فرماتے ہیں:

”یہ اصول اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ ہر انسان کی طرح ایک حاکم کا بھی اپنے فیصلے میں غلطی کر سکتا ہے اور وہ جائز تحفظ کا حق دار ہے“

میں حیران ہوں کہ ان دونوں باتوں میں کس طرح تطبیق دوں؟ سوال یہ ہے کہ اگر ایک حاکم غلطی سے کسی کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دے (یعنی سرقہ کی تمام شرائط پوری ہونے میں کوئی کسر رہ گئی ہو) اسکے باوجود وہ قطع ید کی سزا جاری کر دے (تو آپ کے نزدیک سزا میں اس کا ہاتھ کٹے گا یا نہیں؟ ملک صاحب کی پہلی بات کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا ہاتھ کٹے گا لیکن اس کی دلیل میں انہوں نے شامی کی جو عبارت پیش کی ہے اس میں کہیں قصاص کا ذکر نہیں۔ اس

میں صرف اتنا لکھا ہے کہ بعزل القاضی وبعزل عن القضاء (قاضی کو تعزیر کی جائے گی اور اسے عمدہ قضاء سے معزول کر دیا جائیگا) اس میں قصاص کا ذکر کہاں ہے؟ اور یہ میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت معاویہؓ نے ابن غیلان کو معزول کر دیا تھا۔ جس کا ذکر مولانا مودودی نے حذف کر دیا ہے۔ اور اگر انکے نزدیک ہاتھ نہیں کٹے گا جیسا کہ ملک صاحب کی دوسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے تو پھر میرا دعویٰ بھی تو یہی ہے کہ اس صورت میں حاکم پر قصاص نہیں آئیگا بلکہ اسے تعزیر اور معزولی کی سزا دی جائے گی۔ اس سے میرے استدلال کی تردید کیونکر ہوئی؟

یہ بات انتہائی افسوس ناک ہے کہ ملک غلام علی صاحب نے رد المحتار (شامی) کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں یہ بات صراحتاً موجود ہے کہ اگر کوئی قاضی یا حاکم شبہ میں سرقہ وغیرہ کی حد جاری کرے تو ضمان بیت المال پر آتا ہے اور حاکم کو پورا تحفظ ملتا ہے اور اگر عمدہ ایسی غلطی ہوئی ہو تو ضمان خود اس پر آتا ہے اس پر تعزیر بھی کی جاتی ہے اور اسے معزول بھی کیا جاتا ہے لیکن قصاص کسی صورت میں نہیں آتا۔ علامہ ابن عابدین شامی کی پوری عبارت یہ ہے:

واما الخطا فی حقه تعالیٰ بان قصص یحدثنا او سرقۃ او شرب
واستوفی الحدیثم ظہران الشہود کما مر فالضمان فی بیت
المال وان کان القضاء بالجور عن عمد واقربہ فالضمان فی
مالہ فی الوجوہ کلہا بالجنایۃ والانلاف وبعزل القاضی
وبعزل عن القضاء

اور رہا حاکم کا حق اللہ کے معاملہ میں غلطی کرنا مثلاً یہ کہ اسے حد زنا، حد
سرقہ یا شراب نوشی کی حد کا فیصلہ کر کے حد جاری کر دی پھر معلوم ہوا کہ
گواہ حسب سابق یعنی نااہل تھے تو ضمان بیت المال پر آئے گا اور اگر فیصلہ
جان بوجھ کر ظلم پر مبنی ہو تو تمام صورتوں میں خواہ وہ بدنی نقصان رسانی کی
ہوں یا مالی اختلاف کی ضمان خود قاضی کے مال پر آئے گا اور قاضی کو تعزیر
بھی کی جائے گی اور اسے قضاء کے عمدہ سے معزول بھی کیا جائیگا۔

۱۔ الشامی: رد المحتار، ص ۵۳۰ ج ۳ بلاق مصر "مطلب فی ما لوقضی القاضی بالجور"

اس عبارت میں جو پہلی صورت (گواہوں کے نا اہل ہونے کی) بیان کی گئی ہے وہ بعینہ حضرت معاویہؓ والے مقدمے کی ہے، اس لئے کہ انکے سامنے مقدمہ قضا با شب کا پیش ہوا تھا، اس بارے میں علامہ شامیؒ نے صاف لکھا ہے کہ ضمان (دیت) بھی بیت المال پر ہوگا، حاکم پر نہیں۔ بلکہ اس عبارت سے تو صاف یہ معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ کو معلوم بھی ہو جاتا کہ قضاء قاضی بالجور ہوئی ہے تب بھی اس پر قصاص نہ آتا بلکہ ضمان، تعزیر اور معزولی کی سزائیں دی جاتیں۔ اب یہ انتہا درجے کی دلاوری ہی کی بات ہے کہ ملک صاحب شامی کی اس عبارت کو جو صراحتاً انکے موقف کی تردید کر رہی ہے اپنی تائید میں پیش کر کے مجھ سے دلیل کا مطالبہ بھی فرماتے ہیں۔ اِنَّ هَذَا شَيْءٌ عَجَابٌ!

گورنروں کی زیادتیاں

اس کے بعد مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے کچھ اور گورنروں کی زیادتیوں کے واقعات درج کئے تھے اور انکا ذمہ دار حضرت معاویہؓ کو ٹھہرایا تھا ان میں سے پہلا واقعہ زیاد کا تھا کہ اسنے بعض لوگوں کے ہاتھ صرف اس جرم پر کاٹ دیئے کہ انہوں نے اسپر خطبہ کے دوران سنگ باری کی تھی، اس روایت میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اسکے ایک راوی علی بن جن سے عمر بن شہب نے یہ روایت نقل کی ہے اگر یہاں علی سے مراد علی بن عاصم ہیں تو انکی روایات ائمہ جرح و تعدیل کے نزدیک قابل استدلال نہیں ہیں اس بات پر تو سبھی متفق ہیں کہ روایات کے معاملے میں بکفرت غلطیاں کرتے ہیں، حافظے میں کمزور ہیں، اور انہیں وہم بہت ہو جاتا ہے اور غلطی کا اعتراف کبھی نہیں کرتے پھر بعض حضرات کا کہنا تو یہ ہے کہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے اور بعض حضرات نے ان پر کذب کا الزام بھی لگایا ہے۔ یزید بن ہارون فرماتے ہیں: ما زلنا نعرفہ بالکذب (ہمیں مسلسل انکے جھوٹ کی اطلاعات ملتی رہی ہیں) انہوں نے کئی روایات خالد الخداع سے نقل کی ہیں جب حضرت خالد سے تہدیتی کی گئی تو انہوں نے سب کا انکار کیا۔

۱ عمر بن شہب کے اساتذہ میں "علی" نام کے دو استادوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک علی بن عاصم ہیں

(تہذیب ص ۳۶۰ ج ۷) اور دوسرے علی بن محمد جن سے طبریؒ میں کئی روایتیں مروی ہیں۔

۲ ابو حاتم الرازی: الجرح والتعديل ص ۱۹۸ و ۱۹۹ ج ۳ و تہذیب التہذیب ص ۳۲۳ ج ۳۲۸ ج ۷

اور اگر اس سے مراد علی بن محمد ہیں جیسا کہ تاریخ طبری ہی کے بہت سے مقامات پر عمر بن شبہ، علی بن محمد سے روایت کرتے ہیں تو عمر بن شبہ کے ہم عصروں میں بھی اس نام کے دو صاحبان گزرے ہیں۔ ایک علی بن محمد اسی یہ بھی منکلم فیہ ہیں۔ اور دوسرے علی بن محمد موصلی۔ انہیں خود ان کے شاگرد حافظ ابو نعیم نے کذاب قرار دیا ہے۔ پھر ان کے استاد مسلم بن حارب ہیں، جتنی اسماء الرجال کی کتابیں ہمارے پاس ہیں ان میں کہیں انکا کا تذکرہ نہیں مل سکا۔

اس وجہ سے یہ روایت ناقابل اعتماد ہے لیکن علی سبیل القرض میں نے یہ لکھا تھا کہ اگر اس روایت کو درست بھی مان لیا جائے تو کسی تاریخ میں یہ موجود نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اسکی اطلاع ہوئی اور انہوں نے اس پر زیادہ کوئی تنبیہ نہیں کی۔ ملک صاحب نے اس احتمال کو رد کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس واقعہ کا علم نہیں ہوا، میرے نزدیک بھی اس میں شک نہیں کہ یہ محض احتمال ہی ہے، اسے نہ قطعیت کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور نہ قوی احتمال قرار دیا جاسکتا ہے اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتماد ہے۔

دوسرا واقعہ بسیر بن ابی ارطاة کا تھا کہ انہوں نے یمن میں حضرت علیؓ کے گور زعبید اللہ بن عباس کے دو بچوں کو قتل کر دیا، اور ہمدان میں بعض مسلمان عورتوں کو کینہ بنا لیا۔ جہاں تک بچوں کے قتل کا تعلق ہے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت کا نہیں بلکہ مشاجرات کے زمانہ کا قصہ ہے جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے لشکر باہم برسہا برس لڑتے رہے۔ اور اول تو ان جنگوں کے بیان میں راویوں نے رنگ آمیزیاں بہت کی ہیں، حافظ ابن کثیر بھی اس قصہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں وفی صحتہ عندی نظر اس قصہ کی صحت پر مجھے اعتراض ہے (الہدایہ ج ۲، ص ۷۷) دوسرے یہ شدید افتراء تھی کہ دور تھا جس میں گور ز اور فوج کے سالار مسلسل لڑائیوں میں مصروف رہے ہیں۔ ان حالات میں ان پر ہمہ وقت پورا قابو رکھنا بہت مشکل تھا، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے اپنے ماتحتوں کو یہ ہدایت کی ہوئی تھی کہ وہ قتال کے وقت حد ضرورت سے آگے نہ بڑھیں خود انہی بزرگوار کا مقولہ میں نے نقل کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے انہیں ہر مانع شخص

۱۔ العسقلانی لسان المیران ص ۲۵۳ ج ۳، دائرة المعارف دکن ۱۳۳۰ھ

۲۔ الذمعی: میزان الاعتدال ص ۷ ج ۲، مطبعہ المطوۃ ۱۳۲۵ھ

کے قتل سے بھی منع کیا تھا چہ جائیکہ چھوٹے بچوں کو بھی قتل کریں۔ اب اگر گورنر اور سپہ سالار اس عہد پر قائم نہیں رہے تو یہ انکی غلطی ہے، اور جس زمانے میں کئی کئی محاذوں پر لڑائی ہو رہی ہو، اس وقت عہدوں میں اکھاڑ پھانڈ آسان نہیں ہوتی، اسی بناء پر حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا گروہ جو ہرگز کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا اس دور میں حضرت علیؓ کے ساتھ لگا رہا اور ان میں سے بعض لوگ اونچے منصبوں پر فائز رہے، اس لئے کہ انہیں اس نازک وقت میں اکھاڑتائے نئے نئے قتلوں کا سبب بننا جتنی روک تھام حضرت علیؓ کے لئے سخت مشکل تھی، اسی قسم کی مجبوریاں حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی تھیں جن کی بناء پر وہ گورنروں اور سپہ سالاروں پر کما حقہ نظر نہ رکھ سکے، لیکن جب یہ افرا تفری کا وقت گذر گیا تو انہوں نے ہر ابن ابی ارطاة کو معزول بھی کر دیا۔ ملک غلام علی صاحب نہ جانے کیوں معزولی کو تسلیم نہیں فرماتے، حالانکہ میں نے تاریخ ابن خلدون کا حوالہ بقید صفحات دیا تھا۔ جو صاحب چاہیں تاریخ مذکور ص ۹۸ جلد ۳ مطبوعہ بیروت "بعث معاویہ الی العمل الی الامصار" کا مطالعہ فرمائیں۔

رہا مسلمان عورتوں کو نینر بنانے کا قصہ، سو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ قصہ الاستیعاب کے سوا کسی کتاب میں مجھے نہیں ملا، اور استیعاب میں جو سند ذکر کی گئی ہے وہ بھی ضعیف ہے، کیونکہ اس کے راوی موسیٰ بن عبیدہ ہیں جسے باہرے میں امام احمدؒ کا قول ہے کہ ان سے روایت کرنا حلال نہیں۔ اس کے جواب میں ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں کہ: "مولانا نے ابن عبد البر کا جو قول نقل کیا ہے وہ موسیٰ بن عبیدہ وغیرہ کے حوالے سے نہیں نقل کیا ہے، بلکہ ابو عمرو الشیبانی کے حوالے سے نقل کیا ہے، ابن عبیدہ والی روایت بعد میں بطور تائید آئی ہے ابو عمرو الشیبانی ثقہ راوی ہیں۔"

یہاں ملک صاحب نے حافظ ابن عبد البر کے کلام کی بالکل غلط تشریح کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شروع میں حافظ ابن عبد البر نے ابو عمرو الشیبانی کے حوالے سے ہر بن ابی ارطاة کے مدینہ پر خروج کرنے کا ذکر کیا ہے اور اسکے بعد اسکے الفاظ یہ ہیں:

وفی هذه الخرجة الثی ذکر ابو عمرو الشیبانی اغار بسرین

ارطاة علی ہمدان و سبب نساء ہم

بسرین ارطاة کے جس سفر کا یہ ذکر ابو عمرو شیبانی نے کیا ہے اسی سفر میں بسرین ارطاة نے ہمدان پر حملہ کر کے وہاں کی عورتوں کو قید کیا۔^۱

پھر اس کی دلیل میں موسیٰ بن عبیدہ والی سند بیان کی ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ عورتوں کو کینز بنانے کا قصہ ابو عمرو شیبانی کی روایت سے بیان نہیں کیا گیا بلکہ شیبانی کا ذکر محض سفر کے حوالہ کے طور پر آیا ہے کہ جس سفر کا انہوں نے ذکر کیا ہے اسی سفر میں موسیٰ ابن عبیدہ کی روایت کے مطابق عورتوں کو کینز بنانے کا واقعہ بھی پیش آیا ہے۔ لہذا اس قصے کو بیچارے ابو عمرو الشیبانی کے سر منڈھ دینا کسی طرح صحیح نہیں۔!

پھر ملک صاحب فرماتے ہیں: ”تاریخی بحث میں ہر قدم پر راوی کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کرنا نہ ممکن ہے، نہ آج تک کسی سے ہو سکا ہے“ لیکن میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ تاریخی روایات کا مسئلہ کے تحت میں گھنگلو کر چکا ہوں کہ جن روایتوں سے صحابہ کرام پر فسق یا ارتکاب کبیرہ کا الزام لگتا ہوا ان میں راوی کی ”خیریت“ ضرور معلوم کی جائے گی، اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی مسلمان کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ راویوں کو ضعیف مجروح، جھوٹا کذاب اور افتراء پر داز سمجھنے کے باوجود انہی کی بات مان کر صحابہ کرام کو مطعون کرنا گوارا کر لے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر سچ سچ یہ بات درست ہوتی کہ مسلمان عورتوں کو بازار میں کھڑا کر کے بیچا گیا تو اس واقعے کی شہرت حد تو اترا تک پہنچ جانی چاہیے تھی۔ یہ تاریخ اسلام کے اس عظیم سانحہ کا ایک ہی راوی کیوں ہے؟ اور راوی بھی وہ جس سے بقول امام احمدؒ روایت کرنا حلال نہیں؟ اور پھر تاریخی کتابوں کے اتنے بڑے ذخیرے میں یہ بات صرف الاستیعاب ہی میں کیوں ملتی ہے؟ طبری، ابن کثیر، ابن عساکر، حافظ ابن حجر اور ابن سعد جیسے مؤرخین اس قصے کو کیوں نقل نہیں کرتے؟ ملک صاحب اسکے جواب میں فرماتے ہیں:

”جتنی محنت اور جتنا وقت ان حضرات نے کتابوں کی ورق گردانی میں صرف کیا ہے اگر میں کرتا تو شاید میں بھی متعدد تائیدی حوالے پیش کر دیتا۔“

۱۔ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۱۶۳ ج ۱۱ مکتبۃ التجاریہ ۱۳۵۸ھ

۲۔ واضح رہے کہ میں نے اپنا سابقہ مضمون تقریباً ۱۷ ماہ میں لکھا تھا جبکہ اس کے ساتھ دوسرے بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

اس کے بعد انہوں نے اسد الغابہ کی ایک عبارت اور نقل کی ہے کہ اس میں بھی یہ قصہ موجود ہے۔ لیکن موصوف جو عبارت تائید کے طور پر لائے ہیں، وہ بلاسند وحوالہ ہے، میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر تو استیعاب ہی کی روایت تھی کہ اس کی ایک، ضعیف سنی، سند تو ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اب تک تلاش بسیار کے باوجود مسلمان عورتوں کو کینزہ بنانے کا یہ قصہ کسی صحیح سند کے ساتھ کہیں نہیں مل سکا۔ اور اتنا دل گردہ ہم میں نہیں ہے کہ راویوں کو ضعیف اور مجروح جانتے بوجھتے ہم یہ باور کر لیں کہ حضرت عثمانؓ کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ امت جسے خیر القرون کہا گیا ہے، غیرت و حمیت سے اتنی کوری، خدا کے خوف سے اتنی بے نیاز اور آخرت کے خیال سے اتنی بے فکر ہو گئی تھی کہ اسے مسلمان عورتوں کی عزت و آبرو کا بھی کوئی پاس باقی نہیں رہا تھا؟

اس کے بعد مولانا مودودی صاحب نے دو واقعات ذکر کئے تھے جن میں لڑائی کے دوران مخالفین کا سرکٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا گیا، ایک حضرت عمار بن یاسرؓ کا سر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا اور دوسرا عمرو بن العاصؓ کا۔

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ سرکٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جس الائمہ سرخی رحمۃ اللہ علیہ باغیوں کے احکام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واکرہ ان توخذ رءوسہم فیطاف بہا فی الافاق لانه مثلة وقد
نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المثلة ولو بالکلب
العقور ولانه لم یبلغنا ان علیا رضی اللہ عنہ صنع ذلک فی
شیئی من حرورہ وهو المتبع فی الباب... وقد جوز ذلک
بعض المتأخرین من اصحابنا ان کان فیہ کسر شوکتہم او
طمأنینۃ قلب اهل العلیل استدلالا بحديث ابن مسعود حين

حاشیہ گزشتہ سے بیوستہ

تحریری کام بھی جاری تھے اس کے مقابلے میں ملک غلام علی صاحب کا مضمون تیرہ مہینے جاری رہا اور اس عرصے میں ان کی کوئی اور تحریر سامنے نہیں آئی۔

حمل راس ابی جہل النی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم
ینکر علیہ ملہ

میں اس بات کو مکروہ سمجھتا ہوں کہ باغیوں کے سر اتار کر ان کا گت کرایا
جائے کیونکہ یہ مُٹلہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلکھنے کتے
کا بھی مُٹلہ کرنے سے منع فرمایا ہے، نیز اس لئے کہ ہمیں کوئی روایت ایسی
نہیں پہنچی کہ حضرت علیؓ نے اپنی جنگوں میں ایسا کیا ہو، اور اس باب
(باغیوں سے لڑائی) میں وہی قائل اتباع ہیں۔۔۔۔۔ اور ہمارے اصحاب
(حنفیہ) میں سے بعض متاخرین نے اس عمل کو جائز قرار دیا ہے، اگر اس
سے باغیوں کی شوکت نوتتی ہو یا اہل عدل کو وہی طمانیت حاصل ہوتی ہو، یہ
حضرات ابن مسعودؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ ابو جہل کا
سر اتار کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے تو آپؐ نے ان پر
کوئی نکیر نہیں فرمائی تھی۔“

جہاں تک حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے واقعہ کا تعلق ہے اس کے بارے
میں میری گزارش یہ تھی کہ یہ روایت مولانا نے صحیح نقل کی ہے، لیکن اس میں صرف اتنا ذکر
ہے کہ حضرت عمارؓ کا سر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا، اس میں نہ تو یہ مذکور ہے کہ یہ عمل
حضرت معاویہؓ کے حکم سے ہوا، اور نہ یہ کہ حضرت معاویہؓ نے اس کی ہمت افزائی یا تصدیق
و توثیق فرمائی، بلکہ میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جس طرح حضرت علیؓ نے حضرت زبیر بن
عوامؓ کا سر کاٹ کر لانے والے کو زبانی تنبیہ فرمائی تھی، اسی طرح حضرت معاویہؓ نے بھی
اس پر افسوس کا اظہار کیا ہو گا جسے راوی نے ذکر نہیں کیا۔ ملک غلام علی صاحب فرماتے ہیں
کہ اگر حضرت معاویہؓ نے اس پر اظہار افسوس کیا ہوتا تو روایت میں اس کا ذکر ضرور ہوتا،
جیسے ان کی دوسری گفتگو روایت میں نقل کی گئی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے گمان
کے لئے روایت میں کوئی دلیل نہیں ہے، اور یہ بات بھی میں نے محض ایک احتمال کے طور پر
کسی تھی لیکن کیا اس بات سے بھی انکار کیا جاسکتا ہے حضرت معاویہؓ نے اس عمل کا حکم

نہیں دیا تھا، اور نہ کوئی ایسا کام کیا جسے اس عمل پر پسندیدگی کا اظہار کہا جاسکے۔ ادھر مبسوط سرخسی کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ بات کراہت کی حد تک پہنچتی ہے۔ اس مکروہ عمل کا ارتکاب حضرت معاویہؓ کے حکم یا ایما کے بغیر کچھ لوگوں نے کر لیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کو حضرت معاویہؓ کا تنبیہ کرنا روایات سے ثابت نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس پر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی کہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں قانون کی بالا تری کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ان کی سیاست دین کے تابع نہیں رہی تھی۔ اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس معاملہ میں حلال و حرام کی تیز روانہ رکھتے تھے۔

دوسرا واقعہ عمرو بن العاص کا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے ان کے سرکاشت کرایا میں نے گذارش کی تھی کہ گشت کرانے کا قصہ مولانا کے دیئے ہوئے چار حوالوں میں سے صرف البدایہ و النہایہ میں ہے، تنقیح التہذیب میں گشت کرانے کا قصہ نہیں، مگر موصل سے حضرت معاویہؓ کے پاس جانے کا قصہ موجود ہے۔ اس کے برخلاف طبریؒ کی روایت میں نہ سرکاشے کا ذکر ہے نہ اسے لیجانے کا بیان ہے اور نہ گشت کرانے کا قصہ ہے، بلکہ حضرت معاویہؓ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ ”ہم عمرو بن العاص پر زیادتی نہیں کرنا چاہتے“ انہوں نے حضرت عثمانؓ پر نیزے کے نو وار کئے تھے، تم بھی ان پر نیزے کے نو وار کرو“ اس میں یہ الفاظ کہ ”ہم ان پر زیادتی نہیں کرنا چاہتے“ واضح طور سے حضرت معاویہؓ کی طرف سے ہر زیادتی کی تردید کر رہے ہیں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ طبریؒ کی یہ روایت دوسری روایتوں کے مقابلے میں زیادہ قابل ترجیح ہے، کیونکہ وہ حضرت معاویہؓ کے بردبارانہ مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اس کے برعکس البدایہ و النہایہ کی روایت سند و حوالہ کے بغیر بھی ہے اور حضرت معاویہؓ کے مزاج سے بعید بھی۔ مولانا مودودی صاحب حضرت علیؓ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

”جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں تو آخر ہم ان روایات کو کیوں ترجیح نہ دیں جو ان کے مجموعی طرز عمل سے

مناسبت رکھتی ہیں اور خواہ مخواہ وہی روایات کیوں قبول کریں جو اس کی
مخالف نظر آتی ہیں۔“ (خلافت و ملوکیت ص ۳۳۸)

میں نے پوچھا تھا کہ اس اصول کا اطلاق حضرت معاویہؓ پر کیوں نہیں ہوتا؟ اس کے
جواب میں جناب غلام علی صاحب لکھتے ہیں: ”فرض کیا کہ امیر معاویہؓ نے اسے گشت نہ
کرایا ہو لیکن اتنی بات تو الہدایہ اور تہذیب دونوں میں منقول ہے کہ یہ سر موصل سے بصرہ
وکوفہ اور وہاں سے دمشق امیر معاویہؓ تک پہنچا۔“

میری گزارش یہ ہے طبریؒ کی روایت حضرت معاویہؓ کی طرف سے ہر زیادتی کی تردید
کر رہی ہے اور اس میں سرکٹ کر بھیجے کا بھی ذکر نہیں ہے۔ تاہم اگر بالفرض موصل کے
عامل نے یہ سر بھیجا بھی ہو تو حضرت معاویہؓ اس سے بری ہیں، کیونکہ انہوں نے ہر قسم کی
زیادتی سے سراسر منع فرمایا تھا۔

حجر بن عدیؓ کا قتل

حضرت معاویہؓ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت حجر بن عدیؓ کو ناجائز طور
پر قتل کیا، مولانا مووی صاحب نے بھی اس الزام کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں ذکر کیا
ہے۔ میں نے اس کے جواب میں حضرت حجر بن عدیؓ کے قتل کا پورا واقعہ تاریخ طبری وغیرہ
سے نقل کر کے بیان کر دیا تھا، جس کی رو سے مولانا مووی صاحب کے اس موقف کی تردید
ہو جاتی ہے کہ حجر بن عدیؓ کو محض ان کی حق گوئی کی سزا میں قتل کیا گیا۔ میں نے حوالوں کے
ساتھ ثابت کیا تھا کہ حضرت حجر بن عدیؓ نے سبائی فتنہ پردازوں کے اکسائے پر حضرت
معاویہؓ کی حکومت کے خلاف ایک بھاری جمعیت تیار کی تھی جو مختلف اوقات میں ان کی
حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے بناتی رہی، اس نے کھلم کھلا حضرت عثمانؓ اور حضرت
معاویہؓ پر لعن طعن کو اپنا وظیفہ بنالیا اور بالآخر حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف برسہا بار
ہو گئی۔ حضرت مغیرہؓ اور زیاد بن ابی سفیان نے نرمی اور گرمی کا ہر طریقہ آزما لیا، مگر یہ لوگ
اپنی شورش سے باز نہ آئے، آخر کار کوفہ کے ستر شرفاء نے جن میں اونچے درجے کے صحابہؓ
و تابعین بھی شامل تھے، ان کے خلاف مندرجہ بالا امور کی شہادت دی، اس شہادت کے بعد
حضرت معاویہؓ نے حجر بن عدیؓ کے قتل کا فیصلہ کیا۔

جناب ملک غلام علی صاحب نے اس مسئلے میں میرے مضمون کے جواب میں جو طویل بحث کی ہے وہ تقریباً اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے، اس لمبی چوڑی بحث میں سے اگر مناظرانہ عبارت آرائی، طعن و تشنیع، غیر متعلق باتوں، سیاسی جذبات انگیزوں کو خارج کر دیا جائے تو تین نکتے ایسے ملتے ہیں جو فی الواقعہ علمی نوعیت کے بھی ہیں اور زیر بحث مسئلہ سے متعلق بھی۔ اس لئے وہ جواب کے مستحق ہیں، یہاں میں مختصراً انہی پر گفتگو کروں گا۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ بغاوت کا جرم صرف اس وقت سزائے موت کا مستوجب ہوتا ہے جبکہ اہل بغی ایک طاقت ور جماعت اور بھاری گروہ پر مشتمل ہوں اور مسلح ہو کر اسلامی حکومت کا مقابلہ کریں، ملک غلام صاحب کا کہنا یہ ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ کے گروہ پر یہ تعریف صادق نہیں آتی، بلکہ انہوں نے جو کچھ کیا، وہ ایک معمولی ایچی ٹیشن تھا۔ زیادتی پولیس کے خلاف انہوں نے جو لڑائی لڑی اس میں اسلحہ بھی استعمال نہیں ہوئے۔ اس پورے ہنگامے میں صرف ایک مرتبہ تلوار کے استعمال کا ذکر تو راجح میں آیا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ اگر حجر بن عدیؓ کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ تاریخوں میں دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ ان کی جمعیت ایک بھاری اور طاقت ور جمعیت تھی جسے قابو میں لانے کے لئے زیادہ جیسے گورنر کو بڑی مشقت و محنت اٹھانی پڑی۔ مندرجہ ذیل دلائل اس کی تائید کرتے ہیں۔

(۱) حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حجر بن عدیؓ تین ہزار افراد کی مسلح جمعیت لے کر حضرت معاویہؓ کے خلاف کوفہ سے نکلے تھے۔ (فلسان حجر عن الکوفۃ فی ثلاثۃ الاف بالسلح)۔

(۲) ان کی جمعیت اتنی بڑی تھی کہ اسی کے بل پر انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف یہ کہہ کر آمادہ کرنا چاہا تھا کہ اگر آپ اس معاملے (خلافت) کو طلب کرنا پسند کرتے ہوں تو ہمارے پاس آجائیے، اس لئے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ مرنے کے لئے اپنی جانوں کو تیار چکے ہیں (فان کنت تحب ان تطلب هذا الامر

فاقدم الینا فقد وطننا انفسنا علی الموت معک) ۱

(۳) ان کے طاقتور ہونے کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ زیاد جب حضرت عمرو بن حبیب رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر بصرہ گیا تو وہ ان لوگوں پر قابو نہ پاسکے اور زیاد کو خط میں لکھا کہ:

”اگر تم کو فوج کو بچانے کی ضرورت سمجھتے ہو تو جلدی آ جاؤ۔“ ۲

(۴) طبریؒ نے نقل کیا ہے کہ زیاد نے تین مرتبہ اپنی پولیس حجر کے پاس بھیجی ہر بار پولیس کی تعداد میں اضافہ بھی کیا گیا، لیکن کسی بھی مرتبہ پولیس حجر اور ان کے ساتھیوں پر غالب نہ آسکی۔

(۵) پولیس کی ناکامی کے بعد زیاد نے ہمدان، تمیم، ہوازن، ابناء اعصر، فنج، اسد اور غطفان کے قبائل پر مشتمل ایک پوری فوج تیار کی تہ اور اسے کندہ میں حجر کے مقابلے کے لئے بھیجا، یہ فوج بھی حجر کو گرفتار نہ کر سکی، یہاں تک کہ حجر بن عدیؒ نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔

(۶) حضرت وائل بن حجر اور کثیر بن شہابؓ حضرت حجر بن عدیؒ کے خلاف گواہیوں کا جو صحیفہ لیکر گئے تھے اور جس پر انہوں نے خود بھی گواہی دی اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ: ”انہوں نے امیر المومنین کے عامل کو نکال باہر کیا ہے“ ظاہر ہے کہ دو چار افراد پر مشتمل ایک چھوٹی سی ٹولی یہ کام نہیں کر سکتی۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے کسی تاریخ کی کتاب میں یہ واقعہ نہیں ملا، لیکن جب ستر صحابہ و تابعین اس پر گواہی دے رہے ہیں اور طبریؒ اسے ذکر کرتے ہیں تو معلوم نہیں تاریخ کی کتاب میں واقعہ ملنے کا اور کیا مطلب ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ملک غلام علی صاحب ان تمام باتوں پر غور فرمائیں گے تو ان کا یہ شبہ آسانی سے دور ہو جائے گا کہ حجر کی جماعت ایک معمولی سے گروہ پر مشتمل تھی جس پر اہل بغی کی تعریف صادق نہیں آتی۔

۱۔ الدیوری: الاخبار الخوال، ص ۲۲۱

۲۔ طبقات ابن سعد ص ۲۱۸ ج ۶ ج ۲۲ دار صادر بیروت والبدایہ والنسایہ ص ۵۳ ج ۸

۳۔ ابن عساکر: تہذیب تاریخ دمشق ص ۳۷۳ و ۳۷۴ ج ۳ روتہ الشام ۱۳۳۰ھ وطبری ص ۱۸۳ آ

جناب غلام علی صاحب نے دو سرائکتے یہ اٹھایا ہے کہ اگر بالفرض حجر بن عدی بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے تو گرفتاری کے بعد انہیں قتل کرنا جائز نہیں تھا، کیونکہ باغی اسیر کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی۔

لیکن جس شخص نے بھی فقہ کی کتابوں میں اسلام کے قانون بغاوت کا مطالعہ کیا ہو، وہ یہ آسانی اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ ملک صاحب کا یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ باغی اگر گرفتار ہو جائے تو سزائے موت سے بچ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی باغی کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ اگر اسے آزاد کر دیا گیا تو وہ پھر اسلامی حکومت کے خلاف جمعیت بنا کر دوبارہ بغاوت کا مرتکب ہو گا تو اسے قتل کرنے کی اجازت تمام فقہاء نے دی ہے، سزائے موت صرف اس وقت موقوف ہوتی ہے جبکہ باغیوں کی جماعت لڑائی میں ختم ہو گئی ہو اور جو دو چار افراد باقی رہ گئے ہوں ان کی موجودگی اسلامی حکومت کے لئے خطرہ نہ بن سکتی ہو۔ اس سلسلے میں فقہاء کی حسب ذیل تصدیقات ملاحظہ فرمائیے: شمس الاممہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

وكذلك لا يقتلون الاسر قاله بنو ابيهم فتم... وان كانت له فنة
فلا باس بان يقتل اسيرهم لانه ما اندفع شره ولكنه مقهور
ولو نخلص انحاز الى فئته فاذا رأى الامام المصنحة فى قتله فلا
باس بان يقتله

اسی طرح اگر باغیوں کی کوئی جماعت باقی نہ رہ گئی ہو تو قیدی کو قتل نہیں کریں گے۔ اور اگر اس کی جماعت باقی ہو تو ان کے گرفتار شدہ باغی کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں اس لئے اس کا شرفخ نہیں ہوا، وہ محض مجبور ہو گیا ہے، اور اگر اسے آزادی مل گئی تو وہ اپنی جماعت کے ساتھ مل جائے گا، لہذا اگر امام اسے قتل کرنے میں مصلحت دیکھے تو اسے قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"۱

فتاویٰ عالمگیریہ میں اسی مسئلے کو یوں بیان کیا گیا ہے:

ومن اسر منهم فليس للامام ان يقتله اذا كان يعلم انه لو لم يقتله
لم يلتنحوا اليه ممنوعه اما اذا كان يعلم انه لو لم يقتله يلتنحوا
اليه ممنوعه فيقتله

اور باغیوں میں سے جو شخص گرفتار ہو جائے تو اگر یہ معلوم ہو کہ اسے قتل
نہ کرنے کی صورت میں وہ کسی طاقت ور جماعت سے جانیں ملے گا تو امام
کو اسے قتل کرنے کا حق نہیں، لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو کہ اگر اسے قتل
نہ کیا گیا تو وہ کسی طاقت ور جماعت سے جا ملے گا تو اسے قتل کر دے۔“

حجر بن عدی کے بارے میں حضرت معاویہؓ کو پورا اندیشہ تھا کہ اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو
وہ پھر حکومت کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوں گے، چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے اس کا
اطہار بھی فرمایا:

ان حبرا کراس القوم واخاف ان خلیت سبیلہ ان یفسد علی
مصریؓ

”جس پوری قوم کے سردار ہیں، اور اگر میں نے انہیں چھوڑ دیا تو مجھے
خطرہ ہے کہ وہ میری حکومت کے خلاف فساد کریں گے۔“
اور ایک اور موقع پر انہوں نے ارشاد فرمایا:

قتله احب الی من ان اقتل معہ مائۃ الف

”ان کا قتل کرنا مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اسکے کہ میں اسکے ساتھ ایک
لاکھ آدمیوں کو قتل کروں۔“

ان حالات میں خود فیصلہ کر لیا جائے کہ جناب غلام علی صاحب کا یہ موقف کس حد
تک درست ہے کہ گرفتار ہونے کے بعد حجر بن عدیؓ کو قتل کرنا جائز نہیں رہا تھا۔

۱۔ فتاویٰ عالمگیری ص ۲۴۰ ج ۲ نوٹشور، مزید ملاحظہ فرمائیے رد المحتار ص ۴۸۱ ج ۳ و فتح القدیر ص

۴۴۳ ج ۳ و بدائع الصنائع ص ۱۳۱ ج ۷

۲۔ اللبری ص ۲۰۳ ج ۲

۳۔ البدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

ملک غلام علی صاحب کو اس کارروائی پر تیسرا قابل ذکر اعتراض یہ ہے کہ زیاد نے ستر گواہیوں کا جو صحیفہ حضرت معاویہؓ کے پاس روانہ کیا وہ سب لکھی ہوئی گواہیاں تھیں جو فقہی اصطلاح کے مطابق ”کتاب القاضی الی القاضی“ کے تحت آتی ہیں، اور گواہی کا یہ طریقہ حدود و قصاص کے معاملات میں معتبر نہیں ہوتا۔

لیکن ملک صاحب موصوف نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ ان ستر گواہیوں میں سے دو گواہ خود حضرت وائل بن حجرؓ اور حضرت کثیر بن شہابؓ بھی تھے جن کے ذریعے یہ صحیفہ بھیجا گیا تھا، لہذا ان دو گواہوں نے اپنی گواہی حضرت معاویہؓ کے سامنے زبانی پیش کی تھی، اور باقی گواہیاں محض تائید کے طور پر تھیں، شرعی نصاب شہادت حضرت وائلؓ اور حضرت کثیرؓ کی زبانی گواہیوں سے پورا ہو گیا تھا، چنانچہ حافظ شمس الدین ذہبیؒ لکھتے ہیں:

”و جاء الشهود فشهدوا عند معاویة علیہ“

”گواہ آئے اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کے رو برو حجر بن عدیؓ کے خلاف گواہی دی“^۱

بلکہ حافظ ذہبیؒ نے ”شہود“ کا لفظ صیغہ جمع کے ساتھ استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو حضرات کے علاوہ بھی بعض گواہوں نے زبانی شہادت دی تھی، رہا حضرت شریح کا قصہ، سوان کی تردید کے باوجود نصاب شہادت باقی تھا، اس لئے کہ حضرت وائلؓ اور حضرت کثیر بن شہابؓ نے اپنی گواہیوں سے رجوع نہیں کیا تھا، پھر حضرت شریحؓ نے جن الفاظ میں تردید کی ان میں حضرت حجر بن عدیؓ کے عابد و زاہد ہونے کا ذکر موجود ہے لیکن جن باغیانہ سرگرمیوں کی شہادت دو سروں نے دی تھی، ان کی نفی نہیں ہے۔ اس لئے قانونی طور پر ان کی تردید سے اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان تین نکات کی وضاحت کے بعد ملک غلام علی صاحب کی پوری بحث کا جواب ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی ساری گفتگو انہی نکات پر مبنی ہے، البتہ آخر میں ان کے ایک اور اعتراض کا جواب بھی پیش خدمت ہے جو عام ذہنوں میں غلط پیدا کر سکتا ہے،

۱۔ الذہبیؒ تاریخ الاسلام، ص ۲۷۶ ج ۲، مکتبۃ القدسی ۱۳۶۸ھ

ملک صاحب لکھتے ہیں :

”حضرت معاویہؓ نے بعض صحابہؓ کے کہنے پر چھ افراد کو چھوڑ دیا اور آٹھ کو قتل کرنے کا حکم دیا، سوال یہ ہے کہ اس دو گونہ اور امتیازی سلوک کی وجہ کیا ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عثمانی صاحب نے اس سوال کا جواب بعض پوچھنے والوں کو یہ دیا ہے کہ باغی کا قتل واجب نہیں صرف جائز ہے“ اس لئے امیر معاویہؓ نے جسے چاہا قتل کر دیا، جسے چاہا معاف کر دیا۔ ناخدا سرگربان ہے اسے کیا کہیں! اس کے معنی تو یہ ہیں کہ عثمانی صاحب حضرت معاویہؓ کو ماشا اللہ یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء کے مقام عالی پر فائز کرنا چاہتے ہیں کہ معاملہ عدالت کا نہیں، شیت کا تھا، میں یہ حقیقت کھول کر بیان کر چکا کہ اول تو یہ اصحاب ہرگز باغی نہ تھے، اور بالفرض اگر تھے بھی تو گرفتار ہو جانے کے بعد مجرم بغاوت کی سزا ہرگز قتل نہیں ہے۔ اب میں عثمانی صاحب سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ چچا چاکرٹے بات کرنے کے بجائے صاف صاف بتائیں کہ انہوں نے یہ اصول کہاں سے اخذ کیا ہے کہ باغی امیر کا قتل واجب تو نہیں مگر جائز ہے؟“

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۶۹ء، ص ۴۴)

ملک صاحب کا یہ مطالبہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کسی سے یہ کہنے لگے کہ صاف صاف بتاؤ تم نے یہ اصول کہاں سے اخذ کیا ہے کہ نماز کے لئے وضو ضروری ہے؟ میں حیران ہوں کہ وہ کس بنیاد پر مجھ سے یہ مطالبہ فرما رہے ہیں۔ جس شخص کو بھی فقہی کتابوں سے ادنیٰ مس ہو وہ اس ”اصول“ کے اثبات کے لئے ایک دو نہیں بلا مبالغہ فقہاء کے بیسیوں حوالے پیش کر سکتا ہے، ملک صاحب مجبور فرماتے ہیں تو ان میں سے چند ذیل میں پیش کرتا ہوں۔
در مختار فقہ حنفی کا معروف متن ہے، اس میں لکھا ہے:

”یہ بات مجھ سے ایک خط میں پوچھی گئی تھی ملک صاحب کے اس ارشاد سے اندازہ ہوا کہ یہ خطوط کہاں سے اور کس تنظیم کے ساتھ آرہے تھے۔
تہ زبان کی شریفی ملاحظہ فرمائیے۔“

والامام بالخيار في اسيرهم ان شاء قتله وان شاء حبسه له
”گرفتار شدہ باغی کے بارے میں امام کو اختیار ہے، اگر چاہے تو اسے قتل
کر دے اور اگر چاہے تو اسے محبوس رکھے“
امام کمال الدین بن ہمام اس ”اختیار“ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومعنى هذا الخيار ان يحكم نظره فيما هو احسن الامرين
في كسر الشوكة لا بهوى النفس والتشقى له
اس اختیار کا مطلب یہ ہے کہ امام (حاکم) اس بات پر غور کرے کہ باغیوں
کی شوکت توڑنے کے لئے کون سی صورت زیادہ بہتر ہے، محض خواہشات
نفس اور سنگ دلی کی وجہ سے کوئی صورت اختیار نہ کرے۔
ملک العلماء کا سنی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

واما اسيرهم فان شاء الامام قتله استنصالا لساقتهم وان شاء
حبسه لان دافع شره بالاسر والحبس وان لم يكن لهم فنة
يتحيزون اليها لم يتبع مدبرهم ولم يجهز على حربهم ولم
يقتل اسيرهم لوقوع الامن عن شرهم عند انعدام الفنة له
”جہاں تک باغی اسیر کا تعلق ہے تو امام اگر چاہے تو اسے قتل کر دے تاکہ
انکی عمل صحیح مٹتی ہو جائے، اور اگر چاہے تو اسے قید رکھے، اس لئے کہ اس
کا شر گرفتاری سے بھی دور ہو سکتا ہے اور اگر باغیوں کی کوئی ایسی جمعیت
نہ ہو جہاں وہ پناہ لے سکیں تو نہ ان کے بھاگنے والے افراد کا تعاقب کیا
جائے گا، نہ ان کے زخمیوں کا کام تمام کیا جائے گا اور نہ ان کے گرفتار
شدہ افراد کو قتل کیا جائے گا“ اس لئے کہ جب ان کی کوئی جمعیت نہیں رہی
تو ان کے شر کا بھی کوئی خوف نہیں رہا۔“

۱۔ الدر المختار مع رد المحتار، ص ۴۸۱ ج ۳، بولاق مصر۔

۲۔ ابن الہمام فتح القدر، ص ۴۳ ج ۳

۳۔ الکاسانی بدائع الصنائع، ص ۱۳۱ ج ۷، مطبعہ جمالیہ مصر ۱۳۲۸ھ

علامہ مرغینانی صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

فان كانت (ای فئہ) یقتل الامام الاسیر وان شاء حبسہ
اگر باغیوں کی جمعیت موجود ہو تو ان کے گرفتار شدہ افراد کو امام قتل کر دے
اور چاہے توقید رکھے۔

یہ چند حوالے میں نے محض مثال کے طور پر پیش کر دیئے ہیں، ورنہ فقہ کی کوئی بھی
مکمل کتاب اس مسئلے سے خالی نہیں ہے، فقہاء کی ان تصریحات سے قدر مشترک کے طور پر
جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ جس باغی اسیر کی جمعیت باقی ہو، اسے قتل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ
امام کے سپرد کیا گیا ہے، تاکہ وہ حالات کے پیش نظر مناسب فیصلہ کر سکے، اگر کسی قیدی کا وجود
باغیوں کی جمعیت کو تقویت پہنچا سکتا ہو اور اس سے ان کی جماعت کی شوکت میں اضافہ
ہو سکتا ہو تو اسے قتل کر دے، اور جس قیدی کے بارے میں ظن غالب یہ قائم ہو جائے کہ
باغیوں کی شوکت کو توڑنے کے لئے اسے قتل کرنا ضروری نہیں ہے تو اس کی سزائے موت کو
موقوف کر دے۔

تمام فقہاء اس حکم کے بیان پر متفق ہیں اور ہر ایک فقہی کتاب میں امام کو یہ اختیار
دیا گیا ہے، اب اگر جناب ملک قلام علی صاحب کو یہ بات ناگوار ہے تو وہ میدان حشر میں ان
تمام بزرگوں سے جنہوں نے اپنی کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے یہ سوال ضرور کریں کہ آپ نے
صرف حضرت معاویہؓ ہی کو نہیں، اسلامی حکومت کے تمام قرآن رواؤں کو "یعذب من یشاء"
وہیض من یشاء کے مقام عالی پر کیوں فائز کر دیا، اور اپنی کتابوں میں بار بار ان شاء قتله وان شاء
حبسہ لکھ کر عدالت کے اس مسئلے کو "عمیثیت" کا مسئلہ کس طرح بنا دیا؟

ایک ضروری گزارش

ہم نے حضرت حجر بن عدیؓ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ان
کی سرگرمیاں نفس الامری میں بغاوت کے تحت آتی تھیں، ان لئے حضرت معاویہؓ نے ان کے
ساتھ جو معاملہ کیا، اس میں وہ معذور تھے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حضرت حجر
بن عدیؓ اس بغاوت کی بناء پر فسق کے مرتکب ہوئے، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ بغاوت کرنے
والا اگر صاحب بدعت نہ ہو اور نیک نیتی کے ساتھ معتد بہ دلیل و تاویل کی بنیاد پر اسلامی

حکومت کے خلاف خروج کرے تو اگرچہ اس پر احکام تو اہل بھی ہی کے جاری ہوں گے، لیکن اس بناء پر اسے فاسق بھی نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے خلاف لڑائی کی، اس میں جمہور اہلسنت کے نزدیک حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، اسی لئے حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ اہل بھی کا سا معاملہ کر کے انکے خلاف جنگ کی، اس جنگ میں حضرت معاویہؓ کے بست سے رفقاء شہید بھی ہوئے اور ظاہر ہے کہ ان کی شہادت میں حضرت علیؓ کا چنداں قصور بھی نہیں تھا کیونکہ وہ امام برحق تھے، لیکن اس بناء پر حضرت معاویہؓ کو مرتکب فسق قرار نہیں دیا گیا، بلکہ انہیں مجتہد مغلطیٰ کہا گیا، علامہ موفق الدین بن قدامہؒ اسی بات کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

والبيعة لئلا لم يكنوا من اهل البدع ليسوا بفاسقين وانما هم
يخطون في تاويلهم والامام واهل العدل مصيبون في قتالهم
فهم جميعا كالمجتهدين من الفقهاء في الاحكام من شهد
منهم قبلت شهادته اذ كان عدلا وهذا قول الشافعي ولا اعلم في
قبول شهادتهم خلافا له

”اور باقی لوگ اگر اہل بدعت میں سے نہ ہوں تو وہ فاسق نہیں ہیں، بلکہ انکی تاویل غلط ہے، اور امام اور اہل عدل بھی ان سے جنگ کرنے میں برحق ہیں، انکی مثال ایسی ہی ہے جیسے احکام شرعیہ میں مجتہد فقہاء (کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو بر غلط سمجھتا ہے، لیکن مرتکب فسق کوئی نہیں ہوتا) لہذا ان میں سے جو شخص گواہی دے اسکی گواہی مقبول ہے، جیسے عدل ہو، یہ امام شافعیؒ کا قول ہے اور اسکی شہادت کو قبول کرنے میں علماء کے کسی اختلاف کا مجھے علم نہیں ہے۔“

حضرت حجر بن عدیؓ چونکہ ایک عابد و زاہد انسان تھے، اور ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف جو کچھ کیا، اس کا منشاء طلب اقتدار تھا، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ انہوں نے خروج کا ارتکاب کسی تاویل کے ساتھ ہی کیا ہوگا، اس لئے ان کا ذکر بھی اوسب و احترام کے ساتھ ہونا چاہئے، اور شاید یہی وجہ ہے

کہ بعض علماء مثلاً شمس الامتہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی موت کے لئے شہادت کا لفظ استعمال کیا، اور چونکہ وہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپکو اہل عدل میں سے سمجھتے تھے، اس لئے جہاں شمس الامتہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض شہدائے اہل عدل کی وصیتیں نقل کی ہیں، ان میں حضرت حجر بن عدیؓ کی وصیت بھی نقل فرمادی ہے کہ مجھے غسل نہ دیا جائے، کیونکہ شمس الامتہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کا اصل مقصد اس جگہ یہ بتانا ہے کہ اہل بغی کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے جو اہل عدل شہید ہو جائیں انہیں غسل نہیں دیا جائے گا، اس کی دلیل میں انہوں نے جہاں حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت زید بن صوحانؓ کی وصیت نقل کی ہے، وہیں حضرت حجر بن عدیؓ کی وصیت بھی نقل کر دی ہے جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ چونکہ اپنے آپکو اہل عدل میں سے سمجھتے تھے اور انہوں نے یہ وصیت کی کہ مجھے غسل نہ دیا جائے، اس لئے معلوم ہوا کہ شہدائے اہل عدل کو ان کے نزدیک غسل کے بغیر دفن کرنا چاہئے۔ اس سے ملک صاحب کا یہ استنباط درست نہیں ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ نفس الامر میں بھی اہل عدل میں سے تھے اور انہیں قتل کرنا جائز نہیں تھا، کیونکہ اگر انہیں واقعاً اہل عدل میں سے مانا جائے تو پھر لازماً کہنا پڑے گا کہ ان کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ اہل بغی میں سے تھے، اب کیا ملک صاحب یہ بھی فرمائیں گے کہ خلیفہ برحق حجر بن عدیؓ تھے اور حضرت معاویہؓ ان کے مقابلے میں باغی تھے، جبکہ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت حسنؓ سے مصالحت کے بعد ان کی خلافت بلاشبہ منعقد ہو چکی تھی، اور غالباً مولانا مودودی صاحب کو بھی اس سے انکار نہیں ہوگا۔

میں نے حجر بن عدیؓ کے واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے شروع میں لکھا تھا کہ: "اس واقعے میں بھی مولانا مودودی صاحب نے اول تو چند باتیں ایسی کہی ہیں جن کا ثبوت کسی بھی تاریخ میں یہاں تک کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں بھی نہیں ہے۔" ان چند باتوں میں سے ایک بات تو حضرت عائشہؓ کا قول تھا جو مجھے پہلے کسی کتاب میں نہیں ملا تھا، بعد میں مل گیا تو جمادی الثانیہ ۸۹ھ کے ابلاغ میں میں نے معذرت کا اعلان کر دیا تھا۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ آپ نے "چند باتیں" بے بیخبر جمع لکھا ہے، اگر مولانا مودودی کی کوئی اور بات ابھی تک

کتابوں میں نہ ملی ہو تو اس کی نشاندہی کی جائے ورنہ غیر ذمہ دارانہ باتوں سے پرہیز کیا جائے۔

اس کے جواب میں ملک صاحب سے گزارش ہے کہ براہ کرم ربیع الثانی ۳۸۹ھ کے ابلاغ میں صفحہ ۱۹ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں جس میں میں نے بتایا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے زیاد کے بارے میں لکھا ہے کہ : ”وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا“ لیکن جتنے حوالے انہوں نے دیئے ہیں، ان میں کہیں بھی زیاد کا حضرت علیؓ کو گالیاں دینا مذکور نہیں، بلکہ قاتلین عثمانؓ پر لعنت کرنا مذکور ہے۔ طبریؒ ابن اثیرؒ البدایہ اور ابن خلدونؒ سب کی عبارتیں میں نے ابلاغ کے مذکورہ صفحے پر لکھی دی ہیں۔ کیا ملک صاحب نے ان کا مطالعہ نہیں فرمایا؟

یزید کی ولی عہدی

یزید کی ولی عہدی کے مسئلے میں ملک غلام علی صاحب نے میرے مضمون پر جو تبصرہ فرمایا ہے اسے بار بار ٹھنڈے دل سے پڑھنے کے بعد میں اس کے بارے میں تاویل در تاویل کے بعد ہلکی سے ہلکی بات یہ کہہ سکتا ہوں کہ غالباً ملک صاحب نے میرے مضمون کو بنظر قائل پڑھنے سے قبل ہی اس پر تبصرہ لکھنا شروع کر دیا ہے اور میرے موقف کو صحیح سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ موصوف کی اس بحث میں جگہ جگہ یہ نظر آتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے ایک موقف تصنیف فرما کر مجھ سے منسوب کرتے ہیں، اور پھر اس کی تردید میں صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اس تبصرے میں کہیں نزاع لفظی باقی رہ گیا ہے، کہیں تضاد بیانی پیدا ہو گئی ہے، اور کہیں بالکل غیر متعلق بحثیں چھیڑ گئی ہیں۔

اگر میری مصروفیات میں ”بحث براۓ بحث“ کا کوئی خانہ ہوتا تو میں موصوف کے مضمون کے ایک ایک جز پر تبصرہ کر کے بتاتا کہ انہوں نے میرے موقف کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کن کن تضاد بیانیوں اور لفظی مضامینوں کا ارتکاب کیا ہے، اور بات کہاں سے کہاں پہنچا دی ہے، لیکن جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں، میرے پیش نظر مناظرہ بازی نہیں، صرف اہل سنت کے موقف کا مدلل اظہار اور اس پر جو علمی نوعیت کے اشکالات ہو سکتے ہیں، ان کا دفعہ ہے، اس لئے اس مسئلے میں میرا کام بہت مختصر رہ گیا ہے، البتہ جن

حضرات کو ملک صاحب کے فن مناظرہ سے زیادہ دلچسپی ہو، ان سے میری درخواست ہے کہ وہ ایک مرتبہ میرے اور ان کے مضمون کو آمنے سامنے رکھ کر ضرور مطالعہ فرمائیں انشاء اللہ بڑی بصیرت و عبرت حاصل ہوگی۔

میں نے یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں اہل سنت کے جس موقف کا اظہار کیا تھا، وہ یہ تھا کہ یزید کو جانشین نامزد کرنا حضرت معاویہؓ کی رائے کی غلطی تھی جو دیانت داری اور نیک نیتی ہی کے ساتھ سرزد ہوئی، لیکن اس کے نتائج امت کے لئے اچھے نہ ہوئے، میں نے بحث کے شروع ہی میں واضح کر دیا تھا کہ اس مسئلے میں مولانا مودودی صاحب سے ہمارا اختلاف یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ صرف رائے کی دیانت دارانہ غلطی نہیں تھی بلکہ اس کا محرک حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا ذاتی مفاد تھا، اس مفاد کو پیش نظر رکھ کر ”دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ امت محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔“ اور ہمارے نزدیک یہ محض رائے کی غلطی تھی، حضرت معاویہؓ نے یزید کو صرف اس لئے ولی عہد نامزد نہیں کیا کہ وہ ان کا بیٹا تھا، بلکہ وہ نیک نیتی کے ساتھ اسے خلافت کا اہل سمجھتے تھے، گویا ہمارے نزدیک انکے فیصلہ کی اصل بنیاد یہ تھی کہ ان کے نزدیک وہ خلافت کا اہل بھی تھا اور امت اس پر جمع بھی ہو سکتی تھی، اور مولانا مودودی کے نزدیک ان کے فیصلے کی بناء صرف یہ تھی کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔

میرا یہ موقف میرے مضمون سے بالکل واضح ہے اور اسی کے مفصل دلائل میں نے پیش کئے تھے اور آخر میں لکھا تھا:

”جیسا کہ ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں، مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور معاویہؓ کی رائے واقعہ کے لحاظ سے سو فیصد درست تھی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ نفس الامر میں ٹھیک کیا، بلکہ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی رائے کسی ذاتی مفاد پر نہیں بلکہ دیانت داری پر مبنی تھی، اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ امانت کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا، ورنہ جہاں تک رائے کا تعلق ہے، جمہور امت کا کہنا یہ ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی حضرات صحابہ کی صحیح تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے جسکی مندرجہ ذیل وجوہ

ہیں:

(۱) حضرت معاویہؓ نے تو بیٹک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا، لیکن ان کا یہ عمل ایک ایسی نظیر بن گیا جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ناجائز فائدہ اٹھایا، انہوں نے اسکی آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظام شورعی کو درہم برہم کر ڈالا، اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خانوادے میں تبدیل ہو کر رہ گئی الخ۔

لیکن ملک غلام علی صاحب یزید کی ولی عہدی کی بحث کے بالکل شروع میں میرا کیا موقف بیان فرماتے ہیں؟ ملاحظہ فرمائیے :

”اب یزید کی ولی عہدی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفہ وقت اگر اپنے بیٹے یا دوسرے رشتہ دار میں نیک نیتی کے ساتھ شرائط خلافت پاتا ہے تو اسے ولی عہد بنا سکتا ہے اور خلیفہ کی نیت پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ خلافت علی منہاج النبوة اور خاندانی بادشاہت دونوں اسلام میں یکساں طور پر جائز و مباح ہیں اور مسلمان ان دونوں میں سے جس طرز حکومت کو چاہیں اپنا سکتے ہیں“

(ترجمان القرآن جنوری ۱۹۷۷ء ص ۳۳)

میرے اور ملک صاحب کے اس اقتباس کا ایک ایک جملہ ملاحظہ کیجئے، ہمارے فاضل تبصرہ نگار کی سخن فہمی، امانت و دیانت اور نقل و بیان کی خوبصورتی ملاحظہ فرمائیے، اور اس کے بعد بتائیے کہ جو بحث اس سخن فہمی کی بنیاد پر ایسی علمی دلاوری کے ساتھ شروع کی گئی ہو، اس کا کیا جواب دیا جائے.....؟

میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ میری بحث کا منشاء حضرت معاویہؓ کے اس فعل کی تصویب و تائید نہیں ہے، بلکہ یہ بتانا ہے کہ ان کا یہ فیصلہ نیک نیتی پر مبنی تھا، اس لئے کہ وہ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے، اس کے لئے منہجہ اور دلائل کے ایک دلیل میں نے یہ بھی پیش کی تھی کہ حضرت معاویہؓ نے یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ اگر یزید اس منصب کا اہل ہے تو اس کی

ولایت کو پورا فرمادے، ورنہ اس کی روح قبض کر لے، اس پر گفتگو کرتے ہوئے ملک غلام علی صاحب نے یہ بات تسلیم فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں:

”ان دعائیہ کلمات سے بھی یزید کی فضیلت و اہلیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ اسے ایسا سمجھتے تھے، لیکن یہ رائے جیسا کہ عرض کیا جا چکا، غلطی اور مبالغے کے احتمال سے خالی نہیں ہو سکتی۔“

(ترجمان مارچ ۱۹۷۰ء ص ۲۵)

میری گزارش یہ ہے کہ جو چیز اس دعا سے بقول آپ کے ثابت نہیں ہوتی، اسے میں نے ثابت کرنا ہی کب چاہا ہے؟ میرا مدعا بھی اس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ ”حضرت معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ اسے ایسا سمجھتے تھے۔“ جہاں تک اس رائے میں ”غلطی اور مبالغے کے احتمال“ کا تعلق ہے، میں نے بھی اس کی تردید نہیں کی، جب ملک صاحب نے حضرت معاویہؓ کو نیک نیت مان لیا تو میرا مقصد حاصل ہو گیا؛ اب نہ جانے غلام علی صاحب میری کس بات کی تردید فرما رہے ہیں؟ جب یہ بات میرے اور ملک غلام علی صاحب کے درمیان متفق علیہ ہو گئی کہ حضرت معاویہؓ نے یہ فیصلہ نیک نیتی کے ساتھ کیا تھا تو پھر خودی فیصلہ کر لیجئے کہ مولانا مودودی صاحب کا مندرجہ ذیل جملہ اس ”نیک نیتی“ میں کس طرح فٹ بیٹھ سکتا ہے کہ:

”یزید کی دلی عمدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہ بن شعبہؓ) نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے دوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح امت محمدیہؐ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں“

لیکن یہ عجیب و غریب بات ہے کہ جناب غلام علی صاحب ایک طرف تو تسلیم فرماتے ہیں کہ ”امیر معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ اسے ایسا سمجھتے تھے“ اور دوسری طرف مولانا مودودی صاحب کی اس عبارت میں کوئی غلطی تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں، مولانا مودودی صاحب کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے جو علمی نکات بیان فرمائے ہیں وہ

نہایت دلچسپ ہیں، فرماتے ہیں کہ: مولانا مورودی صاحب نے نیت کا لفظ استعمال نہیں کیا جذبے کا لفظ استعمال کیا ہے اور ”صحیح جذبے کی بنیاد پر نہ ہونا اور کام کرنے والے کا نیک نیت نہ ہونا اور اس کی نیت کا قسم ہونا دونوں صورتیں یکساں نہیں ہیں۔“ کم از کم میری عقل تو اس فرق کو محسوس کرنے سے بالکل عاجز ہے جو ملک صاحب ”نیت“ اور ”جذبہ“ میں بیان فرمانا چاہتے ہیں۔ ملک صاحب سے میری پر خلوص گزارش یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس لفظی تاویل میں پڑنے کے بجائے مولانا کو مشورہ دیں کہ وہ مذکورہ عبارت واپس لے لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو نیک نیتی پر محمول کرنے کے بعد ملک غلام علی صاحب نے مولانا مورودی صاحب کے اس قول کی خود بخود تردید کر دی، جس میں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے فعل کو ذاتی مفاد پر مبنی قرار دیا ہے، اس کے بعد ان کی ساری بحث شدید قسم کے نزاع لفظی کے سوا کچھ نہیں، اور میں اس لفظی ہیر پھیر میں الجھ کر بلاوجہ اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا۔

عدالتِ صحابہؓ

میں نے اپنے مقالہ کے آخر میں تین اصولی مباحث پر گفتگو کی تھی۔ عدالت صحابہؓ تاریخی روایات کی حیثیت اور حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت کا صحیح مقام، ان میں سے آخری دو موضوعات کو تو ملک غلام علی صاحب نے تیرہ نقطوں لکھنے کے بعد ”اختصار“ کے پیش نظر چھوڑ دیا ہے، البتہ عدالت صحابہؓ کے مسئلہ پر طویل بحث کی ہے۔

جناب ملک صاحب کے انداز بحث میں سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ وہ میرے مضمون کے اصل نقطے پر گفتگو کرنے کے بجائے ادھر ادھر کی غیر حلق یا غیر بنیادی باتوں پر اپنا سارا زور صرف کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ انکے مضمون میں صفحات کے صفحات پڑھنے کے بعد بھی بنیادی باتیں جوں کی توں تشنہ رہ جاتی ہیں، اور ان کے بارے میں آخر تک یہ نہیں کھلتا کہ ان کا موقف کیا ہے؟ اور اگر وہ میری کسی بات پر تبصرہ کرتے ہیں تو اسے سیاق و سباق سے کاٹ کر من مانا مفہوم پہناتے ہیں اور اسکی مفصل تردید شروع کر دیتے ہیں۔

اسی عدالت صحابہؓ کے مسئلہ میں میں نے بحث کو سمیٹنے کے لئے ایک ”نتیجہ قائم کرتے ہوئے“ یہ عرض کیا تھا کہ صحابہؓ کی عدالت کے عقلاً تین مفہوم ہو سکتے ہیں، مولانا مورودی

صاحب نے عدالت کی جو تشریح کی ہے، اس سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ وہ کون سے مفہوم کو درست سمجھتے ہیں، لہذا انہیں اور ان کا دفاع کرنے والے حضرات کو چاہیے کہ وہ صاف طریقے سے یہ واضح کریں کہ عدالت کی ان تشریحات میں سے کونسی تشریح ان کے نزدیک درست ہے؟ اور اگر وہ ان تینوں کو درست نہیں سمجھتے تو دلائل کے ساتھ انکی تردید کر کے ان تینوں کے علاوہ کوئی چوتھی تشریح پیش کریں۔

جناب غلام علی صاحب نے عدالت صحابہؓ کے مسئلے پر پینتالیس صفحے لکھے ہیں، اور ان میں بعض بالکل غیر متعلق باتوں پر کئی کئی ورق خرچ کئے ہیں، مگر آخر تک میرے اس سوال کا واضح جواب نہیں دیا کہ عدالت کے ان تین معانی میں سے کونسا مفہوم ان کے نزدیک درست ہے۔ عدالت صحابہؓ کے میں نے تین مفہوم بیان کئے تھے۔

(۱) صحابہ کرامؓ معصوم اور غلطیوں سے پاک ہیں۔

(۲) صحابہ کرامؓ اپنی عملی زندگی میں (معاذ اللہ) فاسق ہو سکتے ہیں، لیکن روایت حدیث کے معاملہ میں وہ بالکل عادل ہیں۔

(۳) صحابہ کرامؓ نہ تو معصوم تھے اور نہ فاسق، یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی سے بعض مرتبہ بتقاضائے بشریت ”دو ایک یا چند“ غلطیاں سرزد ہو گئی ہوں، لیکن تنبیہ کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور اللہ نے انہیں معاف فرمادیا۔ اس لئے وہ ان غلطیوں کی بنا پر فاسق نہیں ہوئے، چنانچہ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی صحابیؓ نے گناہوں کو اپنی ”پالیسی“ بنا لیا ہو جس کی وجہ سے اسے فاسق قرار دیا جاسکے۔

میں نے لکھا تھا کہ ”اصل سوال یہ ہے کہ مولانا مورودی صاحب ان میں سے کون سا مفہوم درست سمجھتے ہیں؟“ پہلا تو ظاہر ہے، کسی کا مسلک نہیں، اب آخری دو مفہوم رہ جاتے ہیں، مولانا نے یہ بات صاف نہیں کی کہ انکی مراد کونسا مفہوم ہے، اس کے بعد میں نے

لے مولانا مورودی نے عدالت کی تشریح یہ کی ہے: ”میں اصحابہ کلمہ عدول کا مطلب یہ نہیں لیتا کہ تمام صحابہؓ بے خطا تھے، اور ان میں کا ہر ایک فرد ہر قسم کی بشری کمزوریوں سے پاک تھا اور ان میں سے کسی نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی ہے، بلکہ میں اس کا مطلب یہ لیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے یا آپ کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں کسی صحابی نے کبھی راستی سے ہرگز تجاوز نہیں کیا ہے“

لکھا تھا کہ:

”اگر انکی مراد دوسرا مضموم ہے یعنی یہ کہ صحابہ کرامؓ صرف روایت حدیث کی حد تک عادل ہیں، ورنہ اپنی عملی زندگی میں وہ (معاذ اللہ) فاسق و فاجر بھی ہو سکتے ہیں تو یہ بات ناقابل حد تک خطرناک ہے..... اور اگر مولانا مودودی صاحب عدالت صحابہؓ کو تیسرے مضموم میں درست سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان کی اوپر نقل کی ہوئی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے، سو یہ مضموم جمہور اہل سنت کے نزدیک درست ہے، لیکن حضرت معاویہؓ پر انہوں نے جو اعتراضات کئے ہیں، اگر انکو درست مان لیا جائے تو عدالت کا یہ مضموم ان پر صادق نہیں آسکتا۔“ (ابلاغ۔ رجب ۸۹ھ ص ۱۱)

میری اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ میں نے عدالت کا کوئی مضموم مولانا مودودی صاحب کی طرف متعین طور سے منسوب نہیں کیا، لیکن ملک غلام علی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”مدیر ابلاغ کا کارنامہ ملاحظہ ہو کہ توجیہ القول بمالایرضی قائلہ سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر مولانا مودودی کا یہ مضموم ہے کہ صحابہ کرام صرف روایت حدیث کی حد تک عادل ہیں، ورنہ اپنی عملی زندگی میں وہ (معاذ اللہ) فاسق و فاجر بھی ہو سکتے ہیں تو یہ بات ناقابل بیان حد تک غلط اور خطرناک ہے..... غضب یہ ہے کہ مولانا عثمانی صاحب جامع الفاسد علی الفاسد کے اصول پر پہلے تو مولانا مودودی کے منہ میں زبردستی یہ الفاظ ٹھونکتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اپنی عملی زندگی میں فاسق و فاجر ہو سکتے ہیں اور پھر اس فاسد اور فرضی بنیاد پر دوسرا ردایہ جھاتے ہیں کہ الخ“

میری اوپر کی عبارت پڑھئے، پھر اس پر ملک صاحب کا تبصرہ، بالخصوص خط کشیدہ جملہ دیکھئے، اور ہمارے فاضل تبصرہ نگار کے عدل و انصاف، علمی دیانت اور فن مناظرہ کی داد دیجئے، میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب نے یہ بات صاف نہیں کی کہ وہ عدالت کے کون سے مضموم کو درست سمجھتے ہیں؟ وہ متعین کر کے بتائیں کہ ان میں سے کونسی تشریح ان کے نزدیک صحیح ہے؟ پھر ہر تشریح سے پیدا ہونے والے مسائل کا الگ الگ ذکر

کرتے ہوئے یہ بھی لکھ رہا ہوں کہ مولانا موودوی کی ایک عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیسرے مفسوم کی طرف مائل ہیں، مگر ملک صاحب آگے پیچھے کی تمام باتوں کو چھوڑ کر صرف بیچ کا ایک جملہ نقل کر کے اپنے قارئین کو یہ باور کراتے ہیں کہ عدالت کا دوسرا مفسوم میں نے ”زبردستی مولانا موودوی صاحب کے منہ میں ٹھونس دیا ہے“ خدا جانے ملک صاحب کے نزدیک ما بلفظ من قول اللدیہ رقیب عنید کا کوئی مطلب ہے یا نہیں؟

اس طرز عمل کا آخرت میں وہ کیا جواب دیں گے؟ یہ تو وہ خود ہی بہتر جانتے ہوں گے، بہر حال، اس سے اتنا معلوم ضرور ہوا کہ عدالت کے دوسرے مفسوم کو وہ درست نہیں سمجھتے۔

اب صرف تیسرا مفسوم باقی رہ گیا، میں نے اپنے طور پر اسی مفسوم کو صحیح اور جمہور اہل سنت کا مسلک قرار دیا تھا، ملک غلام علی صاحب پہلے تو اس کو ”سراسر غلط اور بے دلیل موقف“ قرار دیتے ہیں (ترجمان اپریل ۷۰ء ص ۴۳) لیکن ایک مہینے کے بعد آگے چل کر لکھتے ہیں کہ: ”تاہم مولانا موودوی کی کوئی تحریر عدالت کی اس تعریف سے بھی متصادم نہیں ہے“ (ترجمان، مئی ۷۰ء ص ۴۳)۔ یہاں پہلا سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ تعریف ”سراسر غلط اور بے دلیل“ ہے تو مولانا موودوی کی کوئی تحریر اس سے متصادم کیوں نہیں؟ مولانا نے عدالت کی جو تعریف کی ہے، اس کے بارے میں جناب غلام علی صاحب نے لکھا ہے: ”عدالت صحابہؓ کی اس سے بہتر اور محکم تر تعریف اور نہیں ہو سکتی“ (ترجمان، اپریل، ص ۳۷) اب یہ عجیب و غریب ”بہتر اور محکم تر تعریف“ جو ایک ”سراسر غلط اور بے دلیل موقف“ کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے، اور اس سے متصادم نہیں ہوتی؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ تیسرا مفسوم بھی آپ کے نزدیک سراسر غلط اور بے دلیل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے عدالت کی جو تین تشریحات پیش کی تھیں وہ تینوں آپ کے نزدیک غلط ہو گئیں اب آپکا فرض تھا کہ کوئی چوتھی تشریح خود پیش کر کے حضرت معاویہؓ کو اس پر منطبق فرماتے لیکن پورے مضمون میں آپ نے ان کے علاوہ کوئی اور مفسوم بھی پیش نہیں کیا۔ ملک صاحب شاید اس کے جواب میں یہ فرمائیں کہ مولانا موودوی صاحب کے الفاظ میں عدالت کی جو تشریح انہوں نے نقل کی ہے، وہی چوتھی تشریح ہے، لیکن میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ وہ تشریح مجمل ہے، اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ روایت حدیث میں

تمام صحابہؓ عادل اور راست باز تھے، لیکن عام عملی زندگی میں بھی وہ عادل تھے یا نہیں؟ یہ بات صاف نہیں ہے، اسی بات کو صاف کرنے کے لئے میں نے یہ تین تفصیلات قائم کی تھیں، جن کا حاصل یہ تھا کہ عام عملی زندگی کے اعتبار سے کسی صحابی کو فاسق کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے اس احتمال کو بھی رد کر دیا کہ انہیں فاسق کہا جاسکتا ہے، اور اس احتمال کو بھی کہ انہیں فاسق نہیں کہا جاسکتا، اس ”ارتقاء نقیضین“ کا ارتکاب کرنے کے بعد خدا را یہ تو بتائیے کہ آپ کا موقف ہے کیا؟

میں نے اپنے سابقہ مقالہ میں عرض کیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کی ایک عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ عام عملی زندگی میں بھی کسی صحابی کو فاسق قرار دینا درست نہیں سمجھتے، بلکہ میری بیان کردہ تیسری تشریح کے مطابق یہ کہتے ہیں کہ ”کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر گزرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسکی عدالت کی کلی نفی ہو جائے اور وہ عادل کے بجائے فاسق قرار پائے“ اس بات کو درست مانتے ہوئے میں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ مولانا مودودی نے جو الزامات حضرت معاویہؓ پر عائد کئے ہیں، انہیں ”ایک دو یا چند معاملات“ سے تعبیر کرنا درست نہیں، اگر مولانا مودودی کے عائد کئے ہوئے تمام الزامات درست مان لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے رشوت، جھوٹ، مکرو فریب، قتل ناحق، اجراء بدعت، مال غنیمت میں خیانت، جھوٹی گواہی، جھوٹا نسب بیان کرنا اور اعانت ظلم جیسے کبیرہ گناہوں کا صرف ارتکاب ہی نہیں کیا، بلکہ ان کو باقاعدہ ”پالیسی“ بنا لیا تھا، اس لئے اسے ”ایک دو یا چند گناہ کر گزرنے“ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، آج اگر کوئی شخص ان تمام گناہوں کو اپنی ”پالیسی“ بنا لے تو خواہ وہ ساری رات تہجد پڑھنے میں گزارتا ہو، اسے فاسق ضرور کہا جائے گا، لہذا یا تو یہ کہیںے کہ (معاذ اللہ) حضرت معاویہؓ بھی فاسق تھے، یا پھر یہ ماننے کہ جو الزامات ان پر مولانا مودودی صاحب نے عائد کئے ہیں، وہ درست نہیں ہیں۔

میرے اس اعتراض کے جواب میں ملک غلام علی صاحب نے حسب عادت غلط بحث کا ارتکاب کرتے ہوئے پہلے ان تمام الزامات کو از سر نو برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور پھر آخر میں لکھا ہے:

”میں عزیزم محمد تقی صاحب عثمانی سے کہتا ہوں کہ آپ کے پاس جو

”خلافت و طوکت“ کا نسخہ ہے، آپ چاہیں تو اس میں ”ایک دو یا چند“ کے بجائے گیارہ یا اس سے اوپر کا کوئی عدد درج کر لیں، فقرہ اپنی جگہ پھر بھی صحیح اور بے غبار رہے گا۔“

میرے ”بزرگوار محترم“ مطمئن ہیں کہ اپنے اس ”مشفقانہ“ مشورے کے بعد انہوں نے میرے اعتراض کا جواب دیدیا ہے، چنانچہ آگے وہ دوسری غیر متعلق بات شروع کر دیتے ہیں، اب اگر کوئی ”بے ادب“ یہ سوال کرنے لگے کہ رشوت جھوٹ، مکرو فریب، صلحاء کے قتل، اجراء بدعت، مال غنیمت میں خرد برد، جھوٹی گواہی، جھوٹی نسبت اور اس جیسے بہت سے گناہوں کو ”پالیسی“ بنا لینے والا فاسق کیوں نہیں ہوتا؟ تو یہ اس کی صریح نالائقی اور قرب قیامت کی علامت ہے کہ وہ بزرگوں کی بات کیوں بے چون و چرا نہیں مانتا؟

حضرت معاویہؓ اور فتنہ و بغاوت

ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں:

”مولانا مودودی نے تو فتنہ یا فاسق کے الفاظ امیر معاویہؓ کے حق میں استعمال نہیں کئے لیکن آپ چاہیں تو میں اہل سنت کے چوٹی کے علماء کی نشان دہی کر سکتا ہوں جنہوں نے یہ الفاظ بھی کہے ہیں۔“

اس کے بعد انہوں نے اہل سنت کے دو عالموں کی عبارتیں پیش کی ہیں، ایک حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی ہے، اور دوسری میر سید شریف جرجانیؒ کی ضروری ہے کہ اس غلط فہمی کو بھی رفع کیا جائے جو ان عبارتوں کے نقل کرنے سے پیدا کی گئی ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی عبارت یہ ہے جس میں وہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں جنگ صفین وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”ہیں نہایت کارش امین است کہ مرکب کبیرہ و باغی باشد و الفاسق لیس باہل اللعن“

(فتاویٰ عزیزی۔ رحیمہ دیوبند ص ۷۷)

اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں شاہ صاحبؒ اصل میں اس مسئلہ پر گفتگو فرما رہے ہیں کہ حضرت معاویہؓ پر لعن طعن جائز نہیں، اس ذیل میں وہ کہتے ہیں کہ ”ان کے

بارے میں انتہائی بات یہ ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ اور باغی ہوں، اور فاسق لعنت کے لائق نہیں ہوتا۔ اس میں وہ اپنا مسلک بیان نہیں کر رہے کہ معاذ اللہ وہ واقعہ باغی اور فاسق تھے، بلکہ علی سبیل التسلیم یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر انہیں فاسق بھی مان لیا جائے تب بھی ان پر لعن طعن جائز نہیں۔ دوسرے واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں اس مسئلہ سے متعلق اپنی جو آراء ظاہر کی ہیں وہ بڑی حد تک پیچیدہ، مجمل اور بظاہر نظر متضاد معلوم ہوتی ہیں، اور جب تک اس مسئلے میں ان کی مختلف عبارات سانس نہ ہوں اس وقت تک ان کی مراد کو ٹھیک ٹھیک سمجھا نہیں جاسکتا، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے صحیح خشاء کو سمجھنے کے لئے تحفہ اثنا عشریہ کی مندرجہ ذیل عبارت بڑی حد تک مفید ہوگی:

”اب حضرت مرتضیٰ سے لڑنے والا اگر ازراہ بغض و عداوت لڑتا ہے تو یہ علمائے اہل سنت کے نزدیک بھی کافر ہے، اس پر سب کا اجماع ہے۔۔۔ اور شبہ فاسدہ اور تاویل باطل کی بناء پر، نہ نیت عداوت و بغض سے، حضرت سے لڑنے والا مثلاً اصحاب مجمل اور اصحاب سفین تو یہ خطائے اجتہادی اور بطلان اعتقادی میں مشترک ہیں، فرق اتنا ہے کہ اصحاب مجمل کی یہ خطائے اجتہادی اور فسق اعتقادی تحقیر کو جائز نہیں کرتا (اسکی وجہ بیان کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں) مثلاً حضرت موسیٰؑ کی عصمت و علو مرتبہ پر جو نصوص قرآنیہ تطبیحہ وارد ہیں وہ اس عمل پر آپ پر طعن کرنے یا آپکی تحقیر کرنے سے مانع ہوئیں جو آپ کے بھائی کے بارے میں آپ سے سرزد ہوا، صرف بے تاملی اور عجلت کی بناء پر، ورنہ یہ سب کچھ لہ فی اللہ تھا، نہ شیطان کے وسوسہ سے، حاشا جنابہ من ذلک۔“

اور اصحاب سفین کے بارے میں چونکہ یہ امور با تفتح ثابت نہیں ہیں اس لئے توقف و سکوت لازمی ہے، ان آیات و احادیث کے عموم پر نظر رکھتے ہوئے جو فضائل صحابہ میں وارد ہیں، بلکہ تمام مؤمنین کے فضائل میں ان کی نجات اور انکی شفاعت کی امید پروردگار سے رکھنے کا حکم ظاہر کرتی ہیں، اگر جماعت اہل شام میں سے ہم با یقین کسی کے متعلق جان لیں کہ وہ حضرت امیر (علیؑ) کے ساتھ عداوت و بغض رکھتا تھا،

تا آنکہ آپکو کافر ٹھہراتا، یا آنجناب علیؓ پر سب و وطن کرتا تو اس کو ہم یقیناً کافر جانیں گے۔ جب یہ بات معتبر روایات سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی اور ان کا اصل ایمان بالیقین ثابت ہے تو ہم تمک اصل ایمان سے کریں گے۔

اس عبارت میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اصحاب جمل و اصحاب مفسن کے بارے میں بیک وقت ”خطائے اجتہادی“ کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے اور ”فسق اعتقادی“ کا بھی بظاہر نظر اس میں تضاد معلوم ہوتا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ عبارت اور اس نوع کی بعض دوسری عبارتیں بنظر غائر پڑھنے کے بعد میں ان کا موقف یہ سمجھا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت چونکہ نہایت مضبوط دلائل سے منعقد ہو چکی تھی اس لئے حضرت عائشہؓ یا حضرت معاویہؓ کا ان کے خلاف قتال کرنا بلاشبہ غلط تھا، اور دینی احکام کے اعتبار سے بغاوت کے ذیل میں آتا تھا جو نفس الامر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ یعنی فسق ہے، اسی لئے حضرت علیؓ کا ان سے جنگ لڑنا جائز اور برحق تھا، لیکن چونکہ حضرت عائشہؓ ہوں یا حضرت معاویہؓ دونوں سے یہ عمل حضرت علیؓ کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں، بلکہ شبہ اور تاویل کی بناء پر صادر ہوا تھا، اور بہر حال وہ ہمیں اپنے پاس دلائل رکھتے تھے جو غلط فہمی پر مبنی تھی، لیکن دیانت دارانہ تھے، اس لئے اخروی احکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل اجتہادی غلطی کے ذیل میں آتا ہے، اسی لئے ان پر طعن کرنا جائز نہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ذبیحہ پر جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ کر اسے مار دینا اور پھر اسے کھانا دلائل قطعیہ کی بناء پر گناہ کبیرہ ہے، لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اجتہاد سے اسے جائز سمجھا، اس لئے اگر کوئی شافعی المسلک انسان اسے کھالے تو اس کا یہ عمل دلائل شرعیہ کی رو سے گناہ کبیرہ اور فسق ہے لیکن چونکہ وہ دیانت دارانہ اجتہاد کی بنیاد پر صادر ہوا، اس لئے اس شخص کو فاسق نہیں کہا جائے گا، اسی طرح کسی امام برحق کے

۱۔ تحفہ انا عشریہ ص ۳۳ مطبوعہ ولی محمد ایڈنرز کراچی: اس عبارت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ پر سب و وطن کرنا معتبر روایات سے ثابت نہیں۔

خلاف بغاوت کرنا گناہ کبیرہ اور فسق ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے حضرت حجر بن عدیؓ کے مسئلے میں علامہ ابن قدامہؒ کے حوالہ سے لکھا ہے، اگر کوئی شخص جو اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے اپنے ویانندارانہ اجتہاد کی رو سے اسے جائز سمجھتا ہو، تو اس کی بنا پر وہ فاسق نہیں ہوتا، بلکہ اسکی غلطی کو خطائے اجتہادی کہا جاتا ہے۔

میں نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تحریروں پر ہتھنا غور کیا ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کے خروج کے لئے جو فسق اعتقادی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ بغاوت فی نفسہ فسق ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اس کی بناء پر (معاذ اللہ) یہ حضرات فاسق ہو گئے، بلکہ چونکہ ان کی جانب سے اس فعل کا صدور نیک نیتی کے ساتھ اجتہاد کی بنیاد پر ہوا، اور یہ حضرات اجتہاد کے اہل بھی تھے، اور اپنے موقف کی ایک بنیاد رکھتے تھے، اس لئے یہ انکی اجتہادی غلطی تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ کا منشاء یہ ہوتا کہ وہ واقعہ حضرت معاویہؓ یا حضرت عائشہؓ کو (معاذ اللہ) اس خروج کی بنا پر فاسق قرار دیں، جیسا کہ ملک غلام صاحب نے سمجھا ہے تو پھر وہ اپنی مذکورہ عبارت میں اسے ”خطائے اجتہادی“ سے کیوں تعبیر کرتے ہیں؟ اور میرے نزدیک یہی مراد ان ”کثیر من اصحابنا“ کی بھی ہے جن کا قول میر سید شریف جرجانی نے شرح مواقف میں نقل کیا ہے، کیونکہ انہوں نے تفسیق کی نسبت خطا کی طرف کی ہے، حضرت معاویہؓ کی طرف نہیں اور یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ کسی فعل کا فسق ہونا اس کے فاعل کے فاسق ہونے کو مستلزم نہیں ہے، اجتہادی اختلاف میں ایک شخص کا عمل دوسرے کے نظریہ کے مطابق فسق ہوتا ہے، لیکن اسے فاسق نہیں کہا جاتا، جیسے ذبیحہ کی مثال میں عرض کیا جا چکا ہے، ورنہ اگر یہ بات مراد نہیں ہے تو میر سید شریف رحمۃ اللہ تو کثیر من اصحابنا کہہ رہے ہیں، کوئی شخص اہل سنت کے کسی ایک عالم کا قول کہیں دکھلائے جس نے حضرت معاویہؓ یا حضرت عائشہؓ کو جنگ سفین و جمل کی بناء پر فاسق قرار دیا ہو۔

اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے، اور ان کا منشاء یہی ہے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت زینبؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ جیسے صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ سے محاربہ کرنے کی بناء پر (معاذ اللہ) فاسق ہو گئے تھے، تو انکی یہ بات بلا شک و شبہ غلط اور جمہور امت مسلمہ کے مسلمات کے قطعی خلاف ہے، میں اپنے سابقہ مضمون کے آخر میں حوالوں کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ ساری

امت از اول تا آخر ان حضرات کی اس غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دینی آئی ہے، اہل سنت کی عقائد و کلام کی کتابیں ان تصریحات سے بھری ہوئی ہیں، اور ان میں سے کسی نے بھی اس بناء پر ان حضرات کو فاسق قرار دینے کی جرأت نہیں کی، اگر بغرض محال شاہ عبدالعزیزؒ یا میر سید شریف جرجانیؒ و ائمہؒ اس کے خلاف کوئی رائے ظاہر کرتے ہیں تو جمہور امت کے مقابلے میں انکا قول ہرگز مقبول نہیں ہوگا۔

جنگ صفین کے فریقین کی صحیح حیثیت

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہؓ نے حضرت علیؓ سے جو جنگیں لڑیں، ان سے حضرت علیؓ سے زیادہ کون متاثر ہو سکتا ہے، لیکن بزم خود حضرت علیؓ سے محبت رکھنے والے غور سے سنیں کہ وہ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ چنانچہ حضرت محمد الف ثانیؒ نے شارح مواقف کی سخت تردید کی ہے۔ (مکتبہ ۲۵۱ ص ۶۷ ج ۲ لاہور)

حضرت ابن بن راہویہؒ حدیث و فقہ کے مشہور امام ہیں، وہ اپنی سند سے روایت کرتے ہیں:

سمع علیؓ یوم الجمل و یوم الصفین رجلاً یغلوفی القول
فقال لا تقولوا الا خیرا انما ہم قوم زعموا اننا بعبنا علیہم و
زعمنا انہم بغوا علینا فقاتلناہم

حضرت علیؓ نے جنگ جمل و صفین کے موقع پر ایک شخص کو سنا کہ وہ (مقابل لشکر والوں کے حق میں) تشدد آمیز باتیں کہہ رہا ہے، اس پر آپ نے فرمایا کہ ان حضرات کے بارے میں کلہ خیر کے سوا کوئی بات نہ کہو، دراصل ان حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے، اس بناء پر ہم ان سے لڑتے ہیں۔

ابن تیمیہؒ: منہاج السنہ ص ۶۷ ج ۳ بولاق مصر ۱۳۲۲ھ حضرت محمد الف ثانیؒ نے اس قول میں بقید حاشیہ اگلے صفحے پر

اور علامہ ابن خلدونؒ وغیرہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں قتل ہونے والوں کا انجام کیا ہوگا؟ حضرت علیؓ نے دونوں فریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لا یموتن احدمن ہنولاءو قلبہنقی الادخل الجنة سلمہ
ان میں سے جو شخص بھی صفائی قلب کے ساتھ مرا ہو گا وہ جنت میں جائے گا۔

حضرت علیؓ کے ان ارشادات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خود ان کے نزدیک بھی حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ سے انکا اختلاف اجتہادی اختلاف تھا اور وہ نہ صرف یہ کہ انہیں اس بناء پر فاسق نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے حق میں کلمات خیر کے سوا کسی بات کے روادار نہ تھے، دوسری طرف حضرت معاویہؓ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ ”علیؓ مجھ سے بہتر اور مجھ سے افضل ہیں اور میرا ان سے اختلاف صرف حضرت عثمانؓ کے قصاص کے مسئلہ میں ہے اور اگر وہ خون عثمان کا قصاص لے لیں تو اہل شام میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا سب سے پہلے میں ہو گا۔“ اسی طرح جب قیصر روم مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے اور حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو یہ اسے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ”اگر تم نے اپنا ارادہ پورا کرنے کی ٹھان لی تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے صلح کروں گا، پھر تمہارے خلاف انکا جو لشکر روانہ ہو گا اس کے ہر اول دستے میں شامل ہو کر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا دوں گا اور تمہاری حکومت کو گاجر مولیٰ کی طرح اکھاڑ پھینکوں گا۔“ ۱۰

حاشیہ گزشتہ سے بیوت

یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ لیسوا کفرۃ ولا فتند (یہ نہ کافر ہیں اور نہ فاسق) مکتوبات، مکتوب ۹۶ ص ۱۱۰

۷ حاشیہ صفحہ ۱۰

۸ ابن خلدون: مقدمہ ص ۳۸۵، فصل ۳۰، دارالکتب اللبنانی بیروت ۱۹۵۶ء

۹ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۳۹ ج ۲ ص ۲۵۹ ج ۸

۱۰ الزبیدی: تاج العروس، ص ۲۰۸ ج ۷، دارلینبیا بنغازی، ”مطفئین“

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات صحابہؓ کی یہ باہمی لڑائیاں اقتدار کی خاطر نہیں تھیں، اور نہ ان کا اختلاف آج کی سیاسی پارٹیوں کا سا اختلاف تھا، دونوں فریق دین ہی کی سربلندی چاہتے تھے، ہر ایک کا دوسرے سے نزاع دین ہی کے تحفظ کے لئے تھا، اور یہ خود ایک دوسرے کے بارہ میں بھی یہی جانتے اور سمجھتے تھے کہ ان کا موقف دینا نڈا رانہ اجتہاد پر مبنی ہے، چنانچہ ہر فریق دوسرے کو رائے اور اجتہاد میں غلطی پر سمجھتا تھا، لیکن کسی کو فاسق قرار نہیں دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاید دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ہی جنگ ہو جس میں دن کے وقت فریقین میں جنگ ہوتی اور رات کے وقت ایک لشکر کے لوگ دوسرے لشکر میں جا کر اگلے مقتولین کی تجزیہ و تکفین میں حصہ لیا کرتے تھے۔^۱

اور خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی طرف رجوع کر کے آپ کے ارشادات میں یہ بات تلاش کیجئے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ آپ کے نزدیک کیا حیثیت رکھتی تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی متعدد احادیث میں اس جنگ کی طرف اشارے دیئے ہیں، اور ان سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس جنگ کو اجتہاد پر مبنی قرار دے رہے ہیں۔

صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعدد صحیح حدیثوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

تمرق مارقة عند فرقة من المسلمین تقتلهم اولی الطائفین
بالحق^۲

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے وقت ایک گروہ (امت سے) نکل جائے
گا اور اس کو وہ گروہ قتل کرے گا جو مسلمانوں کے دونوں گروہوں میں حق
سے زیادہ قریب ہوگا۔

اس حدیث میں امت سے نکل جانے والے فرقہ سے مراد بافتاق خوارج ہیں، انہیں

^۱ البدایہ والنہایہ ص ۲۷۷ ج ۷۔ اس قسم کے مزید ایمان افروز واقعات کے لئے دیکھئے تہذیب

تاریخ ابن عساکر ص ۷۳ ج ۱

^۲ ایضاً ص ۷۸ ج ۷

حضرت علیؓ کی جماعت نے قتل کیا جن کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیٰ الطائفتین بالحق (دو گروہوں میں حق سے زیادہ قریب) فرمایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف کھلا حق و باطل کا اختلاف نہیں ہوگا، بلکہ اجتہاد اور رائے کی دونوں جانب گنجائش ہو سکتی ہے، البتہ حضرت علیؓ کی جماعت حق سے نسبتاً زیادہ قریب ہوگی، اگر آپؐ کی مراد یہ نہ ہوتی تو حضرت علیؓ کی جماعت کو ”حق سے زیادہ قریب“ کے بجائے محض ”برحق جماعت“ کہا جاتا۔

اسی طرح صحیح بخاری صحیح مسلم اور حدیث کی متعدد کتابوں میں نہایت مضبوط سند کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تقوم الساعة حتى تقتل فئتان عظيمتان تكون بينهما

مقتلة عظيمة دعواهما واحدة

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ (مسلمانوں کی) دو عظیم

جماعتیں آپس میں قتل نہ کریں، انکے درمیان زبردست خونریزی ہوگی

حالانکہ دونوں کی دعوت ایک ہوگی۔

علماء نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں دو عظیم جماعتوں سے مراد حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جماعتیں ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی دعوت کو ایک قرار دیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے بھی پیش نظر طلب اقدار نہیں تھا بلکہ دونوں اسلام ہی کی دعوت کو لے کر کھڑی ہوئی تھیں، اور اپنی اپنی رائے کے مطابق دین ہی کی بھلائی چاہتی تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ جنگ صفین کے موقع پر صحابہ کی ایک بڑی جماعت پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ حق کس جانب ہے، اس لئے وہ مکمل طور پر فیروزانہ رہے، بلکہ امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا تو کہنا یہ ہے کہ صحابہؓ کی اکثریت اس جنگ میں شریک نہیں تھی، امام احمدؒ نے نہایت صحیح سند کے ساتھ ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

هاجت الفتنة واصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم

عشرات الالوف فلم يحضرها منهم مائة بل لم يبلغوا ثلاثين سنة
جس وقت فتنہ برپا ہوا تو صحابہ کرامؓ دسیوں ہزار کی تعداد میں موجود تھے
لیکن ان میں سے سو بھی اس میں شریک نہیں ہوئے، بلکہ صحابہؓ میں سے
شرکاء کی تعداد ہمیں تک بھی نہیں پہنچی۔

نیز امام احمدؒ ہی روایت کرتے ہیں کہ امام شعبہؒ کے سامنے کسی نے کہا کہ ابو شیبہؒ نے
حکم کی طرف منسوب کر کے عبدالرحمان بن ابی لیلیٰؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جنگ صفین میں
ستر دہری صحابہؓ شامل تھے، حضرت شعبہؒ نے فرمایا کہ ابو شیبہؒ نے جھوٹ کہا، خدا کی قسم اس
معاملہ میں میرا اور حکم کا نڈا کہ ہوا تھا تو ہم اس نتیجے میں پہنچے کہ صفین کی جنگ میں بدری
صحابہؓ میں سے سوائے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے کوئی شریک نہیں ہوا۔

(منہاج السنہ ج ۱۰ ص ۱۰۰)

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ کا موقف صراحتاً باطل اور معاذ اللہ "فسق" تھا تو
صحابہؓ کی اتنی بڑی تعداد نے کھل کر حضرت علیؓ کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ اگر وہ صراحتاً برسر
بغاوت تھے تو قرآن کریم کا یہ حکم کھلا ہوا تھا کہ ان سے قتال کیا جائے پھر صحابہؓ کی اکثریت نے
اس قرآنی حکم کو کیوں پس پشت ڈال دیا؟ حضرت ابن کثیرؒ نے بھی مذکورہ دو حدیثیں اپنی تاریخ
میں نقل کر کے لکھا ہے:

وفيه ان اصحاب علي انى الطائفتين الى الحق وهما هو
منهـب اهل السنة والجماعة ان علياً هو المصلي وان كان
معاوية مجتهداً وهو ما حوروا به شاء الله له
اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ کے اصحاب دونوں
جماعتوں میں حق سے زیادہ قریب تھے اور یہی اہل سنت والجماعت کا مسلک
ہے کہ حضرت علیؓ برحق تھے، اگرچہ حضرت معاویہؓ مجتہد تھے، اور انشاء
اللہ اس اجتہاد پر انہیں بھی ثواب ملے گا۔

۱۔ ابن تیمیہؒ اس روایت کی سند نقل کر کے لکھتے ہیں: هذا الاسناد اصح اسناد علی وجه الارض (یہ سند

روئے زمین پر صحیح ترین سند ہے) منہاج السنہ ص ۱۸۶ ج ۳

۲۔ الہدایہ والتمایہ ص ۲۷۹ ج ۷

شیخ الاسلام محی الدین نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کتنے واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

منہب اهل السنة والحق احسان الظن بهم والامساک عما
شجرینہم وتاویل قتالہم وانہم مجتہدون متناولون لم
یقصلوا معصیة ولا محض الدنیا بل اعتقد کل فریق انہ
المحق ومخالفہ یاغ فوجب علیہ قتالہ لیرجع الی امر اللہ
وکان بعضهم مصیبا وبعضہم مخطئا معاذ ورا فی الخطا لانہ
یاجتہاد والمجتہد اذا اخطا لا اثم علیہ وکان علی رضی اللہ
عنه هو المحق المصیب فی ذلک الحروب ہذا منہب اهل
السنة وکانت القضايا مشتبہة حتی ان جماعة من الصحابة
تخیروا فیہا فاعتزلوا الطائفین ولم یقاتلوا ولو تیقنوا
الصواب لم ینتأخروا عن مساعدتہ سل

”اہل سنت اور اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ صحابہؓ کے ساتھ نیک گمان رکھا جائے، انکے باہمی اختلافات کے بارے میں توقف کیا جائے، اور انکی لڑائیوں کی صحیح توجیہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ وہ مجتہد اور متداول تھے، انہوں نے نہ گناہ کا قصد کیا اور نہ محض دنیا کا، بلکہ ہر فریق کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ حق پر ہے اور اس کا مخالف برسرِ بغاوت، اس لئے اس سے قتال کرنا اس پر واجب ہے تاکہ اللہ کے احکام کی طرف لوٹ آئے، ان میں سے بعض کی رائے وا تحت صحیح تھی، اور بعض کی غلط، لیکن چونکہ یہ غلط رائے بھی اجتہاد کی وجہ سے قائم ہوئی تھی اور مجتہد اگر غلطی بھی کرے تو اس پر گناہ نہیں ہوتا اس لئے جن لوگوں کی رائے غلط تھی وہ بھی معذور تھے اور جنگوں میں حضرت علیؓ کا اجتہاد وا تحت درست تھا، یہ اہل سنت کا مذہب ہے، اور اس وقت حق اتنا مشتبہ اور غیر واضح تھا کہ صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی اور غیر جانبدار رہ کر لڑائی میں

شریک نہ ہوئی، حالانکہ اگر ان حضرات صحابہؓ کے سامنے اس وقت حق
یعنی طور پر واضح ہو جاتا تو وہ اس کی نصرت سے پیچھے نہ رہتے۔

یہ ہے اہل سنت کا صحیح موقف جو قرآن و سنت کے مضبوط دلائل، صحیح روایات اور
صحابہ کرامؓ کی مجموعی سیرتوں پر مبنی ہے، اب اگر ان تمام روشن دلائل، قوی احادیث اور ائمہ
اہل سنت کے واضح ارشادات کے علی الرغم کسی کا دل ہشام، کلبی اور ابو مخنف جیسے لوگوں
کے بیان کئے ہوئے افسانوں ہی پر فریفتہ ہے، اور وہ ان کی بناء پر حضرت معاویہؓ کو مورد الزام
ٹھہرانے اور گناہ گار ثابت کرنے پر ہی مصر ہے تو اس کے لئے ہدایت کی دعا کے سوا اور کیا کیا
جاسکتا ہے؟ جس شخص کو سورج کی روشنی کے بجائے اندھیرا ہی اچھا لگتا ہو تو اس ذوق کا
علاج کس کے پاس ہے؟ لیکن ایسا کرنے والے کو خوب اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ پھر
معاملہ صرف حضرت معاویہؓ ہی کا نہیں ہے، ان کے ساتھ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت
زبیرؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ اور حضرت عبادہ بن صامتؓ پر بھی (معاذ اللہ) فسق کا الزام عائد
کرنا ہوگا، اور پھر اجلہ صحابہؓ ہی وہ عظیم الشان جماعت بھی اس ناوک تفسیق سے نہیں بچ
سکتی جس نے (نعموزیاد) ان حضرات کو کھلے فسق کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا، امت
اسلامیہ کے ساتھ اس صریح دھاندلی کا کھلی آنکھوں نظارہ کیا، اور حضرت علیؓ کو جو اس
دھاندلی کے خلاف جہاد کر رہے تھے، بے یار و مددگار چھوڑ کر گوشہ عافیت کو اختیار کر لیا، لہذا
عشرہ مبشرہ میں سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ اور باقی اجلہ صحابہؓ میں
حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن سلامؓ، حضرت قدامہ بن مظعونؓ، حضرت کعب
بن مالکؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت
عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت ابوامامہ باہلیؓ، حضرت مسلمہ بن مخلدؓ اور حضرت
فضالہ بن عبیدؓ جیسے حضرات کے لئے بھی یہ ماننا پڑے گا کہ انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ
چھوڑ کر باطل کے ہاتھ مضبوط کئے اور امام برحق کی اطاعت کو چھوڑ کر فسق کا ارتکاب کیا۔
اگر کوئی شخص یہ تمام باتیں تسلیم کرنے کو تیار ہے تو وہ حضرت معاویہؓ کو بھی فاسق قرار
دے لیکن پھر اسے پردے میں رکھ کر بات کرنے کے بجائے جرأت کے ساتھ کھل کر ان تمام
باتوں کا اقرار کرنا چاہئے اور واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہئے کہ صحابہؓ کے بارے میں
تعظیم و تقدیس کے عقائد انکی انصیلت کے دعوے، ان کے حق میں خیر القرون کے خطابات

سب ڈھونگ ہیں، ورنہ عملاً ان میں اور آج کے دنیا پرست سیاستدانوں میں شہہ برابر کوئی فرق نہیں تھا۔

آخر میں میں ملک غلام علی صاحب کے ایک اور سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں، میں نے لکھا تھا کہ اگر صحابہ کرامؓ کو عام عملی زندگی میں فاسق قرار دے دیا جائے تو دین کے سارے عقائد و احکام خطرے میں پڑ جائیں گے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث ہمیں انہی کی واسطے سے پہنچی ہیں، اور اگر وہ عملی زندگی میں فاسق ہو سکتے ہیں تو پھر روایت حدیث کے معاملہ میں انہیں فرشتہ تسلیم کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اسکے جواب میں جناب غلام علی صاحب مجھ سے پوچھتے ہیں :

”روایت حدیث اور تبلیغ دین کے لئے عدالت کا جو معیار آپ صحابہ کرام کے لئے وضع فرما رہے ہیں کیا اس کو آپ پورے سلسلہٴ رواۃ پر نافذ اور چسپاں کریں گے؟“

ملک صاحب نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے لکھی ہے جیسے روایات کے رد و قبول کے قواعد آج ہم پہلی بار مدون کرنے بیٹھے ہیں، اور ہمارے اختیار میں ہے کہ اس معاملے میں جو اصول چاہیں مقرر کر لیں، میں عرض کر چکا ہوں کہ عدالت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان فاسق نہ ہو، یہ بات اس کی روایت قبول کرنے کے لئے لازمی شرط ہے، یہ شرط آج میں نے اپنی جانب سے نہیں گھڑ دی ہے، اصول حدیث کی جو کتاب چاہیں کھول کر دیکھ لیجئے اس میں یہ شرط لکھی ہوئی ملے گی اور چودہ سو سال سے اسی شرط کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے، اب صحابہ کرامؓ کے بارے میں چونکہ امت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی فاسق نہیں تھا بلکہ ان میں سے ہر فرد عادل ہے، اس لئے انکی تمام روایات مقبول ہیں، اس کے برخلاف دوسرے رواۃ حدیث کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سب عادل تھے، اس لئے انکی ہر روایت مقبول نہیں، بلکہ ان میں سے ہر راوی کے حالات کی تحقیق کر کے یہ دیکھا جائے گا کہ وہ عادل تھا یا نہیں؟ اگر وہ عادل ہو تو اسکی روایت قبول کی جائے گی، اور اگر فاسق ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا، لیکن صحابہ کرامؓ کے بارے میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں، وہ چونکہ سب کے سب بلا استثناء عادل ہیں، اس لئے ان کی ہر روایت مقبول ہے، ان کی عدالت کو مجروح کر کے انکی بیان کردہ حدیث کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

اب اگر کوئی شخص صحابہؓ کی عدالت پر طعن کر کے انہیں فاسق قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان روایات کو بھی مشتبہ بنا رہا ہے جو ان سے مروی ہیں اور جنہیں امت نے غیر مشتبہ سمجھ کر ان پر بہت سے احکام و مسائل کی عمارت کھڑی کر دی ہے۔

دوسرے راویان حدیث کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان کے ایک ایک قول و فعل کو جانچ کر دیکھا گیا ہے کہ وہ عدالت کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟ اور جو اس معیار پر پورا نہیں اترتا اس کی روایات کو رد کر دیا گیا ہے، لیکن صحابہ کرامؓ کے بارے میں یہ عقیدہ مسلم رہا ہے کہ وہ عدالت کے معیار بلند پر فائز ہیں، لہذا انکی ہر روایت قابل اعتماد سمجھی گئی ہے، اب اگر کوئی شخص اس عقیدے میں غلط اندازی کرے تو وہ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ایک ایک صحابی کے فحی حالات زندگی کی از سر نو تحقیق کر کے یہ طے کیا جائے کہ جو روایتیں اس نے بیان کی ہیں وہ درست ہیں یا نہیں؟ آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ یہ اقدام دین کی ساری عمارت کو متزلزل کرنے کے مترادف ہے یا نہیں؟

ملک صاحب میری اس دلیل کو تو ”عجیب و غریب استدلال“ فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس میں ”مغالطے مضمحل ہیں“ لیکن حضرت علیؓ سے امیدواری خلافت کا اعتراض دور کرتے ہوئے جو کچھ مولانا مودودی صاحب نے لکھا ہے، اس کے بارے میں نہ جانے ان کا کیا خیال ہو گا؟ مولانا لکھتے ہیں:

”کیا واقعی یہی تصویر ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیتؓ اور ان کے اصحاب کبارؓ کی؟ کیا اللہ کے رسول کی یہی پوزیشن تھی کہ وہ دنیا کے عام بائیان سلطنت کی طرح ایک سلطنت کا بانی تھا؟ کیا پیغمبر خدا کی ۲۳ سالہ تعلیم، صحبت اور تربیت سے یہی اخلاق، یہی سیرتیں اور یہی کردار تیار ہوتے تھے؟..... تاہم اگر کسی کا جی چاہتا ہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے، تاریخ کے صفحات تو بہر حال اس سے آلودہ ہی ہیں، مگر پھر ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ خاکم بدہن رسالت کا دعویٰ محض ایک ڈھونگ تھا، قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہ تھا، اور تقدس کی ساری داستانیں ریا کاری کی داستانیں تھیں.... ہر صاحب عقل کو خود سوچنا چاہیے کہ ان میں سے کونسی تصویر مسلح قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ

کے اہل بیت و اصحاب کبار کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اگر پہلی تصویر پر کسی کا دل ریختنا ہو تو ریختے، مگر اس کے ساتھ ایک امید واری اور دعویٰ واری کا مسئلہ ہی نہیں، پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہو جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اگر تاریخ کے صفحات حضرت علیؓ کی سیرت پر امید واری خلافت کا داغ لگا دیتے ہیں تو اس سے تو پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہو جاتا ہے، رسالت کا دعویٰ محض ایک ”ڈھونگ“ بن جاتا ہے، قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہیں رہتا، اور تقدس کی ساری داستانیں ریا کاری کی داستانیں ہو جاتی ہیں، لیکن حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعد بن زیدؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت اسامہؓ اور ان جیسے دوسرے بہت سے حضرات کی سیرت پر کتنے ہی داغ لگتے رہیں، ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کبار کی کیسی ہی بھیانک تصویر بنتی رہے، اس سے دین و ایمان کا کوئی مسئلہ حل طلب نہیں ہوتا؟ جو استدلال حضرت علیؓ کے بارے میں کیا گیا تھا وہی استدلال ان حضرات صحابہؓ کے بارے میں بھی کیا جاتا ہے تو وہ ”عجیب و غریب“ بن جاتا ہے، اور اس میں ”مخالفہ مضمیر“ ہو جاتے ہیں۔ ع تم ہی بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

عدالت صحابہؓ کی بحث کے دوران ملک صاحب نے لکھا ہے :

”البلاغ میں چونکہ یہ سوال خاص طور پر اٹھایا گیا ہے کہ کسی صحابی یا کسی راوی کی جانب بدعت کے انتساب کے بعد اس کی بیان کردہ حدیث کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے، اسلئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ پر بھی مختصر بحث کر دوں“

اس کے بعد موصوف نے تقریباً آٹھ صفحات پر بحث کی ہے کہ راوی حدیث کے کسی

قول و فعل پر بدعت کا اطلاق اس کی روایت میں کس حد تک قارح ہو سکتا ہے؟ لیکن میں حیران ہوں کہ جس سوال کو انہوں نے مجھ سے منسوب کر کے فرمایا ہے کہ اسے ابلاغ میں ”خاص طور پر“ اٹھایا گیا ہے، وہ میں نے کب اور کس جگہ لکھا ہے؟ میری ساری بحث تو فسق کے بارے میں تھی، یہ بحث تو میں نے کہیں بھی نہیں چھیڑی کہ مبتدع کی روایت کس حد تک قابل قبول ہے؟ چہ جائیکہ اس سوال کو ”خاص طور پر“ اٹھایا ہو۔ لیکن ملک صاحب ہیں کہ خواہ مخواہ اس دعوے کو مجھ سے منسوب کر کے اس کی مفصل تردید بھی کر رہے ہیں، اور سچ میں طنز و تعریض بھی فرما رہے ہیں، آپ ہی بتائیے کہ میں جواب میں اس کے سوا کیا عرض کروں کہ

وہ بات میرے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بڑی ناگوار گذری ہے

آخری گزارش

ترجمان القرآن میں تیرہ ماہ تک مسلسل اس موضوع پر بحث و مباحثہ کرنے کے بعد ملک صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں اتحاد کی دعوت بھی دی ہے، اور مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی خدمات گناتے ہوئے لکھا ہے کہ ”اگر اب بھی ہم نے باہمی خانہ جنگی جاری رکھی اور ہر اختلافی مسئلہ میں ایک دوسرے کو توہین اسلام کا مرتکب قرار دیا تو اس کا فائدہ اعدائے اسلام ہی کو پہنچے گا۔“

اس نیک جذبے کی پوری قدردانی کے ساتھ میں یہ ضرور دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب کے نظریات سے اختلاف، یا اس پر علمی تنقید کو کسی لغت کی رو سے ”خانہ جنگی“ کی تعریف میں داخل ہے؟ اور کیا ”خانہ جنگی“ سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کے تمام نظریات کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے؟ وہ جس موقع پر، جس زمانے میں، جو چاہیں تحریر فرماتے رہیں، خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، خواہ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوتا ہو یا غلط فہمیاں پھیلتی ہوں، لیکن انکی تحریریں پڑھنے والے کا کام صرف یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان پر بلا مطالبہ دلیل ایمان لے آئے؟ وہ صحابہ کرامؓ تنقیص کی حد تک تنقید فرمائیں تو اسے ”علمی ضرورت“ کا نام دیا جائے لیکن کوئی شخص خود

مولانا مودودی کے نظریات پر تنقید کے لئے خالص علمی انداز میں بھی زبان کھولے تو ”خانہ جنگی“ کا مجرم قرار پائے۔

اگر اتحاد و اتفاق کا مفہوم یہی کچھ ہے کہ ”منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو ورنہ چپ رہو“ تو ملک صاحب خود انصاف کے ساتھ غور فرمائیں کہ یہ ”اتحاد و اتفاق“ کبھی قائم ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مولانا مودودی صاحب نے مغربی افکار و نظریات کے مقابلے میں جو کام کیا ہے، وہ بلاشبہ قابل تعریف اور قابل قدر ہے اس شعبے میں ان کی خدمات کو ان سے اختلاف رکھنے والے بھی سراہتے ہیں، اور ہم نے بھی اس کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا، لیکن کاش کہ مولانا اپنے دائرہ عمل کو اسی حد تک محدود رکھتے، اور اسلام کے بلند مقاصد کی خاطر اس نازک دور میں وہ مسائل نہ چھیڑتے جنہوں نے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی، اگر ان کا قلم حجاج کی تلوار کی طرح کفر و الحاد کے ساتھ اسلام کے ستونوں کو بھی اپنا برف نہ بنا لیتا تو علماء یا عام مسلمانوں کو ان سے کوئی ذاتی پر خاش نہیں تھی، یہی علماء اور یہی عام مسلمان جو آج ”مودودی“ کے نام سے بدکتے ہیں، ان کے دست و بازو بن کر کفر و الحاد کے سیلاب کا ایک جہتی کے ساتھ مقابلہ کرتے، لیکن افسوس ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے جس شد و مد کی ساتھ مغربی الحاد کا مقابلہ کیا، اسی تندی اور تیزی کے ساتھ اپنے قلم کا رخ تاریخ اسلام کی ان شخصیتوں کی طرف بھی پھیر دیا جو امت مسلمہ کے عمائد ہیں اور جن کے بارے میں مسلمانوں کا ضمیر انتہائی حساس واقع ہوا ہے۔

میرا انتہائی درد مندانہ التماس ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور ان کے رفقاء جماعت خدا کے لئے کبھی اس بات پر بھی ٹھنڈے دل اور سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں کہ اس وقت اہل سنت ان مکاتب فکر کے مجموعہ سے عبارت ہے جو دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث کے ناموں سے معروف ہیں، ان میں سے کوئی کتب فکر ایسا نہیں ہے جو مولانا مودودی صاحب کے ان نظریات سے بیزار نہ ہو، سوال یہ ہے کہ کیا یہ سارے کے سارے مسلمان عقل و خرد سے بالکل خالی ہیں؟ یا ان سے انصاف و دیانت بالکل اٹھ گئی ہے؟ یا یہ سب کے سب

۱۔ یہ الفاظ مولانا مودودی صاحب نے دور ملوکیت کے خصائص میں ذکر کئے ہیں اور حضرت معاویہؓ کو چسپاں کیا ہے۔

حاسد اور کینہ پرور ہیں؟ کہ خواہ مخواہ مولانا کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟۔۔۔ آخر کوئی تو بات ہے جس سے ان مکاتب فکر کے سنجیدہ صاحب بصیرت اور علمی مزاج رکھنے والے لوگوں کے دل بھی مجروح ہوئے ہیں اور جس کی وجہ سے وہ لوگ بھی بولنے پر مجبور ہو گئے ہیں جو اس نازک دور میں فرقہ وارانہ مباحث چھیڑنے سے ہمیشہ پرہیز کرتے رہے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب کے جن نظریات سے ان سارے مکاتب فکر میں کبیدگی پیدا ہوئی اور جن سے ملک کے طول و عرض میں فرقہ وارانہ مباحث کا در کھل گیا، تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے کہ وہ سو فیصد حق ہیں، لیکن کیا اس ”حق“ کا اظہار اسی وقت ضروری تھا جبکہ اسلامی صفوں میں معمولی سا انتشار دشمنوں کی پیش قدمیوں کو میلوں آگے بڑھا لیا ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو تھی کہ کعبہ کو از سر نو بنائے ابراہیمی پر تعمیر فرمائیں، یہ اقدام سو فیصد برحق تھا، لیکن آپ نے محض اس بناء پر اس نیک کام کو چھوڑ دیا کہ اس سے امت میں انتشار کا اندیشہ تھا۔ افسوس۔ اور نہایت افسوس ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے جو اسلام کے بلند مقاصد کا پرچم لے کر چلے تھے، اس واضح حقیقت کو نہیں پہچانا کہ اگر وہ ان اختلافی مسائل کو نہ چھیڑتے تو ملت کا نقشہ کیا ہوتا؟

پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ ان کے رفقاء جماعت کا جو مزاج مجموعی طور پر تیار ہوا ہے، اس نے عملاً مولانا کے ایک ایک لفظ کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا ہے، ان میں سے اکثر حضرات جماعت اسلامی کے باہر سے مولانا پر تنقید کا ایک لفظ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، خواہ وہ کتنی درد مندی، کتنی سنجیدگی اور کتنی تہذیب و شائستگی کے ساتھ کی گئی ہو، عملاً وہ مولانا مودودی صاحب کو تنقید سے بالا تر ہی سمجھنے لگے ہیں، اور اس طرز عمل نے پوری جماعت کو عام مسلمانوں کی نگاہ میں ایک فرقہ بنا دیا ہے۔

اگر کوئی شخص امت کے عام مسلمات کے خلاف کوئی تحریر شائع کرتا ہے تو اسے کم از کم اس کے لئے تو تیار رہنا چاہیے کہ جانب مخالف سے علمی اور تحقیقی انداز میں اس پر تنقید کی جائے، لیکن جماعت اسلامی کے بہت سے پُر جوش کارکنوں اور مولانا کے معتقدین کی طرف سے جو خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا کے کسی نظریے کے خلاف زبان تنقید کھولنا ہی جرم ہے، اور بعض خطوط کو پڑھ کر تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ علمی تنقید لکھ کر (خدا انخواستہ) میں نے دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھ دیا ہے۔ خود ملک

صاحب نے جن تیوروں کے ساتھ اس کا جواب دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ مولانا سے اظہار اختلاف کے بعد میں ان لوگوں کی صف میں آ گیا ہوں جن سے علمی مباحثہ نہیں لڑائی ضروری ہے۔ جو حضرات نظریاتی اختلاف کے مدلل اظہار اور نزاع وجدال میں عملاً خود کو کوئی فرق نہ رکھتے ہوں حیرت ہے کہ انہیں دوسروں سے خانہ جنگی کی شکایت ہے۔

میری صاف گوئی، مولانا، ان کے معقدین اور انکی جماعت کو ممکن ہے ناگوار ہو، لیکن خدا شاہد ہے کہ میں نے یہ باتیں دکھے ہوئے دل کے ساتھ خیر خواہی کے جذبے سے اس احساس کے تحت لکھی ہیں کہ ان کے مذکورہ طرز عمل سے امت کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے جس محنت جانفشانی اور خود اعتمادی کے ساتھ مغربی افکار کا مقابلہ کیا ہے، خطرہ ہے کہ ان کا یہ طریق کار ان ساری خدمات کے اثر کو زائل نہ کر دے۔ اگر آج بھی مولانا مودودی اور انکی جماعت نے اپنی سنگین غلطیوں کو محسوس نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا، لیکن پانی کے سر سے گذر جانے کے بعد اس احساس کا کوئی فائدہ امت نہیں اٹھا سکے گی۔ کاش! کہ درد مندی سے نکلے ہوئے یہ کلمات ان میں سے کسی صاحب دل کے سینے میں اتر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، اسکی صحیح خدمت کی توفیق بخشے، اور مسلمانوں کو باہمی نزاع وجدال کے فتنے سے بچا کر ان میں اتحاد و اتفاق پیدا فرمائے۔ آمین

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد تقی عثمانی

۱۳ شوال ۱۳۹۰ھ

دارالعلوم کراچی

حصہ سوم

حضرت معاویہؓ
شخصیت، کردار اور کارنامے

مولانا محمود اشرف عثمانی

حضرت معاویہؓ

شخصیت، کردار اور کارنامے

جلیل القدر صحابی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عالم اسلام کی ان چند گنی جتی ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے احسان سے یہ امت مسلمہ بیکدوش نہیں ہو سکتی۔ آپ ان چند کبار صحابہؓ میں ہیں جن کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسلسل حاضری اور حق تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ وحی کو لکھنے کا شرف حاصل ہے۔

پھر۔۔۔ آپ اسلامی دنیا کی وہ مظلوم ہستی ہیں جن کی غویوں اور ذاتی محاسن و کمالات کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ ان کو چھپانے کی بیہم کو ششیں کی گئیں، آپ پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے، آپ کے متعلق ایسی باتیں گھڑی گئیں اور ان کو پھیلا دیا گیا جن کا کسی عام صحابی سے تو دور کنار کسی شریف انسان سے پایا جانا مشکل ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جس شد و د کے ساتھ پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کیا گیا، اس کی وجہ سے آپ کا وہ حسین ذاتی کردار نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت نے پیدا کیا تھا، نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا حضرت معاویہؓ کو بس جنگِ صفین کے قائد کی حیثیت سے جانتی ہے جو حضرت علیؓ کے مقابلے کے لئے آئے تھے، لیکن وہ حضرت معاویہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منظورِ نظر تھے، جنہوں نے کئی سال تک آپ کے لئے کتابتِ وحی کے نازک فرائض انجام دیئے، آپ سے اپنے علم و عمل کے لئے بہترین دعائیں لیں، جنہوں نے حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ کے زمانے میں

اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا، جنہوں نے تاریخ اسلام میں سب سے پہلا بحری بیڑہ تیار کیا، اپنی عمر کا بہترین حصہ رومی عیسائیوں کے خلاف جہاد میں گزارا، اور ہر بار ان کے دانت کھٹے کئے آج دنیا ان کو فراموش کر چکی ہے، لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ وہ ہیں جن کی حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ ہوئی تھی، لیکن قبرص، روڈس، صقلیہ اور سوڈان جیسے اہم ممالک کس نے فتح کئے؟ سالہا سال کے باہمی خلفشار کے بعد عالم اسلام کو پھر سے ایک جھنڈے تلے کس نے جمع کیا؟ جہاد کا جو فریضہ تقریباً متروک ہو چکا تھا اسے از سر نو کس نے زندہ کیا؟ اور اپنے عہد حکومت میں نئے حالات کے مطابق شجاعت و جواں مروی، علم و عمل، حلم و بردباری، امانت و دیانت میں نظم و ضبط کی بہترین مثالیں کس نے قائم کیں؟ یہ ساری باتیں وہ ہیں جو پروردگار کی غلیظ تمہوں میں چھپ کر رہ گئی ہیں، اس مقالہ میں حضرت معاویہ کی زندگی کے انہی حسین پہلوؤں کو سامنے لانا مقصود ہے، یہ آپ کی مکمل سیرت نہیں، بلکہ آپ کی سیرت کے وہ گوشے ہیں جو تاریخ کے لمبے میں دب کر آج نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو رہے ہیں اور ان کے مطالعہ سے حضرت معاویہؓ کے کردار کی ایک ایسی تصویر سامنے آتی ہے جو ہر لحاظ سے دلکش ہی دلکش ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس تصویر میں تاریخ اسلام کے اس عظیم کردار کی ایک دلاویز جھلک دیکھ سکیں گے۔

ابتدائی حالات

آپؓ عرب کے مشہور و معروف قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی شرافت و نجابت اور جود و سخا میں پورے عرب میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اس قبیلہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں آقائے دو جہاں مبعوث ہوئے۔ پھر قریش میں سے آپ اس نامور خاندان بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے جو نسبی و منہجی حیثیت سے بنو ہاشم کے بعد سب سے زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا۔

حضرت معاویہؓ کے والد ماجد، حضرت ابوسفیانؓ اسلام لانے سے قبل ہی اپنے خاندان میں ممتاز حیثیت کے مالک اور قبیلہ کے معزز سرداروں میں شمار ہوتے تھے، آپ فتح مکہ کے دن اسلام لائے، آپ کے اسلام لانے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مسرت ہوئی اور آپ نے اعلان فرمایا:

”جو شخص بھی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے امن دیا جائے گا۔“
اسلام لانے سے قبل زمانہ جاہلیت میں بھی آپ اعلیٰ صفات کے مالک اور اخلاق
کریمانہ کے حامل تھے، علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

وکان رئیساً مطاعاً ذاملاً جزیلاً

آپ اپنی قوم کے سردار تھے، آپ کے حکم کے اطاعت کی جاتی تھی اور
آپ کا شمار مال دار لوگوں میں ہوتا تھا۔

پھر آپؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے اور غزوہ حنین اور غزوہ
یرموک میں شرکت کی۔ یہاں تک کہ ۳۱ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت معاویہؓ آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے، بعثت نبوی سے پانچ سال قبل آپ کی
ولادت ہوئی۔ سن بچپن ہی سے آپ میں اولوالعزمی اور بڑائی کے آثار نمایاں تھے چنانچہ ایک
مرتبہ جب آپ نو عمر تھے آپ کے والد ابوسفیان نے آپ کی طرف دیکھا اور کہنے لگے:
میرا بیٹا بڑے سردار ہے اور اس لائق ہے کہ اپنی قوم کا سردار بنے، آپ کی والدہ ہند
نے یہ سنا تو کہنے لگیں:

”نقطہ اپنی قوم کا؟ میں اس کو روؤں اگر یہ پورے عالم عرب کی قیادت نہ کرے“
اسی طرح ایک بار عرب کے ایک قیادہ شناس نے آپ کو پھٹ بنے کی حالت میں دیکھا تو بولا:
”میرا خیال ہے کہ یہ اپنی قوم کا سردار بنے گا۔“

ماں باپ نے آپ کی تربیت خاص طور پر کی اور مختلف علوم و فنون سے آپ کو آراستہ
کیا اور اس دور میں جبکہ لکھنے پڑھنے کا رواج بالکل نہ تھا اور عرب پر جہالت کی گھٹا ٹوپ
تاریکی چھائی ہوئی تھی، آپ کا شمار ان چند گنے پنے لوگوں میں ہونے لگا جو علم و فن سے
آراستہ تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

۱ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۲۱ ج ۸ مطبوعہ مصر ۱۹۳۹ء

۲ ابن حجر: الاصابہ ص ۳۳ ج ۳ مطبوعہ مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ ۱۹۳۹ء

۳ حوالہ مذکورہ بالا

۴ علامہ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۸ ج ۸ مطبوعہ مطبعہ کردستان، صلیبیہ مصر ۱۳۳۸ھ

اسلام

آپؓ ظاہری طور پر فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے مگر درحقیقت آپ اس سے قبل ہی اسلام قبول کر چکے تھے لیکن بعض مجبور یوں کی بناء پر ظاہر نہ کیا تھا، مشہور مورخ واقدی کہتے ہیں: کہ آپؓ صلح حدیبیہ کے بعد ہی ایمان لے آئے تھے مگر آپ نے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا اور فتح مکہ کے دن ظاہر کیا۔ اپنے اسلام کو چھپائے رکھنے اور فتح مکہ کے موقع پر ظاہر کرنے کی وجہ خود حضرت معاویہؓ نے بیان کی۔ چنانچہ فاضل مورخ ابن سعد کا بیان ہے: کہ حضرت معاویہؓ فرمایا کرتے تھے کہ ”میں عمرۃ القضا سے پہلے اسلام لے آیا تھا، مگر نہ جانے سے ڈرتا تھا کیوں کہ میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ اگر تم گئے تو ہم ضروری اخراجات زندگی دینا بھی بند کر دیں گے۔“ اس عذر اور دوسری مجبور یوں کی بنا پر آپؓ نے اپنے والد کے ہمراہ فتح مکہ کے موقع پر اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا۔ شہکی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بدر احد، خندق اور غزوہ حدیبیہ میں آپؓ کفلا کی جانب سے شریک نہ ہوئے حالانکہ اس وقت آپ جو ان تھے، آپ کے والد ابوسفیان سالار کی حیثیت سے شریک ہو رہے تھے اور آپ کے ہم عمر جوان بڑھ چڑھ کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لے رہے تھے، ان تمام باتوں کے باوجود آپ کا شریک نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کی حقانیت ابتداء ہی سے آپ کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق

اسلام لانے کے بعد آپؓ مستقلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے رہے اور آپ اس مقدس جماعت کے ایک رکن رکین تھے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت وحی کے لئے مامور فرمایا تھا، چنانچہ جو وحی آپ پر نازل ہوتی اسے قلب بند فرماتے اور جو خطوط و فرامین، سرکار دو جہاں کے دربار سے جاری ہوتے انہیں بھی تحریر

فرماتے۔ وحی خداوندی لکھنے کی وجہ سے ہی آپ کو کاتب وحی کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ: لہ

نبی کریم کے کاتبین میں سب سے زیادہ حضرت زید بن ثابتؓ آپ کی خدمت میں حاضر رہے اور اس کے بعد دوسرا درجہ حضرت معاویہؓ کا تھا۔ یہ دونوں حضرات دن رات آپ کے ساتھ لگے رہتے اور اس کے سوا کوئی کام نہ کرتے تھے۔

حضور کے زمانے میں کتابت وحی کا کام جتنا نازک تھا اور اس کے لئے جس احساس ذمہ داری، امانت و دیانت اور علم و فہم کی ضرورت تھی وہ محتاج بیان نہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسلسل حاضری، کتابت وحی، امانت و دیانت اور دیگر صفات محمودہ کی وجہ سے نبی کریمؐ نے متعدد بار آپ کے لئے دعا فرمائی۔ حدیث کی مشہور کتاب جامع الترمذی میں ہے کہ ایک بار نبی کریمؐ نے آپ کو عادی اور فرمایا:

اللہم اجعلہ ہادیا مہدیا و اہدبہ

”اے اللہ معاویہؓ کو ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنا دیجئے۔ اور اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہدایت دیجئے۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریمؐ نے آپ کو عادی اور فرمایا:

اللہم علم معاویۃ الكتاب والحساب وقم العذاب

۱۔ جمال الدین یوسف: النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر و القاہرہ ص ۱۵۳ ج ۱ مطبوعہ وزارت الثقافة والارشاد والقومی مصر۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۷ ج ۹ مطبوعہ دار الکتب بیروت ۱۹۶۷ء: ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۵ ج ۳ مطبوعہ مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ ۱۹۳۹ء: البدایہ والنسایہ ص ۲۱ ج ۸ مطبوعہ مصر ۱۳۳۸ھ

۲۔ ابن حزم: جوامع السیرۃ ص ۲۷

۳۔ جامع الترمذی ص ۲۲۳ ج ۲ مطبوعہ ایچ۔ ایم۔ سعید قرآن محل کراچی۔ ابن اثیر: اسد الغابہ ص ۲۸۶ ج ۴ مطبوعہ مکتبۃ اسلامیہ طہران ۱۳۸۳ھ۔ حافظ خطیب: تاریخ بغداد ص ۲۰۸ ج ۱ مطبوعہ دار الکتب بیروت

اے اللہ معاویہؓ کو حساب کتاب سکھا اور اس کو عذاب جہنم سے بچا۔
مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے

سنا۔

اللهم علمه الكتاب ومكن له في البلاد ووقعه العذاب
اے اللہ معاویہؓ کو کتاب سکھا دے اور شہروں میں اس کے لئے ٹھکانا بنا
دے اور اس کو عذاب سے بچالے۔

نبی کریمؐ نے آپ کی امارت و خلافت کی اپنی حیات میں ہی پیش گوئی فرمادی
تھی اور اس کے لئے دعا بھی فرمائی تھی جیسا کہ مذکورہ حدیث سے ظاہر ہے۔ نیز حضرت
معاویہؓ خود بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے وضو کا
پانی لے کر گیا۔ آپ نے پانی سے وضو فرمایا اور وضو کرنے کے بعد میری طرف دیکھا اور فرمایا

اے معاویہ! اگر تمہارے سپرد امارت کی جائے (اور تمہیں امیر بنا دیا

جائے) تو تم اللہ سے ڈرتے رہنا اور انصاف کرنا۔

اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

جو شخص اچھا کام کرے اسکی طرف توجہ کرو اور مہربانی کرو اور جو کوئی برا کام

کرے اس سے درگزر کرو۔

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بعد خیال نکلا کہ مجھے

ضرور اس کام میں آزمایا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا (مجھے امیر بنا دیا گیا)۔

ان روایات سے صاف واضح ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دربار نبوی

۱ ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۸۱ ج ۳: ایضاً مجمع الزوائد ص ۳۵۶ ج ۹ ایضاً

کنز العمال ص ۷۸۷ ج ۷ بحوالہ ابن الجار (ک) مطبوعہ دارۃ المعارف حیدرآباد دکن کراچی ۱۳۱۳ھ

۲ مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۶ ج ۹ طبع بیروت ایضاً النجوم الزاہرۃ ص ۱۳۳ ج ۱ مطبوعہ مصر

۳ ابن حجر: الاصابہ ص ۳۴۳ ج ۳ مطبوعہ مصر: ایضاً مجمع الزوائد ص ۳۵۶ ج ۹ مطبوعہ بیروت:

وفی اردو احمد والبرانی فی الاوسط والکبیر ورجال احمد والی علی رجال الصحیح

میں کیا مرتبہ حاصل تھا؟ اور آپؐ ان سے کتنی محبت فرماتے تھے؟
ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ نبی کریمؐ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو کسی
کام میں مشورہ کے لئے طلب فرمایا مگر دونوں حضرات کوئی مشورہ نہ دے سکے تو آپؐ نے فرمایا

ادعوا معاویة احضروه امرکم فانہ قوی امین

کہ معاویہ کو بلاؤ اور معاملہ کو ان کے سامنے رکھو کیوں کہ وہ قوی ہیں
(مشورہ دیں گے) اور امین ہیں (غلط مشورہ نہ دیں گے) لیکن اس
روایت کی سند کمزور اور ضعیف ہے۔

نیز ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار ہوئے اور
حضرت معاویہؓ کو اپنے پیچھے بٹھایا توڑی دیر بعد آپؐ نے فرمایا:

”اے معاویہ! تمہارے جسم کا کون سا حصہ میرے جسم کے ساتھ مل رہا
ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا جیٹ (اور سینہ) آپ کے
جسم مبارک کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ سن کر آپؐ نے دعاوی:

اللہم املاہ علمنا

اے اللہ اس کو علم سے بھر دے

جب آپ کے والد اسلام لے آئے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اسلام لانے سے قبل مسلمانوں سے قتال کرتا تھا
اب آپ مجھے حکم دیجئے کہ میں کفار سے لڑوں اور جہاد کروں، نبی کریمؐ نے فرمایا:
ضرور! جہاد کرو۔ ﷺ

چنانچہ اسلام لانے کے بعد آپؐ اور آپ کے والد نے آنحضرتؐ کے ہمراہ مختلف

۱۲ مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۶ ج ۹ مطبوعہ بیروت و قیہ : رواہ البرہانی و البرہان باختصار و رجال
ثقات فی بعضہم خلاف و شیخ البرہان و شیخ البرہانی لم یوثق الا الذہبی فی المیۃ من و لیس فیہ جرح مفسر و مع
ذلک فوجہدیت منکر : ایضا حافظ ذہبی تاریخ الاسلام ص ۳۱۹ ج ۲

۱۳ حافظ ذہبی: تاریخ الاسلام ص ۳۱۹ ج ۲

۱۴ حافظ ابن کثیر: الہدایہ والنسایہ ص ۲۱ ج ۸ مطبوعہ مصر

غزوات میں شرکت کی اور کفار سے جہاد کیا۔ آپؓ نے آنحضرتؐ کے ہمراہ غزوہ حنین میں شرکت کی اور رسول کریمؐ نے آپ کو قبیلہ ہوازن کے مال غنیمت میں سے سوانٹ اور چالیس اوقیہ چاندی عطا فرمائی ۱۵۔

حضرت معاویہؓ صحابہؓ کی نظر میں

ان احادیث سے سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاویہؓ سے تعلق اور اس سے آپ کی فضیلت صاف ظاہر ہے، اس کے علاوہ دوسرے جلیل القدر صحابہؓ سے بھی متعدد اقوال مروی ہیں جن سے ان کی نظر میں حضرت معاویہؓ کے مقام بلند کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے حضرت معاویہؓ کی برائی کی گئی تو آپؓ نے فرمایا:

دعونا من دم قنسی قریش من یضحک فی الغضب ولا ینال
ما عنده الا علی الرضا ولا یؤخذ ما فوق راسه الا من تحت
قدمیه ۱۶

قریش کے اس جوان کی برائی مت کرو جو غصہ کے وقت ہنستا ہے (یعنی انتہائی بردبار ہے) اور جو کچھ اس کے پاس ہے بغیر اس کی رضامندی کے حاصل نہیں کیا جاسکتا اور اس کے سر پر کی چیز کو حاصل کرنا چاہو تو اس کے قدموں پر جھکنا پڑے گا (یعنی انتہائی غیور اور شجاع ہے۔)

اور حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: اے لوگو! تم میرے بعد آپس میں فرقہ بندی سے بچو اور اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ رکھو کہ معاویہؓ شام میں موجود ہیں ۱۷۔
یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس سے حضرت معاویہؓ کی اپنے بڑوں کے مقابلے میں اطاعت شعاری اور حضرت عمرؓ کی اپنے گورنروں اور مخصوصین پر کڑی

۱۵ حافظ ابن کثیر: الہدایہ والنہایہ ص ۱۱۷ ج ۸ مطبوعہ مصر

۱۶ ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۷ ج ۳ مطبوعہ مصر

۱۷ ابن حجر: الاصابہ ص ۳۱۳ ج ۳ مطبوعہ مصر

نگرانی ظاہر ہوتی ہے۔

علامہ ابن حجر نے اپنی کتاب الاصابہ میں نقل کیا کہ ایک بار حضرت معاویہؓ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آئے، حضرت معاویہؓ نے اس وقت ایک سبز رنگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا، صحابہ کرامؓ نے حضرت معاویہؓ کی طرف دیکھنا شروع کر دیا، حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا تو کھڑے ہوئے اور ورہ لے کر حضرت معاویہؓ کی طرف بڑھے اور مارنے لگے۔ حضرت معاویہؓ پکارتے رہے: اللہ اللہ! اے امیر المومنین! آپ کیوں مارتے ہیں؟ مگر حضرت عمرؓ نے کچھ جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے، صحابہ کرامؓ حضرت عمرؓ سے کہنے لگے: آپ نے اس جوان (حضرت معاویہؓ) کو کیوں مارا؟ حالانکہ ان جیسا آپ کی قوم میں ایک نہیں!

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: میں نے اس شخص میں بھلائی کے علاوہ کچھ نہ پایا اور اس کے متعلق مجھے صرف بھلائی کی ہی خبر ملی ہے، لیکن میں نے چاہا کہ اس کو اتاروں اور یہ کہہ کر آپ نے حضرت معاویہؓ کے لباس کی جانب اشارہ کیا۔^{۱۸}

نیز آپ کے متعلق حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے: تم قصور کسریٰ اور ان کی سیاست کی تعریف کرتے ہو حالانکہ خود تم میں معاویہؓ موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ کی نظر میں آپ کا مرتبہ اور مقام اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے آپ کے بھائی یزید بن ابی سفیانؓ کے انتقال کے بعد آپ کو شام کا گورنر مقرر کیا۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے گورنروں اور والیوں کے تقرر کے معاملہ میں انتہائی محتاط تھے اور جب تک کسی شخص پر کمل اطمینان نہ ہو جاتا اسے کسی مقام اور علاقہ کا امیر مقرر نہ کرتے تھے، پھر جس شخص کو گورنر بناتے اس کی پوری نگرانی فرماتے، اور جب کبھی معیار مطلوب سے فرد محسوس ہوتا اسے معزول فرمادیتے تھے، ان کا آپ کو شام کا گورنر

مقرر کرنا اور آخر حیات تک انہیں اس عہدے پر باقی رکھنا ظاہر کرتا ہے
انہیں آپؓ پر مکمل اعتماد تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کا دور آیا، وہ بھی آپؓ پر مکمل اعتماد کرتے
تھے اور تمام اہم معاملات میں آپ سے مشورہ لیتے اور اس پر عمل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے
بھی آپ کو شام کی گورنری کے عہدہ پر نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آس پاس
کے دوسرے علاقے اردن، عس، قنسورین اور فلسطین وغیرہ بھی آپ کی ماتحت گورنری میں
دے دیئے۔

اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ شہید کر دیئے گئے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ
پر مسلمانوں کی ایک جماعت نے بیعت کر لی اور آپ خلیفہ ہو گئے، اور آپ کے اور حضرت
معاویہؓ کے درمیان قاتلین عثمان سے قصاص لینے کے بارے میں اختلاف پیش آیا جس نے
بڑھ کر قتال کی صورت اختیار کر لی اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ کی بنیاد پڑ گئی، مگر جیسا کہ ہر
ہوش مند جانتا ہے کہ اس میں دونوں جانب اختلاف کا منشاء دین ہی تھا، اس لئے فریقین ایک
دوسرے کے دینی مقام اور ذاتی خصائل و اوصاف کے قائل تھے اور اس کا اظہار بھی
فرماتے تھے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ جب جنگ صفین سے واپس لوٹے تو فرمایا

ایہا الناس لانکرموا امارۃ معاویۃ فانکم لوفیقینمواہر اینم الرؤس
تندر عن کو اہلہا کانما الحنظل ۱۹ھ

۳۱ء لوگو! تم معاویہ کی گورنری اور امارت کو ناپسند مت کرو، کیونکہ اگر تم
نے انہیں گم کر دیا تو دیکھو گے کہ سر اپنے شانوں سے اس طرح کٹ کٹ
کر گریں گے جس طرح حنظل کا پھل اپنے درخت سے ٹوٹ کر گرنا
ہے۔

خلفائے راشدین کے علاوہ دیگر اجلہ صحابہ کرام کو دیکھئے کہ ان کی نگاہ میں حضرت
معاویہؓ کی کیا قدر و منزلت تھی؟

۱۹ حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۱ ج ۸ مطبوعہ مصر

حضرت ابن عباسؓ سے ایک فقہی مسئلہ میں حضرت معاویہ کی شکایت کی گئی تو آپ نے

فرمایا:

انہ فقیہہ

یقیناً معاویہؓ فقیہ ہیں۔

(جو کچھ انہوں نے کیا اپنے علم و فقہ کی بنا پر کیا ہوگا) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ

نے جواب میں فرمایا:

انہ قد صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کہ معاویہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اٹھایا ہے (اس

نے ان پر اعتراض بھیجا ہے)۔

حضرت ابن عباسؓ کے یہ الفاظ تارہے ہیں کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

صحبت کا شرف اٹھانا ہی اتنی بڑی فضیلت ہے کہ کوئی فضیلت اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ایک بار حضرت ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت کریمؓ نے آکر آپ

سے شکایت کے لہجے میں بیان کیا کہ حضرت معاویہؓ نے وتر کی تین رکعتوں کے بجائے ایک

رکعت پڑھی ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا:

اصابای بنی لیس احد من اعلام من معاویہؓ

۱۳۷۱ء میں! جو کچھ معاویہؓ نے کیا، صحیح کیا، کیوں کہ ہم میں معاویہؓ سے بڑھ

کر کوئی عالم نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ آپ کے علم و فقہ اور تقدی سے کس درجہ

متاثر تھے، یہ حال تو دینی امور میں تھا، دنیاوی امور میں حضرت ابن عباسؓ کا قول مشہور ہے:

ما رأیت اخلق للملک من معاویہؓ

۱۴ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸ مطبوعہ مصر

۱۵ ابن حجر: الاسابہ ص ۳۱۳ ج ۳ ایضاً: صحیح بخاری ص ۵۳۱ ج ۱ مطبوعہ نور محمد دہلی ۱۳۵۷ھ

۱۶ بیہقی: سنن کبریٰ ص ۳۲۹ ج ۳ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۶ھ ۱۷ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ

ص ۸ ج ۱۳۵ طبع مصر ابن اثیر: تاریخ کامل ص ۵ ج ۳ ابن حجر: الاسابہ ص ۳۱۳ ج ۳ مطبوعہ مصر

کہ میں نے معاویہؓ سے بڑھ کر سلطنت اور بادشاہت کا لائق کسی کو نہ پایا۔

حضرت عمیر بن سعدؓ کا قول حدیث کی مشہور کتاب ترمذی میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے عمیر بن سعدؓ کو محس کی گورنری سے معزول کر دیا اور ان کی جگہ حضرت معاویہؓ کو مقرر کیا تو کچھ لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں، حضرت عمیرؓ نے انہیں سختی سے ڈانٹا اور فرمایا:

لَا تَذَكُرُوا مَعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لِلَّهِمَّ اهْدِبْهُ

معاویہؓ کا صرف بھلائی کے ساتھ ذکر کرو، کیونکہ میں نے نبی کریمؐ کو ان کے متعلق یہ دعا دیتے سنا ہے: اے اللہ اس کے ذریعہ سے ہدایت عطا فرما۔^۱
حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے معاویہؓ سے بڑھ کر سرداری کے لائق کوئی آدمی نہیں پایا۔^۲

سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی آپس کی جگلوں میں غیر جانب دار رہے، فرمایا کرتے تھے:

مَارَيْتَ أَحَدًا بَعْدَ عِثْمَانَ أَقْضَى بِحَقِّ مَنْ صَاحَبَ هَذَا الْبَابِ
یعنی معاویہؓ

کہ میں نے حضرت عثمانؓ کے بعد کسی کو معاویہؓ سے بڑھ کر حق کا فیصلہ کرنے والا نہیں پایا۔^۳

حضرت قیس بن جابر کا قول ہے:

مَارَيْتَ أَحَدًا عَظِيمَ حِلْمًا وَلَا أَكْثَرَ سَوْدًا وَلَا أَبْعَدَانَاةً وَلَا أَلْيَنَ
مَخْرَجًا وَلَا أَرْحَبَ بَاعًا بِالْمَعْرُوفِ مِنْ مَعَاوِيَةَ كُنْتُ

^۱ جامع الترمذی ص ۲۳۷ ج ۲ مطبوعہ سید کراچی

^۲ ابن کثیر: الہدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۸ مطبوعہ مصر

^۳ حافظ ابن کثیر: الہدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۸ جلال الدین سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۱۵۶ مطبوعہ نور

محمد کراچی

”میں نے کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جو (حضرت) معاویہؓ سے بڑھ کر بردبار،
ان سے بڑھ کر سیادت کا لائق، ان سے زیادہ باوقار، ان سے زیادہ نرم
دل، اور نیکی کے معاملہ میں ان سے زیادہ کشادہ دست ہو۔“
ان چند روایات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ آپ کے متعلق کیا رائے
رکھتے تھے؟ اور ان کی نگاہ میں آپ کا مرتبہ کیا تھا؟

حضرت معاویہؓ تابعین کی نظر میں

تابعین کرام میں آپ کی حیثیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ
حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے اپنے دور خلافت میں کبھی کسی کو کوڑوں سے نہیں مارا، مگر ایک
فحش جس نے حضرت معاویہؓ پر زبان درازی کی تھی، اس کے متعلق انہوں نے حکم دیا کہ
اسے کوڑے لگائے جائیں۔

حافظ ابن کثیرؒ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارکؓ جو مشہور تابعین میں
سے ہیں، ان سے کسی نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں پوچھا تو حضرت ابن المبارکؓ جو اب
میں کہنے لگے: بھلا میں اس فحش کے بارے میں کیا کہوں؟ جس نے سرکار دو جہاں کے پیچھے
نماز پڑھی ہو اور جب سرکارؐ نے سمع اللہ لمن حمده کہا تو انہوں نے جو اب میں رہنا ولک
الحمد کہا ہو۔

انہی عبداللہ ابن المبارکؓ سے ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا: کیا یہ بتلائیے کہ حضرت
معاویہؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ میں سے کون افضل ہیں؟ سوال کرنے والے نے ایک
جانب اس صحابی کو رکھا جس پر طرح طرح کے اعتراضات کئے گئے تھے، اور دوسری طرف
اس جلیل القدر تابعی کو، جس کی جلالت شان پر تمام امت کا اتفاق ہے، یہ سوال سن کر
عبداللہ ابن المبارکؓ غصہ میں آگئے اور فرمایا: تم ان دونوں کی آپس میں نسبت پوچھتے ہو،

۵۸ ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۸۳ ج ۳ مطبوعہ مصر، حافظ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ

ص ۱۳۹ ج ۸

۵۹ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹ ج ۸

خدا کی قسم! وہ مٹی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جماد کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کی ناک کے سوراخ میں چلی گئی، وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔^{۱۲}
اسی قسم کا سوال حضرت معافی بن عمرانؓ سے کیا گیا تو وہ بھی غضب ناک ہو گئے اور فرمایا: بھلا ایک تابعی کسی صحابی کے برابر ہو سکتا ہے؟ حضرت معاویہؓ نبی کریمؐ کے صحابی ہیں، ان کی بہن نبی کریمؐ کے عقد میں تھیں، انہوں نے وحی خداوندی کی کتابت کی اور حفاظت کی، بھلا ان کے مقام کو کوئی تابعی کیسے پہنچ سکتا ہے؟
اور پھر یہ حدیث پڑھ کر سنائی کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:

”جس نے میرے اصحاب اور رشتہ داروں کو برا بھلا کہا اس پر اللہ کی لعنت ہو“^{۱۳}

مشہور تابعی حضرت اسحاق بن قیسؒ اہل عرب میں بہت حلیم اور بردبار مشہور ہیں ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ بردبار کون ہے؟ آپ یا معاویہؓ؟ آپ نے فرمایا: بخدا میں نے تم سے بڑا جاہل کوئی نہیں دیکھا (حضرت معاویہؓ قدرت رکھتے ہوئے حلیم اور بردباری سے کام لیتے ہیں اور میں قدرت نہ رکھتے ہوئے بردباری کرتا ہوں، لہذا میں ان سے کیسے بڑھ سکتا ہوں؟ یا ان کے برابر کیسے ہو سکتا ہوں؟^{۱۴}

سوانح

جیسا کہ ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں، حضرت معاویہؓ کی ولادت بعثت نبویؐ سے پانچ سال قبل ہوئی اور آپ نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ شام وغیرہ کے علاقوں میں مصروف جماد رہے، اسی دوران آپ نے جنگ یمامہ میں شرکت کی، بعض مورخین کا خیال ہے کہ مدعی نبوت میلہ کذاب

^{۱۲} حوالہ مذکورہ بالا

^{۱۳} ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹ ج ۸ مطبوعہ مصر

^{۱۴} تاریخ طبری ص ۱۸ ج ۶ - الحدیث الفرید ص ۱۶۵ ج ۸ بحوالہ ”حضرت معاویہؓ“ مولفہ حکیم

کو آپ ہی نے قتل کیا تھا، مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت وحشیؓ نے نیزہ مارا تھا اور آپ نے اس کے قتل میں مدد کی تھی۔^{۳۷}

پھر حضرت عمرؓ کا دور آیا اور ۹ھ میں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے بھائی یزید بن ابی سفیانؓ کو جو اس وقت شام کے گورنر تھے، حکم دیا کہ ”تیساریہ“ کو فتح کرنے کے لئے جہاد کریں، ”تیساریہ“ روم کا مشہور شہر اور رومیوں کی فوجی چھاؤنی تھی، چنانچہ یزید بن ابی سفیانؓ نے شہر کا محاصرہ کر لیا، یہ محاصرہ طویل کھینچ گیا تو یزید بن ابی سفیانؓ آپ کو اپنا نائب مقرر کر کے دمشق چلے گئے، حضرت معاویہؓ نے ”تیساریہ“ کا محاصرہ جاری رکھا یہاں تک کہ شوال ۹ھ میں اسے فتح کر لیا، اس فتح کے ایک ماہ بعد ہی ذیقعدہ ۹ھ میں یزید بن ابی سفیانؓ طاعون کے مسلک مرض میں وفات پا گئے، حضرت عمرؓ کو ان کی موت کا بہت صدمہ ہوا اور کچھ عرصہ بعد آپ نے ان کے بھائی حضرت معاویہؓ کو شام کا گورنر بنا دیا اور آپ کا وظیفہ ایک ہزار درہم ماہانہ مقرر فرمایا، حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں آپ نے چار سال شام کے گورنر کی حیثیت سے گزارے، اس عرصے میں آپ نے روم کی سرحدوں پر جہاد جاری رکھا اور بہت سارے شہر فتح کئے۔^{۳۸}

حضرت عمرؓ فاروقؓ کی وفات کے بعد حضرت عثمانؓ غنیؓ نے آپ کو اس عہدہ پر نہ صرف باقی رکھا، بلکہ آپ کے حسن انتظام، تدبیر اور سیاست سے متاثر ہوتے ہوئے، محس، قسریں، اور فلسطین کے علاقے بھی آپ کے ماتحت کر دیئے، حضرت عثمانؓ غنیؓ کے دور خلافت میں کل بارہ سال یا اس سے کچھ زائد آپ نے گورنری حیثیت سے گزارے، اس عرصے میں بھی آپ، اعلیٰ کلمۃ اللہ کے واسطے جہاد میں مصروف رہے۔

۲۵ھ میں آپ نے روم کی جانب جہاد کیا اور عموریہ تک جانچنے اور راستے میں فوجی مرکز قائم کئے۔

^{۳۷} حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۱۷ ج ۸

^{۳۸} ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵ ج ۳: ودیکر کتب تاریخ

^{۳۹} علامہ ابن خلدون: تاریخ ابن خلدون ص ۳۶۷ ج ۱ مطبوعہ دارالکتب البلبانی بیروت ۱۹۵۶ء

^{۴۰} تاریخ ابن خلدون ص ۱۰۰۷ ج ۲ طبع بیروت

قبرص بحیرہ روم میں شام کے قریب ایک نہایت زرخیز اور خوب صورت جزیرہ ہے اور یورپ اور روم کی طرف سے مصر و شام کی فتح کا دروازہ ہے اس مقام کی بہت زیادہ اہمیت تھی کیونکہ مصر و شام جہاں اب اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا، ان کی حفاظت اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی، جب تک کہ بحری ناکہ مسلمانوں کے قبضے میں نہ آئے، اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ ہی سے آپ کی اس زرخیز، حسین اور اہم جزیرہ پر نظر تھی اور ان کے دور خلافت میں آپ ان سے قبرص پر لشکر کشی کی اجازت طلب کرتے رہے مگر حضرت عمرؓ نے سمندر کی مشکلات اور دوسری وجوہات کی بناء پر اجازت نہ دی، جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو آپ نے ان سے اجازت طلب کی اور اصرار کیا تو حضرت عثمانؓ نے اجازت دیدی اور آپ نے مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار بحری بیڑہ تیار کرایا اور صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ہمراہ ۳۷ء میں قبرص کی جانب روانہ ہوئے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں بحری بیڑہ کی تیاری اور بحری جنگ کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ ابن خلدون لکھتے ہیں: حضرت معاویہؓ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے بحری بیڑہ تیار کرایا اور مسلمانوں کو اس کے ذریعے جہاد کی اجازت دی۔ پہلی بار بحری بیڑہ تیار کرانا حضرت معاویہؓ کی محض ایک تاریخی خصوصیت ہی نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے نہایت عظیم سعادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا بحری جہاد کرنے والوں کے حق میں جنت کی بشارت دی تھی، چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرمایا ہے۔

اول حییش من امتی یغزون البحر فدا وجوا

میری امت کے پہلے لشکر نے جو بحری لڑائی لڑے گا، اپنے اوپر جنت واجب

کر لی ہے۔

کتبہ حافظ ذہبی: ۱، ج ۲۹، مطبع حکومت الکویت، ۱۹۶۰ء، ایضاً تاریخ ابن خلدون ص ۱۰۰۸ ج ۲ طبع

بیروت

۲۸ مقدمہ ابن خلدون: ص ۳۵۳ مطبوعہ بیروت

صحیح البخاری ص ۳۱۰ ج ۱ مطبوعہ نور محمد دہلی

۵۲۷ء میں آپ اس کی طرف اپنا بحری بیڑہ لے کر روانہ ہوئے اور ۵۲۸ھ میں وہ آپ کے ہاتھوں فتح ہو گیا اور آپ نے وہاں کے لوگوں پر جزیہ عائد کیا۔
 ۵۳۳ھ میں آپ نے افریقیہ، ملیت، اور روم کے کچھ قلعے فتح کیے۔
 ۵۳۵ھ میں غزوہ ذی شیبہ پیش آیا، اور آپ نے اس میں امیر لشکر کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔

۵۳۶ھ میں حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے، اور اس کے بعد جنگ صفین و جمل کے مشہور واقعات پیش آئے، آپ کا موقف اس سلسلہ میں یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کو ظلماً شہید کیا گیا ہے اس لئے قاتلوں سے قصاص لینے میں کسی قسم کی نرمی نہ برتی جائے، اور قاتلوں سے جو نرمی برتی جا رہی ہے، ان کو عہدوں پر مامور کیا جا رہا ہے اور وہ خلافت کے کاموں میں جو بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، اس سلسلہ کو ختم کیا جائے، چنانچہ البدایہ والنہایہ میں مذکور واقعہ سے آپ کے اس موقف کی مکمل وضاحت ہوتی ہے اور اس بے بنیاد الزام کی قلمی کھل جاتی ہے کہ آپ اقتدار کی خواہش کے لئے ایسا کر رہے تھے، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وقد ورد من غیر وجه ان ابامسلم الخولانی وجماعة معه دخلوا
 علی معاویة فقالوا له: انت تنار علی امامت مثله؟ فقال: واللہ
 انی لا علم انہ خیر منی وافضل واحق بالامر منی ولكن الستم
 تعلمون ان عثمان قتل مظلوماً وانا ابن عمه وانا اطلب بدعه
 وامره الی فقولوا له فلیسلم الی قتلة عثمان وانا اسلم له امره
 فانوا علیاً فکلموه فی ذلک فلم یدفع الیهم احداً فعند ذلک
 صمم اهل الشام علی القتال مع معاویة

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ مختلف سندوں سے ہم تک یہ بات پہنچی ہے

۱۔ جمال الدین یوسف: النجوم الزاهرة ص ۸۵ ج ۱ مطبوعہ مصر

۲۔ ابن خلدون: ص ۱۰۰۸ ج ۲ بیروت

۳۔ حافظ زہبی: الجبر ص ۳۳ ج ۱ مطبوعہ کویت

۴۔ جمال الدین یوسف: النجوم الزاهرة ص ۹۳ ج ۱

۵۔ حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۲۹ ج ۸ مطبوعہ مصر

کہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے اختلاف کے دوران، حضرت ابو مسلم خولانی لوگوں کی ایک جماعت کے ہمراہ حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے تاکہ ان کو حضرت علیؓ کی بیعت پر آمادہ کر سکیں، اور جا کر حضرت معاویہؓ سے کہا: تم علیؓ سے جھگڑ رہے ہو، کیا تمہارا خیال یہ ہے تم علم و فضل میں اس جیسے ہو؟ حضرت معاویہؓ نے جواب دیا: خدا کی قسم! میرا یہ خیال نہیں، میں جانتا ہوں کہ علیؓ مجھ سے بہتر ہیں، افضل ہیں اور خلافت کے بھی مجھ سے زیادہ مستحق ہیں، لیکن کیا تم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ عثمانؓ کو ظلماً شہید کیا گیا ہے اور میں ان کا چچا زاد بھائی ہوں اس لئے مجھے ان کے خون کا قصاص اور بدلہ لینے کا زیادہ حق ہے۔

تم جا کر حضرت علیؓ سے یہ بات کہو کہ قاتلین عثمان کو میرے سپرد کرو، میں خلافت کو ان کے سپرد کروں گا۔ یہ حضرات حضرت علیؓ کے پاس آئے، ان سے اس معاملہ میں بات کی، لیکن انہوں نے (ان معقول دلائل و اعذار کی بناء پر جو ان کے پاس تھے) قاتلین کو ان کے حوالہ نہیں کیا۔ اس موقع پر اہل شام نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس واقعہ کے بعد اس شہد اور بہتان کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ ذاتی نام و نمود اور اقتدار کی خواہش کے لئے ایسا کر رہے تھے۔

اس بات کا اندازہ اس ایمان افروز خط سے لگایا جاسکتا ہے جو حضرت معاویہؓ نے ان ہی اختلافات کے دوران قیصر روم کو تحریر فرمایا تھا، روم کے بادشاہ قیصر نے عین اس وقت جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف شباب پر تھا اور قتل و قتال کی نوبت آ رہی تھی، ان اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور شام کے سرحدی علاقوں پر لشکر کشی کرنے کا ارادہ کیا، حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع مل گئی، آپ نے اسے ایک خط بھجوایا اور اس میں لکھا:

مجھے اس بات کا علم ہوا ہے کہ تم سرحد پر لشکر کشی کرنا چاہتے ہو، یاد رکھو! اگر تم نے ایسا کیا تو میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے صلح کر لوں گا۔ اور ان کا جو لشکر تم سے لڑنے کے لئے روانہ ہوگا، اس کے ہر اول دستے میں شامل ہو کر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا کر رکھ دوں گا۔ جب یہ خط قیصر روم

کے پاس پہنچا تو وہ اپنے ارادہ سے باز آیا اور لشکر کشی سے رک گیا۔
کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ کفر کے مقابلہ میں اب بھی ایک جسم
وجان کی طرح ہیں اور ان کا اختلاف، سیاسی لیڈروں کا اختلاف نہیں
ہے۔

بہر حال یہ افسوسناک اختلاف اور قتال پیش آیا، اور دراصل اس میں بڑا ہاتھ ان
مفسدین کا تھا جو دونوں جانب غلط فہمیاں پھیلاتے اور جنگ کے شعلوں کو ہوا دیتے رہے۔
۳۷ھ میں صفور کے مہینہ میں واقعہ صفین پیش آیا۔ اس جنگ میں حضرت معاویہؓ کے
ہمراہ ستر ہزار آدمی شریک ہوئے جس میں صحابہ اور تابعین شامل تھے۔ آپ کے اور حضرت
علیؓ کے درمیان یہ جنگ چار پانچ سال تک جاری رہی۔
اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ شہید کر دیئے گئے، آپ پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا
اور آپ کو زخم آئے۔

حضرت علیؓ کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے سیدنا حسنؓ خلافت پر متمکن ہوئے جو
ابتداء ہی سے صلح جو اور مسلمانوں کے آپس کے قتال سے سخت متنفر تھے، شروع میں مفسدین
نے انہیں بھی بڑھکایا مگر وہ ان کے کہنے میں نہ آئے اور ۴۱ھ میں انہوں نے حضرت معاویہؓ
سے صلح کر کے خلافت آپ کے سپرد کی، آپ نے ان کے لئے سالانہ دس لاکھ درہم وظیفہ
مقرر کروایا۔

حضرت حسن بصریؒ، حضرت معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کے درمیان صلح کے واقعہ کو
بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

استقبل والله الحسن بن علی معاویة بكتائب امثال الجبال
فقال عمرو بن العاص انی لاری كتائب لانولی حتی یقبل

۱۷۰ تاج العروس ص ۲۰۸ ج ۷ ماہ صغلیں، مطبوعہ دار لیبیا، بنغازی

۱۷۱ حافظ ذہبی: اعراب ص ۳۸ ج ۱ مطبوعہ کویت

۱۷۲ حافظ ذہبی: اعراب ص ۴۰ ج ۱ مطبوعہ کویت

۱۷۳ ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۷۶ ج ۳ مطبوعہ مصر

۱۷۴ حافظ ذہبی: اعراب ص ۳۹ ج ۱ مطبوعہ کویت

اقرانها فقال له معاوية وكان والله خيرا الرجلين امي عمرو ان
قتل هؤلأ هؤلأ هؤلأ هؤلأ هؤلأ هؤلأ هؤلأ هؤلأ هؤلأ هؤلأ هؤلأ هؤلأ
من لى بنسائهم؟ من لى بضيعتهم؟

کہ سیدنا حسنؓ، پناہ جیسے لشکر لے کر حضرت معاویہؓ کے مقابلہ پر سامنے
آئے تو حضرت عمرو بن العاصؓ حضرت معاویہؓ سے کہنے لگے:
میں لشکروں کو دیکھ رہا ہوں کہ بغیر قتل عظیم کے واپس نہ لوٹیں گے۔
(یعنی قتال عظیم ہو گا) تو حضرت معاویہؓ فرماتے گئے :

بتلاؤ! اگر انہوں نے انہیں قتل کیا اور ان لوگوں نے ان کو قتل کیا تو
مسلمانوں کے معاملات کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ان کی عورتوں کی
رکھوالی کی ضمانت کون دے گا؟ اور یتیم بچوں اور مال و متاع کا ضامن کون
ہو گا؟

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے دل میں قوم و ملت کا کتنا درد تھا اور وہ
مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو قطعی بری نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کے علاوہ علامہ ابن خلدون
نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے صلح کا ارادہ کیا تو ایک سفید کاغذ
منگوایا اور اس کے آخر میں اپنی مر لگائی اور کاغذ حضرت حسنؓ کے پاس روانہ فرما کر کہلا بھیجا
کہ یہ سفید کاغذ آپ کی طرف بھیج رہا ہوں اور اس کے آخر میں میں نے اپنی مر لگادی ہے،
آپ جو چاہیں شرمیں تحریر فرمادیں مجھے منظور ہیں چنانچہ حضرت حسنؓ نے کچھ شرمیں لکھ
دیں اور اس طرح ۴۱ھ میں آپ کے اور حضرت حسنؓ کے درمیان صلح ہو گئی اور تمام
مسلمانوں نے متفقہ طور آپ کو خلیفہ مقرر کر کے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، اس سال کو
تاریخ عرب میں عام الجماعۃ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کہ یہ وہ سال ہے کہ جس میں امت کا
منتشر شیرازہ پھر مجتمع ہو گیا اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے ایک خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔
علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: کہ جب حضرت حسنؓ صلح کر کے مدینہ تشریف لائے تو ایک

۴۹ جمع الفتاویٰ ص ۸۳۳ طبع مدینہ منورہ، صحیح البخاری ص ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴ ج ۱ مطبوعہ نور محمد دہلی

۵۰ مقدمہ ابن خلدون ص ۳۷۵ طبع بیروت

شخص نے حضرت معاویہؓ سے صلح کرنے پر آپ کو برا بھلا کہا تو آپ نے فرمایا:

لَا نَقُلُ ذَلِكَ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
يَقُولُ لَا تَذْهَبُ الْإِيَّامُ وَاللَّيَالِي حَتَّى يَمْلِكَ مَعَاوِيَةَ

مجھے برا بھلا مت کہو، کیوں کہ میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ رات
اور دن کی گردش اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک کہ معاویہؓ امیر نہ
ہو جائیں گے۔^{۵۱}

حضرت معاویہؓ کے امیر المؤمنین ہوجانے کے بعد جہاد کا وہ سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا،
جو حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد بند ہو گیا تھا، آپ نے اہل روم سے جہاد کیا، آپ نے
اہل روم کے خلاف سولہ جنگیں لڑیں، آپ نے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک
حصہ کو آپ گرمی کے موسم میں جہاد کے لئے روانہ فرمادیتے تھے، پھر جب سردیوں کا موسم
آتا تو آپ دوسرا تازہ دم حصہ جہاد کے لئے بھیجتے تھے، آپ کی آخری وصیت بھی یہ تھی:

شَدَّ حَنَاقَ الرُّومِ

”روم کا گلا گھونٹ دو۔“^{۵۲}

۳۹ھ میں آپ نے قسطنطینیہ کی جانب زبردست لشکر روانہ کیا جس کا سپہ سالار سفیان
بن عوف کو مقرر کیا گیا۔^{۵۳} اس لشکر میں اجلہ صحابہ کرام شریک تھے، اور یہی وہ غزوہ ہے جس کی
نبی کریمؐ نے اپنی حیات میں ہی عیاشن گوئی فرمادی تھی، اور اس میں شریک ہونے والوں کے
متعلق فرمایا تھا:

أُولَئِكَ جِيشٌ يَغْزُوا الْقِسْطَنطينِيَّةَ مَعْفُورٍ لَّهُمْ

پہلا لشکر جو قسطنطینیہ کا جہاد کرے گا ان کو بخش دیا جائے گا۔^{۵۴}

آپ ہی کے دور خلافت میں مقلید کے عظیم الشان جزیرہ پر مسلمانوں نے فوج کشی کی

^{۵۱} حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۱ ج ۸ مطبوعہ مصر

^{۵۲} ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸

^{۵۳} السنن بحدیث: النجوم الزاهرة ص ۱۳۳ ج ۱

^{۵۴} حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۷ ج ۸

اور کثیر تعداد میں 'مال غنیمت' مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ نیز آپ ہی کے زمانے میں
بجستان سے کابل تک کا علاقہ فتح ہوا اور سوڈان کا پورا ملک اسلامی حکومت کے زیرِ تکلیف
آ گیا۔ ۵۶

ذیل میں ان غزوات کا ایک انتہائی اجمالی خاکہ پیش خدمت ہے جو حضرت معاویہؓ کے
عہد حکومت میں پیش آئے۔
اس سے قبل حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہؓ ایک طویل
عرصہ تک شام کے گورنر رہے، اس دوران انہوں نے رومی نصرائیوں کے خلاف بہت سے
جہاد کئے، وہ سب ان کے علاوہ ہیں۔

غزوات

- ۵۲۷ اس سال آپ بحری بیڑہ لے کر قبرص کی جانب بڑھے، مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی
بحری جنگ تھی۔
۵۲۸ قبرص کا عظیم الشان جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گیا۔
۵۳۲ اس سال حضرت معاویہؓ نے قسطنطنیہ کے قریب کے علاقوں میں جہاد جاری رکھا۔
۵۳۳ الفونطیہ، ملیہ اور روم کے کچھ قلعے فتح ہو گئے۔
۵۳۵ آپ کی قیادت میں غزوہ ذی شیبہ پیش آیا۔
۵۳۶ غزوہ بجستان پیش آیا اور سندھ کا کچھ حصہ مسلمانوں کے زیرِ تکلیف آ گیا۔
۵۳۷ ملک سوڈان فتح ہوا اور بجستان کا مزید علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔
۵۳۸ کابل فتح ہوا اور مسلمان ہندوستان میں قدامتیل کے مقام تک پہنچ گئے۔
۵۴۵ افریقہ پر لشکر کشی کی گئی اور ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے زیرِ تکلیف آیا۔

۵۵ مقدمہ ابن خلدون: ص ۳۵۴ مطبوعہ بیروت

۵۶ ابن حزم: جوامع السیرة ص ۳۳۸، ایضاً سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۱۳۹ طبع نور محمد

۵۷ اس نقشہ کے حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو: حافظ ذہبی: المعبر فی خبر من فبرج مطبوعہ کویت ۱۹۶۰ء

دیگر کتب تاریخ

۵۳۶ھ متلیہ (سلی) پر پہلی بار حملہ کیا گیا اور کثیر تعداد میں مال غنیمت مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔

۵۳۷ھ افریقہ کے مزید علاقوں میں غزوات جاری رہے۔

۵۵۰ھ غزوہ قسطنطنیہ پیش آیا، یہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ تھا۔

۵۵۳ھ مسلمان شہر جیچون کو عبور کرتے ہوئے بخارا تک جا پہنچے۔

۵۵۶ھ غزوہ سرقد پیش آیا۔

سیرت

آپ ایک وجیہ اور خوبصورت انسان تھے، رنگ گورا تھا اور چہرہ پروقار اور بروباری تھی۔ حضرت مسلمؓ فرماتے ہیں کہ معاویہؓ ہمارے پاس آئے اور وہ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور حسین تھے۔ اس ظاہری حسن و جمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سیرت کی خوبیوں سے بھی نوازا تھا، چنانچہ ایک بہترین عادل حکمراں میں جو اوصاف ہو سکتے ہیں وہ آپ کی ذات میں موجود تھے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:

”تم قیصر و کسریٰ اور ان کی سیاست کی تعریف کرتے ہو حالانکہ تم میں معاویہؓ موجود ہیں“

حکمران کی حیثیت سے

حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ ہوا، حضرت عثمانؓ کے زمانے سے باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے فتوحات کا سلسلہ رک گیا تھا، آپ کے عہد حکومت میں یہ سلسلہ پوری قوت کے ساتھ جاری ہو گیا، حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کے زمانے

۵۷ ابن حجرۃ الاصابہ، البدایہ والنہایہ، ابن اثیر وغیرہ

۵۸ مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۵ ج ۹

۵۹ ابن طباطبائی: الغزوی ص ۱۲۹

ہی میں بحری فوج قائم کر لی تھی اور عبداللہ بن قیس حارثی کو اس کا افسر مقرر کیا تھا، اپنے عہد حکومت میں انہوں نے بحری فوج کو بہت ترقی دی، مصر و شام کے ساحلی علاقوں میں بہت سے جہاز سازی کے کارخانے قائم کئے چنانچہ ایک ہزار سات سو جنگی جہاز رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، بحری فوج کے کمانڈر جنادہ بن ابی امیہ تھے، اس عظیم الشان بحری طاقت سے آپ نے قبرص، رودس جیسے اہم یونانی جزیرے فتح کئے اور اسی بحری بیڑہ سے قسطنطنیہ کے حملہ میں بھی کام لیا۔

ڈاک کا محکمہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں قائم ہو چکا تھا آپ نے اس کی تنظیم و توسیع کی اور تمام حدود سلطنت میں اس کا جال پھیلا دیا۔

آپ نے ایک نیا محکمہ دیوانِ خاتم کے نام سے بھی قائم کیا۔
نیز آپ نے خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے متعدد غلام مقرر فرمائے اور دیبا و حریر کا بہترین غلاف بیت اللہ پر پڑھایا۔

آپ اکتالیس سال امیر رہے، حافظ ابن کثیرؒ آپ کے عہد حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واجمعت الرعايا على بيعتي سنة احدى واربعين كما قدمنا
فلم يزل مستقلاً بالامر في هنة الملة التي هذت السنة التي
كانت فيها وفاته، والجهاد في بلاد العدو وقائم وكلمة الله
عالية والغنائم ترد اليه من اطراف الارض، والمسلمون معه
في راحة وعيد وصفح وعفو.

آپ کے دور حکومت میں جہاد کا سلسلہ قائم رہا، اللہ کا کلمہ بلند ہوتا رہا اور
مال غنیمت، سلطنت کے اطراف سے بیت المال میں آتا رہا، اور مسلمانوں
نے راحت و آرام اور عدل و انصاف سے زندگی بسر کی۔

آپ تالیف قلب، عدل و انصاف اور حقوق کی ادائیگی میں خاص احتیاط برتتے تھے۔

۱؎ حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۸۳ ج ۸

۲؎ حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۸۹ ج ۸

۳؎ ابن تیمیہ: منهاج السنۃ ص ۲۸۳ ج ۲

اسی وجہ سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

ما رأيت أحداً بعد عثمان أفضى بحق من صاحب هذا الباب
کہ میں نے حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت معاویہؓ سے بڑھ کر کسی کو حق کا
فیصلہ کرنے والا نہ پایا۔^{۳۲}
حضرت ابوالخنیف السہمیؒ فرمایا کرتے تھے:
”اگر تم حضرت معاویہؓ کو دیکھتے یا ان کا زمانہ پالیتے تو (عدل و انصاف کی وجہ
سے) تم ان کو مدعی کہتے۔“^{۳۳}

اور حضرت مجاہدؒ سے بھی منقول ہے کہ وہ فرماتے:
اگر تم معاویہؓ کے دور کو پالیتے تو کہتے کہ مدعی تو یہ ہیں۔^{۳۴}
اسی طرح ایک بار امام اعظمؒ کی مجلس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا تذکرہ ہوا تو امام
اعظمؒ فرماتے گئے:

اگر تم حضرت معاویہؓ کے زمانے کو پالیتے تو تمہیں پتہ چل جاتا، لوگوں نے
پوچھا ان کے علم اور ہردیاری کا؟ فرمایا: نہیں! بلکہ ان کے عدل و انصاف
کا۔^{۳۵}

آپ کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے حضرت امام اعظمؒ آپ کو ”المصنف“ کے نام سے
یاد کرتے تھے۔^{۳۶}

آپ کا دور حکومت ہر اعتبار سے ایک کامیاب دور شمار کیا جاتا ہے۔ آپ کے دور میں
مسلمان خوش حال رہے اور انہوں نے امن و چین کی زندگی گزاری، آپ نے رعایا کی بہتری

^{۳۲} حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸

^{۳۳} حوالہ مذکورہ بالا۔

^{۳۴} العواصم من القواصم ص ۲۰۵

^{۳۵} حوالہ مذکورہ بالا

^{۳۶} قاضی ابوبکر بن عربی: العواصم من القواصم ص ۲۱۰

اور دیکھ بھال کے لئے متعدد اقدامات کئے؛ جن میں سے ایک انتظام آپ نے یہ کیا کہ ہر قبیلہ اور قصبہ میں آدمی مقرر کئے جو ہر خاندان میں گشت کر کے یہ معلوم کرتے کہ کوئی بچہ تو پیدا نہیں ہوا؟ یا کوئی مسمان باہر سے آکر تو یہاں نہیں ٹھہرا؟ اگر کسی بچے کی پیدائش یا کسی مسمان کی آمد کا علم ہوتا تو اس کا نام لکھ لیتے اور پھر بیت المال سے اس کے لئے وظیفہ جاری کر دیا جاتا تھا۔^{۱۷۶}

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الادب المفرد میں بیان کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حکم دیا تھا کہ دمشق کے غنڈوں اور بد معاشوں کی فہرست بنا کر مجھے بھیجی جائے اس کے علاوہ آپ نے رفاہ عامہ کے لئے سرس کھدوائیں؛ جو سرس بند ہو چکی تھیں انہیں جاری کروایا مساجد تعمیر کرائیں اور عامۃ المسلمین کی بھلائی اور بہتری کے لئے اور کئی دوسرے اقدامات کئے۔ آپ کے ان اقدامات کی وجہ سے عوام بھی آپ سے محبت کرتے تھے اور آپ پر جان نثار کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

كانت سيرة معاوية مع رعيتيه من خيار امير الولاية وكان
رعيتيه يحيونه؛ وقد ثبت في الصحيحين عن النبي صلى الله
عليه وسلم انه قال خيارا منكم النون نجونهم ويحيونكم و
نصلون عليهم ويصلون عليكم^{۱۷۷}
حضرت معاویہؓ کا برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ بہترین حکمران کا برتاؤ تھا اور
آپ کی رعایا آپ سے محبت کرتی تھی اور صحیحین بخاری و مسلم میں یہ
حدیث ثابت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: تمہارے امراء میں سب سے بہتر
امیر وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے اور تم ان پر رحمت
بھیجتے ہو اور وہ تم پر۔

یہی وجہ تھی کہ اہل شام آپ پر جان چھڑکتے تھے اور آپ کے ہر حکم کی دل و جان سے

^{۱۷۶} ابن تیمیہ: منہاج السنۃ ص ۱۸۵ ج ۳

^{۱۷۷} امام بخاریؒ: الادب المفرد ص ۵۵۲ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی

^{۱۷۸} ابن تیمیہؒ: منہاج السنۃ ص ۱۸۹ ج ۳

تعمیل کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے اپنے لشکریوں سے مخاطب ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا:

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ معاویہؓ آکھڑ جاہلوں کو بلاتے ہیں تو وہ بغیر عطیہ اور داؤد و ہش کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور سال میں دو تین بار جہد ہرچاہیں ادھر انہیں لے جاتے ہیں اور میں تمہیں بلا تا ہوں، حالانکہ تم لوگ عقل مند ہو، اور عطیات پاتے رہتے ہو مگر تم میری نافرمانی کرتے ہو، میرے خلاف کھڑے ہو جاتے ہو، اور میری مخالفت کرتے رہتے ہو۔^{۱۱}

آپ کی رعایا کے آپ پر فدا ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آپ رعایا کے ایک ادنیٰ فرد کی مصیبت اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کرتے تھے اور ان کی تکلیف دور کرنے میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑتے تھے۔ چنانچہ ایک واقعہ سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت ثابت جو ابوسفیانؓ کے آزاد کردہ غلام تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں روم کے ایک غزوہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ شریک تھا، جنگ کے دوران ایک عام سپاہی اپنی سواری سے گر پڑا اور اٹھ نہ سکا تو اس نے لوگوں کو مدد کے لئے پکارا، سب سے پہلے جو شخص اپنی سواری سے اتر کر اس کی مدد کو دوڑا وہ حضرت معاویہؓ تھے۔^{۱۲} آپ کے ان اوصاف اور آپ کے دور حکومت کی ان خصوصیات کا اعتراف عام مؤرخین کے علاوہ خود شیعہ مؤرخین کو بھی کرنا پڑا۔ چنانچہ شیعہ مؤرخ امیر علی لکھتے ہیں:

”مجموعی طور پر حضرت معاویہؓ کی حکومت اندرون ملک بڑی خوشحال اور پر امن تھی اور خارجہ پالیسی کے لحاظ سے بڑی کامیاب تھی۔“^{۱۳}

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ عام مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی لیتے، ان کی شکایات کو بغور سنتے اور پھر حتی الامکان انہیں دور فرماتے تھے۔

۱۱ تاریخ طبری ص ۱۳۸ ج ۵

۱۲ مجمع الزوائد منبع الفوائد ص ۳۵۷ ج ۹

۱۳ بحوالہ حضرت معاویہؓ: مولفہ حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹی

حضرت معاویہؓ کے روزمرہ کے معمولات

مشہور مؤرخ مسعودی نے آپ کے دن بھر کے اوقات کا تفصیلی نقشہ کھینچا ہے۔
مسعودی لکھتے ہیں:

آپ فجر کی نماز ادا کر کے زیر سلطنت ممالک سے آئی ہوئی رپورٹیں سنتے پھر قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے اور تلاوت کے بعد گھر تشریف لے جاتے اور وہاں ضروری احکامات جاری کرتے پھر نماز اشراق ادا کر کے باہر تشریف لاتے اور خاص خاص لوگوں کو طلب فرماتے اور ان کے ساتھ دن بھر کے ضروری امور کے متعلق مشورہ کرتے اس کے بعد ناشتہ لایا جاتا جو رات کے بیچ ہوئے کھانے میں سے ہوتا۔ پھر آپ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے اور اس کے بعد گھر تشریف لے جاتے۔ تھوڑی دیر بعد باہر تشریف لاتے اور مسجد میں مقصورہ سے کمر لگا کر کسی پر بیٹھ جاتے اس وقت میں عام مسلمان جن میں کمزور، دیہاتی بچے، عورتیں سب شامل ہوتے، آپ کے پاس آتے اور اپنی ضرورتیں تکلیفیں بیان کرتے تھے، آپ ان سب کی دل دہانی کرتے، ضرورتیں پوری فرماتے، اور ان کی تکلیفوں کو دور کرتے تھے۔ جب تمام لوگ اپنی حاجتیں بیان کر لیتے اور آپ ان کے متعلق احکام جاری فرما دیتے اور کوئی باقی نہ بچتا تو آپ اندر تشریف لے جاتے اور وہاں خاص خاص لوگوں، معززین اور اشراف قوم سے ملاقات فرماتے، آپ ان سے کہتے:

”حضرات! آپ کو اشراف قوم اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ کو اس مجلس

خصوصی میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہے، لہذا آپ کا فرض ہے جو

لوگ یہاں حاضر نہیں ہیں ان کی ضرورتیں بیان کریں۔“

وہ ضرورتیں بیان کرتے اور آپ ان کو پورا فرماتے پھر دوپہر کا کھانا لایا جاتا اور اس وقت کاتب بھی حاضر ہوتا وہ آپ کے سرہانے کھڑا ہو جاتا اور باریاب ہونے والوں کو ایک ایک کر کے پیش کرتا اور جو کچھ وہ اپنی مشکلات اور معروضات تحریر کر کے لاتے، آپ کو پڑھ کر سنا تا رہتا آپ کھانا کھاتے جاتے اور احکام لکھواتے جاتے تھے اور ہر باریاب ہونے والا شخص جب تک حاضر رہتا کھانے میں شریک رہتا، پھر آپ گھر تشریف لے جاتے اور ظہر کی

۱۰ یا رہے کہ یہ مشہور متعصب معزنی مؤرخ ہیں

نماز کے وقت تشریف لاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد خاص مجلس ہوتی جس میں وزراء سے ملکی اور کے متعلق مشورہ ہوتا اور احکامات جاری ہوتے۔ یہ مجلس عصر تک جاری رہتی، آپؓ عصر کی نماز ادا کرتے اور پھر عشاء کے وقت تک مختلف امور میں مشغول رہتے، عشاء کی نماز کے بعد امراء سے امور سلطنت پر گفتگو ہوتی۔ یہ گفتگو ختم ہوتی تو علمی مباحث چھڑ جاتے اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا۔ مسعودی کا بیان ہے کہ آپ نے دن میں پانچ اوقات ایسے رکھے ہوئے تھے جن میں لوگوں کو عام اجازت تھی کہ وہ آئیں اور اپنی شکایات بیان کریں۔

حلم، بردباری اور نرم خوئی

آپ اس دو وجہ کے حلیم اور بردبار تھے کہ آپ کا حلم ضرب المثل بن گیا، اور آپ کے تذکرہ کے ساتھ حلم کا تصور اتنا لازم ہو گیا کہ بغیر اس کے آپ کا تذکرہ نامکمل ہے، آپ کے مخالفین آپ کے پاس آتے اور بسا اوقات انتہائی نازیبا رویہ اور سخت کلامی کے ساتھ پیش آتے، مگر آپؓ اسے ہنسی میں ٹال دیتے، یہی وہ رویہ تھا جس نے بڑے بڑے سرداروں اور آپ کے مخالفوں کو آپ کے سامنے سر جھکا کے پر بخور کر دیا، چنانچہ حضرت قبیصہ بن جابر کا قول ہے کہ:

”میں نے حضرت معاویہؓ سے بڑھ کر کسی کو بردبار نہیں پایا“^{۴۳}

ابن عون کا بیان ہے کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ایک عالم آدمی کھڑا ہوتا اور ان سے کہتا: اے معاویہؓ! تم ہمارے ساتھ ٹھیک ہو جاؤ ورنہ ہم تمہیں سیدھا کر دیں گے، اور سیدنا معاویہؓ فرماتے: بھلا کس چیز سے سیدھا کرو گے؟ تو وہ جواب میں کہتا کہ لکڑی سے، آپ فرماتے: اچھا! پھر ہم ٹھیک ہو جائیں گے۔^{۴۴}

حضرت مسورہ کا واقعہ مشہور ہے کہ شروع میں آپ کے مخالف تھے پھر وہ آپ کے پاس

^{۴۳} ملخص از مسعودی: مروج الذهب بما مش کامل ابن اثیر ص ۱۰۳ تا ۱۰۵ ج ۶

^{۴۴} النجوم الزاهرة ص ۶۳ ج ۱

^{۴۵} حافظ ذہبی: تاریخ الاسلام ص ۳۲۳ ج ۲

اپنی کسی حاجت سے آئے“ آپ نے وہ حاجت پوری کی، پھر انہیں بلایا اور فرمایا:
اے مسور! تم ہم پر کیا کچھ طعن و تشنیع کرتے رہے ہو؟
حضرت مسور نے جواب دیا: اے امیر المؤمنین! جو کچھ ہوا اسے بھول جائیے۔
آپ نے فرمایا: نہیں! وہ سب باتیں جو تم میرے متعلق کہا کرتے تھے بیان
کرو۔

چنانچہ حضرت مسور نے وہ تمام باتیں آپ کے سامنے دہرائیں جو وہ آپ کے متعلق
کہا کرتے تھے، آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ تمام الزامات کو سنا اور ان کا جواب دیا، آپ
کے اس رویہ کا اثر یہ ہوا کہ اس واقعہ کے بعد حضرت مسور جب بھی حضرت معاویہؓ کا ذکر
کرتے بہترین الفاظ میں کرتے اور ان کے لئے دعائے خیر کیا کرتے تھے۔
آپ کے علم اور بردباری کے واقعات، کتب تاریخ میں بھرے پڑے ہیں۔ منہ پھٹ
لوگ اور مخالفین آتے اور جس طرح منہ میں آتا، شکایتیں پیش کرتے مگر آپ انتہائی برد
باری سے کام لیتے، ان کی شکایات سنتے، ان کی تکلیفوں کو حتی الامکان دور کرتے اور ان کو
انعامات سے نوازتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ جب وہ آپ کی مجلس سے اٹھتے تو آپ کے گرویدہ
ہو کر مجلس سے باہر آتے، خود حضرت معاویہؓ کا قول ہے کہ:

غصہ کے پنی جانے میں جو مزہ مجھے ملتا ہے وہ کسی شے میں نہیں ملتا۔
مگر یہ سب علم اور بردباری اس وقت تک ہوتی جب تک کہ دین اور سلطنت کے
امور پر زور نہ پڑتی ہو اسی وجہ سے اگر کہیں سختی کرنے کا موقعہ ہوتا تو سختی بھی فرماتے اور
اصولوں پر کسی قسم کی عداوت برداشت نہ کرتے۔ چنانچہ آپ کا قول ہے:

انی لا احوال بین الناس و بین السننہم مالہم یحولوا بیننا و
بین ملکنا۔^۹

کہ میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک حائل نہیں

۹ خطیب بغدادی: تاریخ بغداد ص ۲۰۸ ج ۱ مطبوعہ بیروت

۱۰ تاریخ طبری ص ۱۵۷ ج ۲ مطبوعہ حیدرآباد دکن

۱۱ ابن اثیر: تاریخ کامل ص ۵ ج ۳

ہوتا جب تک کہ وہ ہمارے اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہونے لگیں۔“

اسی طرح ایک اور موقع پر حضرت معاویہؓ اصول سیاست بیان کرتے ہوئے فرماتے:

”جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں کھوار کام میں نہیں لاتا، جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا، اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر تعلق بھی قائم ہو اسے قطع نہیں ہوتے دیتا، جب لوگ اسے کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دیتا ہوں، اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں۔“

عفو و درگزر اور حسن اخلاق

حق تعالیٰ نے آپ کو دیگر صفات محمودہ کے علاوہ حسن خلق اور عفو و درگزر کی اعلیٰ صفات سے بھی نوازا تھا، ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مخالفین اور جملاء آپ کے پاس آتے، بدتمیزی کے ساتھ پیش آتے اور آپ بلند حوصلگی سے کام لے کر درگزر کرتے، اس سلسلہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا، جس سے حضرت معاویہؓ کے صبر و تحمل، فداکاری اور اطاعت رسول پر روشنی پڑتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بابرکات میں حضرت وائل بن حجرؓ جو ”حضرت موت“ کے بادشاہ کے بیٹے تھے، آپ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لئے حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد کچھ روز آپ کے پاس مقیم رہے، جب وہ واپس ہونے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو کسی ضرورت کی وجہ سے ان کے ساتھ کر دیا، حضرت معاویہؓ ساتھ ہوئے۔ یہ پیدل تھے اور وائل بن حجرؓ اونٹ پر سوار۔ حضرت وائلؓ خاندانی شہزادے تھے اور نئے نئے اسلام لائے تھے، اس لئے شہزادگی کی خوبی ابھی باقی تھی اس لئے انہوں نے حضرت معاویہؓ کو ساتھ بٹھانا گوارا نہ کیا، کچھ دور تک تو حضرت معاویہؓ پیدل چلتے رہے مگر عرب کی صحرائی گرمی، الامان والحفیظ! جب پاؤں تپتی ہوئی

ریت میں جھلنے لگے تو تنگ آکر حضرت وائلؓ سے گرمی کی شکایت کی اور کہا کہ نہ مجھے بھی اپنے ساتھ سوار کر لیجئے، مگر وہ شہزادگی کی شان میں تھے، کہنے لگے ”یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں تمہیں سوار کر لوں تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو بادشاہوں کے ساتھ سوار ہو سکتے ہو۔“

حضرت معاویہؓ نے کہا: اچھا! اپنے جوتے ہی دے دیجئے کہ ریت کی گرمی سے کچھ بچ جاؤں، مگر انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا اور کہنے لگے:

تمہارے لئے بس اتنا شرف کافی ہے کہ میری اونٹنی کا جو سایہ زمین پر پڑ رہا ہے اس پر پاؤں رکھ کر چلتے رہو، مختصر یہ کہ انہوں نے نہ حضرت معاویہؓ کو سوار ہونے دیا اور نہ اس قیامت خیز گرمی سے بچنے کا کوئی اور انتظام کیا۔ اور سارا راستہ حضرت معاویہؓ نے پیدل طے کیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ بھی خاندانی اعتبار سے کچھ کم رتبہ نہیں تھے وہ بھی سردار قریش کے بیٹے تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت کے لئے پیشانی پر شکن لائے بغیر ان کے ساتھ چلے رہے۔

مگر یہی وائل بن حجرؓ حضرت معاویہؓ کے پاس اس وقت آتے ہیں جب وہ خلیفہ بن چکے ہیں تو حضرت معاویہؓ انہیں پہچانتے ہیں اور وہ سارا واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ سب کچھ بھلا کر ان کی بھرپور مہمانداری کرتے ہیں اور ان کے ساتھ انتہائی عزت و اکرام کا برتاؤ کرتے ہیں، اس واقعہ سے آپ کے اخلاق کریمانہ، بلند حوصلگی اور عنودر گذر کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عشق نبویؐ

آپ کو سرکارِ دو عالمؐ سے گہرا تعلق اور عشق تھا، ایک مرتبہ آپ کو پتہ چلا کہ بصرہ میں ایک شخص ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت مشابہت رکھتا ہے، آپ نے وہاں کے گورنر کو خط لکھا کہ تم فوراً اسے عزت و اکرام کے ساتھ یہاں روانہ کرو، چنانچہ

۱۵ ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۶۰۵ ج ۳ مطبوعہ مصر: ایضاً تاریخ ابن خلدون ص ۸۳۵

ج ۲ مطبوعہ بیروت

اسے عزت و اکرام کے ساتھ لایا گیا۔ آپ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا، اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کو انعامات اور خلعت سے نوازا۔^{۲۴}

اسی عشق رسولؐ کی بناء پر آپ نے سرکارِ دو جہاں کے کئے ہوئے ناخن، ایک کپڑا اور بال مبارک سنبھال کر حفاظت کے ساتھ رکھے ہوئے تھے جن کے متعلق آپ نے اپنی وفات کے وقت وصیت کی کہ انہیں میری ناک، کان اور آنکھوں میں رکھ کر مجھے دفن دیا جائے۔^{۲۵} اسی طرح وہ چادر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن زہیرؓ کو ان کا قصیدہ سن کر مرحمت فرمائی تھی اسے آپ نے رقم دے کر حاصل کیا تھا۔^{۲۶}

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی تعلق کی وجہ سے آپ کی بہت سی اداؤں میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کی جھلک پائی جاتی تھی، چنانچہ حضرت ابوالدرداء فرمایا کرتے تھے۔

کہ میں نے نماز پڑھنے میں کسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

اتنا مشابہ نہیں پایا، جتنے حضرت معاویہؓ آپ سے مشابہ تھے۔^{۲۷}

یہی عشق رسولؐ تھا جس کی وجہ سے آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کو دل و جان سے قبول کرتے تھے۔

حضرت جبہ بن حمم بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں حضرت معاویہؓ کی خلافت کے دوران ان کے پاس گیا تو دیکھا کہ گلے میں رسی پڑی ہوئی ہے جسے ایک بچہ کھینچ رہا ہے اور آپ اس سے کھیل رہے ہیں، جبہ بن حمم کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: اے امیر المؤمنین! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا ”یہ یوقوف چپ رہو! میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر کسی کے پاس بچہ ہو تو وہ بھی بچوں کی سی حرکتیں کر لیا کرے تاکہ بچہ خوش ہو جائے۔“^{۲۸}

^{۲۴} التہجد ص ۷۷

^{۲۵} ابن اثیر: تاریخ کامل ص ۳۰۳۔ ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاسابہ ص ۳۸۰ ج ۳

^{۲۶} تاریخ ابن خلدون ص ۸۱۸ ج ۲ طبع بیروت

^{۲۷} مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۷ ج ۹ ۱۵ سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۱۵۳

اطاعت پیغمبرؐ

اطاعت رسول کی ایک نادر مثال وہ واقعہ ہے جو مہکوة شریف میں منقول ہے کہ حضرت معاویہؓ اور اہل روم کے درمیان ایک مرتبہ صلح کا معاہدہ ہوا، صلح کی مدت کے دوران آپ اپنی فوجوں کو روم کی سرحدوں پر جمع کرتے رہے، مقصد یہ تھا کہ جو نئی مدت معاہدہ ختم ہوگی فوراً حملہ کر دیا جائے گا، رومی حکام اس خیال میں ہوں گے کہ ابھی تو مدت ختم ہوئی ہے اتنی جلدی مسلمانوں کا ہم تک پہنچنا ممکن نہیں، اس لئے وہ حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اور اس طرح فتح آسان ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جیسے ہی مدت پوری ہوئی، آپ نے پوری قوت سے رومیوں پر یلغار کر دی وہ لوگ اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لائے، اور پسپا ہونے لگے، آپ روم کا علاقہ فتح کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ ایک صحابی حضرت عمرو بن عبدالمطلبؓ پکارتے ہوئے آئے: "وفاء لاغند" مومن کا شیوہ وفا ہے غدر و خیانت نہیں،

آپ نے پوچھا: کیا بات ہے؟

وہ کہنے لگے: میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جب دو قوموں کے درمیان کوئی صلح کا معاہدہ ہو تو اس معاہدہ کی مدت میں نہ تو کوئی فریق عہد کھولے نہ باندھے (یعنی اس میں کوئی تغیر نہ کرے) یہاں تک کہ مدت گزر جائے۔"

حضرت عمرو بن عبدالمطلبؓ کا مقصد یہ تھا کہ اس حدیث کی رو سے جنگ بندی کے دوران جس طرح حملہ کرنا ناجائز ہے اسی طرح دشمن کے خلاف فوجوں کو لے کر روانہ ہونا بھی جائز نہیں، چنانچہ جب حضرت معاویہؓ نے سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنا تو فوراً حکم دیا کہ فوجیں واپس ہو جائیں، چنانچہ پورا لشکر واپس ہو گیا اور جو علاقہ فتح ہو چکا تھا اسے بھی خالی کر دیا گیا۔ ایفاء عہد کی یہ حیرت انگیز مثال شاید ہی کسی اور قوم کے پاس ہو کہ عین اس وقت جبکہ تمام فوجیں فتح کے نشہ میں چور ہوں، صرف ایک جملہ سن کر سارا علاقہ خالی کرنے کا حکم دیدیا، اور لشکر کا ایک ایک فرد کسی جیل و حجت کے بغیر فوراً واپس لوٹ گیا۔

اسی طرح ایک بار حضرت ابو مریم الازدیؓ آپ کے پاس گئے، آپ نے پوچھا کیسے آنا

ہوا؟

کہنے لگے! میں نے ایک حدیث سنی ہے وہ آپ کو سنانے آیا ہوں اور وہ حدیث یہ ہے کہ میں نے نبی کریمؐ کو یہ کہتے سنا، آپ فرما رہے تھے کہ جس شخص کو اللہ نے مسلمانوں پر مقرر کیا اور اس نے مسلمانوں اور اپنے درمیان پر دے حائل کر لئے تو اللہ اس کے اور اپنے درمیان پر دے حائل کر دے گا۔ ابو مریم الازدیؓ بیان کرتے ہیں کہ جیسے ہی مجھ سے حضرت معاویہؓ نے یہ حدیث سنی فوراً حکم دیا کہ ایک آدمی مقرر کیا جائے جو لوگوں کی حاجتوں کو ان کے سامنے پیش کرتا رہے۔

خشیت باری تعالیٰ

حضرت معاویہؓ کے بارے میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے آپ کے خوف و خشیت اور فکر آخرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ موافقہ قیامت کے خوف سے لرزہ بر اندام رہتے تھے اور اس کے سبب آموز واقعات سن کر زار و قطار روتے تھے۔ علامہ ذہبیؒ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ ایک جمعہ کو دمشق کی جامع مسجد میں خطبہ دینے کے لئے تشریف لائے اور فرمایا:

ان المال مالنا والفیئہ فیئنا من شئنا اعطینا ومن شئنا منعنا
 ”جو کچھ مال ہے وہ سب ہمارا ہے اور جو کچھ مال نغیمت ہے وہ بھی صرف ہمارا ہے، ہم جس کو چاہیں گے دیں گے اور جس سے چاہیں گے روک لیں گے۔“

آپ نے یہ بات کہی، کسی نے اس کا جواب نہ دیا، اور بات آئی گئی ہو گئی، دو سراجوہ آیا اور آپ خطبہ کے لئے تشریف لائے تو آپ نے پھر یہی بات دہرائی، پھر کسی نے جواب نہ دیا اور خاموشی طاری رہی، تیسرا جمعہ آیا اور آپ نے پھر یہی فرمایا تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

۵۸ حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۶ ج ۸

۵۹ ترمذی، ابواب الہد، بحوالہ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ج ۲ ص ۲۳ مطبوعہ اعظم گڑھ

ہرگز نہیں! مال ہمارا ہے اور مال غنیمت کا مال بھی ہمارا ہے، جو ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہو گا ہم تم لوگوں کے ذریعے اللہ تک اس کا فیصلہ لے جائیں گے، یہ سن کر آپ منبر سے اتر آئے اور اس آدمی کو بلا بھیجا اور اندر لے گئے، لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، آپ نے حکم دیا کہ سب دروازے کھول دیئے جائیں اور لوگوں کو اندر آنے دیا جائے، لوگ اندر گئے تو دیکھتے ہیں کہ وہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔

حضرت معاویہؓ نے فرمایا: اللہ اس شخص کو زندگی عطا فرمائے اس نے مجھے زندہ کر دیا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، آپؐ فرماتے تھے: میرے بعد کچھ حکمران ایسے آئیں گے جو غلط بات کہیں گے اور ان پر تکبیر نہیں ہوگی اور ایسے حکمران جہنم میں جائیں گے۔ تو میں نے یہ بات پہلے جمعہ کو کہی اور کسی نے جواب نہ دیا تو میں ڈرا کہیں میں بھی ان حکمرانوں میں سے نہ ہو جاؤں، پھر دو سراج جمعہ آیا اور اس میں بھی یہ واقعہ پیش آیا تو مجھے اور فکر ہو گئی، یہاں تک کہ تیسرا جمعہ آیا اور اس شخص نے میری بات پر تکبیر کی اور مجھے ٹوکا تو مجھے امید ہوئی کہ میں ان حکمرانوں میں سے نہیں ہوں۔

سادگی اور فقر و استغناء

حضرت معاویہؓ کے مخالفین نے اس بات کا پروپیگنڈہ بڑی شدت کے ساتھ کیا ہے کہ آپ ایک جاہ پسند انسان تھے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ حضرت ابو جہلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت معاویہؓ کو کسی مجمع میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں جو لوگ موجود تھے وہ احتراماً آپ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مگر آپ نے اس کو بھی ناپسند کیا اور فرمایا:

ایسا مت کیا کرو! کیونکہ میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے واسطے کھڑے ہوں اور میں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔^{۱۱} آپ کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ یونس بن میسرہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت معاویہؓ کو

۱۱ حافظ ذہبی: تاریخ الاسلام ص ۳۲۱ و ۳۲۲ ج ۲

۱۲ الفتح الربانی علی ترتیب مسند الامام احمد ص ۳۵۷ ج ۲۲

دمشق کے بازاروں میں دیکھا، آپ کے بدن پر پیوند لگی ہوئی قمیص تھی اور آپ دمشق کے بازاروں میں چکر لگا رہے تھے۔^{۹۲}

اسی طرح ایک مرتبہ لوگوں نے آپ کو دمشق کی جامع مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے دیکھا کہ آپ کے کپڑوں پر پیوند لگے ہوئے ہیں۔^{۹۳}

یہ تو آپ کی طبعی سادگی اور استغناء کی شان تھی مگر شام کی گورنری کے دوران آپ نے ظاہری شان و شوکت کے طریقے بھی اختیار کئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ سرحدی علاقہ تھا، اور آپ چاہتے تھے کہ کفار کے دلوں پر مسلمانوں کی شان و شوکت کا دبدبہ قائم رہے، شروع شروع میں حضرت عمر فاروقؓ کو آپ کی یہ ظاہری شان و شوکت ناگوار بھی ہوئی اور انہوں نے آپ سے اس کے متعلق باز پرس کی، آپ نے جواب میں کہا: اے امیر المؤمنین ہم ایک ایسی سرزمین میں ہیں جہاں دشمن کے جاسوس ہر وقت کثیر تعداد میں رہتے ہیں، لہذا ان کو مرعوب کرنے کے لئے یہ ظاہری شان و شوکت دکھانا ضروری ہے اسی میں اسلام اور اہل اسلام کی بھی عزت ہے۔

اس موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ بھی حضرت عمر فاروقؓ کے ہمراہ تھے وہ آپ کے اس حکیمانہ جواب کو سن کر کہنے لگے: امیر المؤمنین! دیکھئے کس بہترین طریقے سے انہوں نے اپنے آپ کو الزام سے بچالیا ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا: اسی لئے تو ہم نے ان کے کانڈھوں پر یہ بار گراں ڈالا ہے۔^{۹۴}

علم و تفقہ

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علوم دہنہ میں کامل دسترس اور کمال تفقہ عطا فرمایا تھا۔ ابن حزم لکھتے ہیں: آپ کا شمار ان صحابہ میں سے ہے جو صاحب فتویٰ ہونے کی حیثیت سے ہیں نیز

^{۹۲} حافظ ابن کثیر: الہدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸

^{۹۳} حافظ ابن کثیر: الہدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۸

^{۹۴} حافظ ابن کثیر: الہدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ و ۱۳۵ ج ۸

^{۹۵} ابن حزم: جوامع السیرة ص ۳۲۰

ابن حجرؒ نے بھی آپ کو ان صحابہ کے متوسط طبقے سے شمار کیا ہے جو مسائل شرعیہ میں فتویٰ دیتے تھے۔^{۵۶}
حضرت ابن عباسؓ آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے اندہ فقہ یعنی حضرت معاویہؓ یقیناً قیہ ہیں۔

آپ سے نبی کریمؐ کی ایک سو تریسٹھ احادیث مروی ہیں^{۵۷} اور آپ سے احادیث روایت کرنے والوں میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت انس بن مالکؓ، معاویہؓ بن خدیجؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سائب بن یزیدؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، جیسے صحابہ اور محمد بن سیرینؓ، سعید بن المسیبؓ، علقمہ بن وقاصؓ، ابو اوریس الخولانیؓ اور عطیہ بن قیسؓ وغیرہ جیسے تابعین شامل ہیں۔^{۵۸} آپ اعلیٰ پائے کے خطیب تھے، اور آپ کے خطبات عربی ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح وہ حکیمانہ اقوال جو آپ سے منقول ہیں، نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور علم و حکمت میں اپنی مثال آپ ہیں، آپ نے اپنے دور میں علم و حکمت کی سرپرستی کی، تاریخ اسلام میں آپ کے دور تک فن تاریخ کے اوراق بالکل سادہ تھے، سب سے پہلے آپ نے اس زمانے کے ایک ممتاز اخباری عبید بن شریہ سے تاریخ قدیم کی داستانیں، سلاطین عجم کے حالات، اور زبانوں کی ابتداء اور اس کے پھیلنے کی تاریخ لکھائی، یہ مسلمانوں میں تاریخ کی سب سے پہلی کتاب تھی۔^{۵۹}

ظرافت

آپ ایک ہنس مکھ اور خوش اخلاق انسان تھے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی آپ سے بغیر کسی خوف کے ملتا اور آپ سے ہر قسم کی فرمائش کر دیتا، آپ سے اگر ممکن ہو تا تو پورا کر دیتے ورنہ ٹال دیتے، ایک بار ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا میں ایک مکان بنا رہا ہوں،

^{۵۶} ابن حجرؒ: الاصابہ فی تمییز الصحابہ ص ۲۲ ج ۱

^{۵۷} ابن حزمؒ: جوامع السیرۃ ص ۲۷۷ سیوطیؒ: تاریخ الخلفاء ص ۱۳۹

^{۵۸} ابن حجرؒ: الاصابہ ص ۴۱۳ ج ۳

^{۵۹} ابن ندیمؒ: الفہرست ص ۱۳۲ بحوالہ تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی ص ۴۲ ج ۲

آپ اس میں میری مدد کر دیجئے اور بارہ ہزار درخت عطا کر دیجئے آپ نے پوچھا، گھر کہاں ہے؟

کہنے لگا بصرہ میں!

آپ نے پوچھا! لبائی چوڑائی کتنی ہے۔

کہنے لگا دو فرسخ لبائی ہے اور دو ہی فرسخ چوڑائی،

آپ نے مزاحاً فرمایا:

لا نقل داری بالبصرة ولكن فل البصرة في داري

”یہ مت کہو کہ میرا گھر بصرہ میں ہے بلکہ یوں کہو کہ بصرہ میرے گھر میں

ہے۔“

وفات

آپ کی پوری زندگی علم و عمل کی زندگی تھی، آپ سے جتنا کچھ بن سکا آپ نے مسلمانوں اور عوام الناس کی اصلاح اور بہبود کے لئے کام کیا اور اس کے لئے اپنی پوری زندگی خرچ کر دی، مگر اس کے باوجود جب مخالفین آپ پر بے سرو پا الزامات لگاتے اور آپ کو طرح طرح کے اعتراضات کا نشانہ بناتے تو آپ کو اس کا افسوس ہوتا، چنانچہ حضرت معاویہؓ سے کسی نے پوچھا:

کیا بات ہے؟ آپ پر بڑھاپا جلد آگیا تو جواب میں فرمایا:

کیوں نہ آئے؟ جب دیکھتا ہوں اپنے سر پر ایک اکڑ چائل آدمی کو کھڑا پاتا ہوں جو مجھ پر قسم قسم کے اعتراضات کرتا ہے اگر اس کے اعتراضات کا ٹھیک ٹھیک جواب دے دیتا ہوں تو تعریف کا کہیں سوال نہیں! اور اگر جواب دینے میں مجھ سے ذرا سی چوک ہو جائے تو وہ بات چار عالم میں پھیلا دی جاتی ہے۔

۶۰ھ میں جبکہ آپ عمر کی اٹھترویں منزل سے گذر رہے تھے، آپ کی طبیعت کچھ ناماسز

۱۔ حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۱ ج ۸

۲۔ حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۰ ج ۸

ہوئی اور پھر طبیعت خراب ہوتی چلی گئی، اور طبیعت کی ناسازی، مرض وفات میں تبدیل ہو گئی، اسی مرض وفات میں آپ نے خطبہ دیا جو آپ کا آخری خطبہ تھا، اس میں اور باتوں کے علاوہ آپ نے فرمایا:

ایہا الناس : ان من زرع قدا سنحصدوانی قد ولینکم ولن
یلینکم احد بعدی خیر منی وانما یلیکم من ہو شر منی کما
کان من ولیکم قبلی خیر امنی

”اے لوگو! بعض کھیتیاں ایسی ہیں جن کے کٹنے کا وقت قریب آپکا ہے میں تمہارا امیر تھا، میرے بعد مجھ سے بہتر کوئی امیر نہ آئے گا جو آئے گا مجھ سے گہرا گذرا ہی ہوگا، جیسا کہ مجھ سے پہلے جو امیر ہوئے وہ مجھ سے بہتر تھے۔“

اس خطبہ کے بعد آپ نے تجینزو عینین کے متعلق وصیت فرمائی، فرمایا: کوئی عاقل اور سمجھدار آدمی مجھے غسل دے اور اچھی طرح غسل دے، پھر اپنے بیٹے یزید کو بلایا اور کہا! اے بیٹے! میں ایک مرتبہ نبی کریمؐ کے ہمراہ تھا آپ اپنی حاجت کے لئے نکلے، میں وضو کا پانی لیکر پیچھے گیا اور وضو کرایا تو آپ نے اپنے جسم مبارک پر پڑے ہوئے دو کپڑوں میں سے ایک کپڑا مجھے عنایت فرمایا، وہ میں نے حفاظت سے رکھ لیا تھا، اسی طرح آپ نے ایک بار اپنے بال اور ناخن مبارک کاٹے تو میں نے انہیں جمع کر کے رکھ لیا تھا تو تم کپڑے کو تو میرے کفن کے ساتھ رکھ دینا اور ناخن اور بال مبارک میری آنکھ، منہ اور سجدے کی جگہوں پر رکھ دینا اور پھر رحم الراحمین کے حوالے کر دینا۔“

آپ نے یہ وصیت کی اور اس کے بعد مرض بڑھتا گیا یہاں تک کہ دمشق کے مقام پر وسط رجب ۶۰ھ میں علم، حلم، اور تدبیر کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

سنہ حوالہ مذکورہ بالا ص ۱۳۱ ج ۸

سنہ ابن عبد البرۃ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۸ ج ۳ ابن اثیر: تاریخ کامل ص ۲ ج ۴ ابن کثیر:

البدایہ والنہایہ ص ۱۳۱ ج ۸

سنہ ابن حجر: الاصابہ ص ۳۱۳ ج ۳ ایضاً ابن خلدون ص ۳۴ ج ۳ مطبوعہ بیروت

آپ کی نماز جنازہ حضرت ضحاک بن قیسؓ نے پڑھائی اور دمشق میں ہی باب الصغیر میں آپ کی تدفین ہوئی، صحیح قول کے مطابق آپ کی عمر اٹھتر سال تھی۔

علامہ ابن اثیرؒ نے اپنی تاریخ کامل میں نقل کیا کہ ایک دن عبدالملک بن مروان آپ کی قبر کے قریب سے گزرے تو کھڑے ہو گئے اور کافی دیر تک کھڑے رہے اور دعائے خیر کرتے رہے۔ ایک آدمی نے پوچھا کہ یہ کس کی قبر ہے؟ عبدالملک بن مروان نے جواب دیا:

قبر رحیل کان واللہ فیما علمتہ ینطق عن علمہ ویسکت عن حمہ
اذ اعطی اغنی وانا حارب افسی ثم عجل لہ الدھر ما اخرہ لغيرہ
ممن بعدہ ہذا قبر ابی عبدالرحمان معاویہ

”یہ اس شخص کی قبر ہے کہ جب بولتا تو علم و تدبیر کے ساتھ بولتا تھا۔ اور اگر خاموش رہتا تو علم و بردباری کی وجہ سے خاموش رہتا تھا۔ جسے دینا اسے غنی کر دیتا جس سے بولتا اسے فنا کر دیتا۔“

آپ کے دور حکومت پر ایک شیعہ مؤرخ کا تبصرہ

مضمون کے آخر میں اس تبصرہ کو نقل کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا جو ساتویں صدی ہجری کے مشہور مؤرخ ابن طباطبائی نے اپنی کتاب الفخوری میں حضرت معاویہؓ اور ان کے دور حکومت پر کیا ہے۔ اس تبصرہ کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ تبصرہ ایسے مؤرخ نے کیا ہے جو شیعہ ہے اور اثناء عشری طبقے سے تعلق رکھتا ہے، اگرچہ اس تبصرہ میں کہیں کہیں انہوں نے جانبداری سے بھی کام لیا ہے مگر بحیثیت مجموعی اس میں تعصب کم اور حقیقت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ ابن طباطبائی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

حضرت معاویہؓ دنیوی معاملات میں بہت ہی دانا تھے، فرزانہ و عالم تھے، حلیم اور باجہوت فرمانروا تھے، سیاست میں کمال حاصل تھا، اور دنیاوی معاملات کو سلجھانے کی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے، دانا تھے، فصیح و بلیغ تھے،

۱۰ ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۷۸ ج ۳

۱۱ ابن اثیر: تاریخ کامل ص ۵ ج ۳

حلم کے موقع پر حلم اور سختی کے موقع پر سختی بھی کرتے تھے، لیکن حلم بہت غالب تھا، سختی تھی، مال خوب دیتے تھے، حکومت کو پسند کرتے تھے بلکہ اس سے دلچسپی تھی، رعایا کے شریف لوگوں کو انعامات سے نوازتے رہتے تھے، اس لئے قریشی شرفاء مثلاً عبداللہ عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن جعفرؓ، طیارؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبدالرحمان بن ابی بکرؓ، ایان بن عثمان بن عفانؓ اور خاندان ابوطالب کے دوسرے لوگ دمشق کا سفر کر کے ان کے پاس جاتے تھے اور (حضرت) معاویہؓ خاطر تواضع اور مہمان نوازی کے علاوہ ان کی ضروریات پوری کرتے رہتے۔ یہ لوگ ہمیشہ ان سے سخت کلامی کرتے اور نہایت ناپسندیدہ انداز سے پیش آتے لیکن یہ کبھی تو اسے ہنسی میں لٹا دیتے اور کبھی سُنی ان سُنی کر دیتے اور جب ان حضرات کو رخصت کرتے تو بڑے اعلیٰ تحائف اور انعامات دیکر رخصت کرتے، ایک بار انہوں نے ایک انصاری کے پاس پانچ سو دینار یا درہم بھیجے، انصاری نے بہت کم خیال کیا اور اپنے بیٹے سے کہا کہ یہ رقم لے جاؤ اور (حضرت) معاویہؓ کے منہ پر مار کر واپس کر دو، پھر اس سے قسم دے کر کہا کہ جیسا میں نے بتایا ہے اسی طرح کرے، وہ رقم لے کر (حضرت) معاویہؓ کے پاس پہنچا اور کہا:

اے امیر المومنین! میرے والد گرم مزاج اور جلد باز ہیں، انہوں نے قسم دیکر ایسا حکم دیا ہے اور میں ان کے خلاف جانے کی قدرت نہیں رکھتا، یہ سن کر (حضرت) معاویہؓ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ تمہارے والد نے جو کچھ حکم دیا ہے اسے پورا کر لو اپنے چچا کے (یعنی میرے) ساتھ نرمی بھی ملحوظ رکھو (یعنی زور سے نہ مارو) وہ صاحبزادے شرمائے اور رقم ڈال دی، حضرت معاویہؓ نے رقم دو گنی کر کے انصاری کو بھجوا دی۔

ان کے لڑکے یزید کو جب خبر ہوئی تو غصہ میں اپنے والد کے پاس آیا اور کہا: آپ حلم میں مبالغہ سے کام لینے لگے ہیں، اندیشہ ہے کہ لوگ اسے

آپ کی کمزوری اور بزدلی پر محمول کرنے لگیں گے، انہوں نے جواب دیا کہ بیٹے! حلم میں نہ کوئی ندامت کی بات ہے نہ برائی کی تم اپنا کام کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

اس قسم کے کردار نے (حضرت) معاویہؓ کو خلیفہ عالم بنا دیا اور مہاجرین و انصار میں ہر وہ شخص ان کے آگے جھک گیا جو اپنے آپ کو ان سے زیادہ حق دار خلافت سمجھتا تھا، حضرت معاویہؓ مدبر ترین انسان تھے (حضرت) عمر بن خطابؓ نے ایک بار اہل مجلس سے فرمایا:

”تم لوگ قیصر و کسریٰ اور ان کی سیاست کی تعریف کرتے ہو حالانکہ تمہارے اندر معاویہؓ موجود ہیں۔“

حضرت معاویہؓ کئی حکومتوں کے مربی، کئی امتوں کی سیاست چلانے والے اور کئی ملکوں کے راہی تھے، حکومت میں انہوں نے بعض ایسی چیزیں بھی ایجاد کیں جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کی تھیں، مثلاً انہوں نے سب سے پہلے فرمانرواؤں کے لئے باڈی گارڈ مقرر کئے جو ان کے سامنے ہتھیار تانے رہتے تھے، اور جامع مسجد میں انہی نے مقصورہ تیار کرایا جس میں فرمانروا اور خلیفہ لوگوں سے الگ الگ ہو کر نماز ادا کر سکتے، امیر المومنین علیہ السلام (حضرت علیؓ) کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اسی کے خوف سے (حضرت) معاویہؓ نے ایسا کیا.... اور انہی نے سب سے پہلے برید (ڈاک) کا وہ طریقہ اختیار کیا جس سے جلد جلد خبریں مل جایا کریں، برید سے مراد یہ ہے کہ مختلف جگہوں پر نہایت چست شہ سوار متعین کر دیئے جائیں تاکہ جہاں ایک تیز رفتار خبر رساں پہنچے اور اس کا گھوڑا تھک چکا ہو تو دوسرا شہ سوار دوسرے تازہ دم گھوڑے پر آگے روانہ ہو جائے اور اسی طرح ایک چوکی سے دوسری چوکی تک تیزی کے ساتھ خبر پہنچ جائے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مکی معاملات میں ایک نیا محکمہ جسے دیوان خاتم کہتے ہیں (یعنی مہرین ثبت کرنے کا محکمہ) قائم کیا، یہ دوسرے قابل اعتبار محکموں میں سے ایک تھا، بنی عباس تک یہ

طریقہ جاری رہا پھر بعد میں ترک کر دیا گیا، دیوان خاتم کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک محکمہ تھا جس میں کئی ملازمین ہوتے جب کسی معاملہ میں خلیفہ کے دستخطوں سے کوئی حکم صادر ہوتا تو وہ پہلے اس محکمہ میں لایا جاتا اور اس کی ایک کاپی یہاں منتھی کر لی جاتی اور اسے موم (لاکھ) سے سرسبز کر دیا جاتا، اس کے بعد اس محکمہ کے افسر اعلیٰ کی مہر لگادی جاتی، حضرت معاویہؓ معاملات دنیوی کو حل کرنے میں بیٹھ مصروف کار رہتے تھے ان کی فرمانروائی بڑی مستحکم تھی اور پیچیدہ معاملہ ان کے لئے آسان تھا۔

عبدالملک بن مروان کو دیکھتے وہ اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ یہ جب حضرت معاویہؓ کی قبر پر گئے اور ان کے لئے دعائے خیر کرنے لگے تو ایک شخص نے پوچھا کہ :

اے امیر المؤمنین! یہ کس کی قبر ہے؟

انہوں نے جواب دیا کہ جہاں تک میرا علم اس شخص کے بارے میں ہے وہ یہ ہے کہ صاحب قبر پوری واقفیت کے بعد بولتا تھا اور حکم کی وجہ سے خاموش رہتا تھا، جسے دیتا اسے غنی کر دیتا اور جس سے لڑتا اسے فاکر ڈالتا تھا۔ (حضرت) عبداللہ بن عباسؓ جو بڑے نقاد تھے کہتے ہیں :

کہ ریاست فرمانروائی کی طرف توجہ دینے میں (حضرت) معاویہؓ سے زیادہ لائق میں نے اور کسی کو نہیں دیکھا۔

www.katibewahi.com

نقوشِ رستگاراں

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

إذاعة المسجد الحرام مكة المكرمة

تراش

مطالعے کے دوران پھنسنے ہوئے دلچسپ واقعات
علمی و ادبی لطائف اور معلوماتی نکات

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ادارۃ المجتہدین دار الفکر لاہور

مائت حضرت عارفی



عارف، پائل حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب عارفی قدس سرہ
سیرت، مذاق، سیرت اور افادات کا تذکرہ



چھٹیس و منقح محمد تقی عثمانی



ایازۃ المعارف پبلشرز لاہور

www.katibewahi.com

میرزا میر سید
اور ان کا مزاج و مذاق

جسٹس مسٹر محمد رفیع عثمانی

ادارۃ المجتہدین کراچی